ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
فن اور فنکار
(شخصیت نامے)
علی احمد فاطمی

فن اور فنکار

(شخصیت نامے)

علی احمد فاطمی

FUN AUR FANKAR
(Shakhsiyat Name)

By

Ali Ahmad Fatmi

Contact : 9415306239

ISBN : 978-93-83309-73-3

سال اشاعت : 2021

تعداد اشاعت : چارسو(400)

کمپوزنگ : جاوید نظر

سرورق : جاوید نظر

مطبع : بھارگو آفسیٹ، بائی کا باغ، الہ آباد

قیمت : 400روپے

تقسیم کار

رجحان پبلیکیشنز

سی ۸۲/ کریلی کالونی، الہ آباد

C-82, Kareli Colony, ALLAHABAD-16 (INDIA)
Phone:0532-2655007; Mobile: 7521984368
E-mail : javednazar00@gmail.com

ناشر

علی احمد فاطمی

الہ آباد

انتساب

کرونائی وبا سے رخصت ہونے والے ہم عصر ادیب اور احباب

شوکت حیات

انجم عثمانی

مشرف عالم ذوقی

تبسم فاطمہ

مولا بخش

محمد ظفر الدین

عنبر بہرائچی

اور

فضل حسنین

کے نام

تجھے پاس جب تو قیامت کا لطف آتا تھا

ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

(وامق)

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

فہرست

☐	ابتدائیہ	7
۱	فراق گورکھپوری: کئی چہروں والی شخصیت	9
۲	فراق کے ساتھ ایک صبح	19
۳	امرت رائے کی یاد میں	29
۴	علی سردار جعفری: ایک علمی ایک طلسمی شخصیت	44
۵	معین احسن جذبی جذبی: ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے	56
۶	غلام ربانی تاباں: تاباں جبیں پہ کج ہی رہا بانکپن کے ساتھ	72
۷	میکش اکبر آبادی: تاثرات وخیالات	84
۸	جگن ناتھ آزاد: قندیلِ محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم	101
۹	مجروح سلطان پوری: سب دیئے روشن تمھارے نام کے	120
۱۰	رشید حسن خاں: شجر سایہ دار	143
۱۱	مشفق ومہربان۔ مشفق خواجہ	163
۱۲	الوداع ایک فکرِ جمیل۔ الوداع سید محمد عقیل	173
۱۳	پروفیسر محمود الٰہی: ذکر وفکر	204
۱۴	قاضی عبدالستار: پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا	217

۱۵	ایسے تھے اقبال مجید!	239
۱۶	عابد سہیل: تم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ	250
۱۷	حسن عابد: ہم تو کیا سب اسی کے گھائل ہیں	266
۱۸	تیر مسعود: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ	279
۱۹	ملک زادہ منظور احمد: مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے	286
۲۰	یوسف سرمست: چند یادیں	301
۲۱	فضل امام عرف کرپارام	315
۲۲	راجیندر رکمار: حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو	326
۲۳	سید عاشور کاظمی کی یاد میں	334
۲۴	افغان اللہ خاں: تم جیسے گئے ویسے تو جاتا نہیں کوئی	348
۲۵	غضنفر: دیدہ و دل تمام آئینہ	360
۲۶	طارق چھتاری: ایک ماڈرن صوفی کی کہانی	376
۲۷	شائستہ فاخری: ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں	388

ابتدائیہ

بعض دیگر نوجوانوں کی طرح میں نے بھی لکھنے پڑھنے کی ابتدا تخلیقی انداز میں کی۔
گھر کے علمی اور شہر کے ادبی ماحول نے کچھ ایسا رنگ بھرا کہ میں اگر ایک طرف شعری نشستوں کی نظامت وغیرہ کرنے لگا تو دوسری طرف ان نشستوں کی رپورٹ وغیرہ بھی لکھنے لگا، جو اس زمانہ کی کتب و رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ اسی غلط یا صحیح عادت نے آگے چل کر بڑے رپورتاژ اور سفرنامے لکھوائے۔ درمیان میں کچھ افسانے بھی لکھے کہ والدہ مرحومہ اردو فکشن بہت پڑھتی تھیں خاص طور پر نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری وغیرہ کے ناول۔ پریم چند اور کرشن چندر کے تو ہم بھی دیوانے تھے۔ انھیں دنوں مجھے ایک اور فکشن نگار نے دیوانہ بنا رکھا تھا وہ تھے ابن صفی۔ چونکہ جاسوسی دنیا اور رومانی دنیا الٰہ آباد سے ہی شائع ہوتی تھیں اس لئے بہ آسانی دستیاب ہو جاتیں اور ہم خفیہ طور پر پڑھتے تھے۔ خفیہ اس لئے کہ والد مذہبی عالم تھے اور اس طرح کے ناولوں کو پڑھنے کو سختی سے منع کرتے تھے۔ کئی بار رنگے ہاتھوں پکڑے بھی گئے اور پٹائی بھی ہوئی۔ ان سب کا ذکر کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ انھیں تخلیقی رویوں نے پہلے پہل تاثراتی و تخلیقی نوعیت کے مضامین لکھنے کی طرف گامزن کیا۔ بعد میں جب برائے ڈی فل تحقیقی مقالہ لکھنا پڑا اور پھر باقاعدہ تحقیق و تنقید اور تدریس ہی زندگی کا مشن ٹھہرا تو تخلیق پس پشت ضرور چلی گئی لیکن کبھی کبھی رپورتاژ، سفرنامہ اور شخصی نوعیت کے تاثراتی مضامین میں بہرحال ان کو جگہ مل جاتی۔ ترقی پسند انجمن کے زیر اہتمام مذاکروں اور کانفرنسوں کی تفصیلی رپورٹ یا رپورتاژ سردار جعفری، محمد حسن، قمر رئیس نے لکھوائے۔ لندن کانفرنس (۸۵ء) کی تفصیلی رپورٹ جب کتابی شکل 'سفر ہے شرط' (۸۶ء) میں شائع ہوئی تو میری خاصی پذیرائی ہوئی۔ جس کے زیر اثر میں نے کچھ اور سفرنامے اور رپورتاژ لکھے۔ اس سے ذاتی طور پر میری تحقیق نویسی اور تنقید نگاری کو بھی فیض پہنچا کہ ان دنوں جس نوع کی بوجھل اور ژولیدہ تنقید لکھی جا رہی تھی اس

سے میں دور ہی رہتا۔ ویسے بھی میں مجنوں، احتشام حسین، سید محمد عقیل، محمد حسن، قمر رئیس، شارب ردولوی وغیرہ کی تنقید سے متاثر تھا بلکہ یوں کہئے کہ اسی دبستان تنقید کا پروردہ اور تربیت یافتہ ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ بہرحال میں نے شعوری طور پر اپنے آپ کو تخلیقی جذبہ و رویے سے الگ نہیں کیا اور وقفہ وقفہ سے سفرنامے، رپورتاژ۔ بزرگ شاعروں وادیبوں پر تاثراتی و تخلیقی نوعیت کے مضامین لکھتا رہا۔ یہ کتاب گزشتہ چالیس برسوں میں بزرگ شاعروں وادیبوں پر لکھے گئے ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو لکھتے ہوئے میں نے شعوری طور پر اس بات کی بھی کوشش کی جس شاعر و دانشور کا ذکر کروں اس کی شاعری اور دانشوری کا ذکر ضرور ہو کہ اس کی اصل شناخت تو یہی ہے۔ ہمارے بعض افسانہ نگار، خاکہ نگار صرف عادات واطوار، لباس، کھان پان وغیرہ کو پرمذاق طریقہ سے پیش کرنے کو ہی خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری سمجھتے ہیں، جو میری نظر میں آدھی ادھوری تصویر ہے جس سے غلط فہمیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال میری کوشش رہی ہے کہ فنکار کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے فن اور فنکاری وغیرہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اسی لئے میں نے اس کتاب کا نام رکھا ہے ''فن اور فنکار'' کہہ نہیں سکتا کہ یہ عنوان کہاں تک مناسب ٹھہرا۔ خیر عنوان کو چھوڑیئے اور اندر کے صفحات ملاحظہ کیجئے۔ شاید کچھ لطف، کچھ تعارف، کچھ گیان اور کچھ عرفان مل سکے۔

چلتے چلتے ایک بات اور یہ مضامین گزشتہ چار دہائیوں کی طویل مدت میں وقفہ وقفہ سے لکھے گئے ہیں۔ کسی فنکار کی زندگی میں کسی کی موت بعد۔ اس لئے ان میں کہیں حال کا صیغہ اور کہیں ماضی کا صیغہ ملے گا۔ اب تو زندگی میں لکھے گئے والے بھی کم رہ گئے ہیں۔ جو ہیں خدا انھیں سلامت رکھے۔

ان دنوں خاکے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ جاوید صدیقی کے خاکے یقیناً قابل ذکر ہیں۔ غضنفر اور ابن کنول نے بھی دلچسپ خاکے لکھے ہیں۔ کچھ اور بھی ہوں گے۔ اب انھیں بھی ملاحظہ کیجئے اور اپنی گراں قدر آراء سے نوازیئے۔

جون ۲۰۲۱ء الہ آباد

علی احمد فاطمی

فراق گورکھپوری۔ کئی چہروں والی شخصیت

مخدوم پر مضمون لکھتے ہوئے ایک جگہ پروفیسر احتشام حسین نے لکھا تھا ''تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے، کیوں کہ عمل تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا پتہ چلتا ہے۔'' پروفیسر موصوف کا یہ گراں قدر جملہ اور دیگر معتبر تنقیدی کتابوں کے خیالات کہ تخلیق میں بہر حال خالق کی شخصیت منعکس رہتی ہے، ہم نے زمانۂ طالب علمی سے سنا اور اعتبار کیا اور ابھی تک یہی عقیدہ استوار رکھا کہ شاعری اور شاعر کو کبھی الگ الگ نہیں دیکھا جاسکتا ہے کیوں کہ شاعر کبھی اپنی شاعری کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اور کبھی شاعری شخصیت کی پہچان بنتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب ہم غالب، منٹو، فراق اور کسی حد تک جوش اور مجاز (اور بھی نام لیے جاسکتے ہیں) وغیرہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد کی زندگی کی ایک ایک پرت اُلٹتے ہیں تو ان تنقیدی ارتسامات پر ارتعاش سا پیدا ہونے لگتا ہے اور قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ دورِ حاضر کے بعض جدید نقادوں نے تو اس طرح کی توجیہات پر زیادہ کان ہی نہیں دھرے۔ وہ شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ فراق پر ہی مضمون لکھتے وقت ظ۔ انصاری نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

> ''ازدواجی زندگی کی تلخ کامی، کتنی ہی تلخ نہ سہی تاہم وہ
> ان کی شخصیت کے بھرے ہوئے جان کی تلچھٹ ہے۔
> اس سے ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے نہ کہ شاعری کا۔''
> (گفتگو ۶۷ء)

عام طور پر خیال یہ ہے کہ فنکار کو ایسے فروعی اور کمزور حالات سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ غالب زندگی بھر پریشان رہے، اپنی بیوی کی شکایت کرتے رہے۔ اپنی تمام مسکراہٹوں کے ساتھ وضعداری نبھاتے رہے۔ اسی لیے مشکلیں آسان لگنے لگیں۔ منٹو نے

تو ہنس ہنس کر جینا سیکھا تھا۔ زندگی کی ساری تلخیاں اپنی ہنسی میں پی گیا۔ اور بھی معقول فنکاروں نے کچھ ایسے ہی جیا ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ فراق صاحب کے اوپر کم عمری میں ہی مصیبتیں آگئیں۔ ۱۹۱۸ء میں جب فراق صاحب کی عمر تقریباً چوبیس برس کی تھی، ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت انتقال کر گئے۔ اس حادثے نے ان کے اوپر خاصا اثر ڈالا۔ لیکن اس سے بھی بڑا حادثہ اس سے قبل ۱۹۱۴ء میں ہو چکا تھا۔ جب سترہ، اٹھارہ برس کی عمر میں ایک ناموزوں لڑکی کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ اپنی شادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ”مجھے اور میرے خاندان کو دھوکہ دے کر ایک صاحب نے میری شادی ایک ایسے خاندان میں ایک ایسی لڑکی سے کر دی کہ میری زندگی ایک ناقابلِ عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہ تھا، لیکن معمولی سے انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی۔ صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ بلکہ الٹے ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا ......تب سے آج تک میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی۔“

(شاہکار، فراق نمبر۔ ص ۱۳۶)

کہا جاتا ہے کہ شادی کے پورے ایک سال بعد تک فراق کو نیند نہیں آئی۔ شاید اسی ناآسودگی کی بنا پر ہی وہ سیاست اور ادب کی طرف مڑے اور فراق بنے۔ فراق صاحب کے ساتھ جس طرح کے ابتدائی واقعات پیش آئے وہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آجاتے ہیں، لیکن ہر کوئی فراق نہیں بن پاتا۔ یہیں سے ان کی انفرادیت کی راہیں شروع ہوتی ہیں۔

جن لوگوں نے فراق کی شاعری اور فراق صاحب دونوں کو قریب سے پڑھا اور سمجھا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ فراق صاحب کی شخصیت کئی چہروں والی شخصیت تھی۔ اوپر سے نیچے، خارج سے باطن، ان کے اندر کئی قسم کے انسان بہ یک وقت جیتے رہتے اور

اکثر و بیشتر متصادم بھی رہتے۔ ان میں سے ایک چہرہ معمولی سے کائستھ کا تھا جس کے بطن سے کنجوسی، سوچ وچار میں سمٹا پن اور کبھی کبھی تو گھناؤنا پن نظر آتا تھا۔ خیال رہے کہ یہ چہرہ فراق کا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ ضلع گورکھپور کے بانس گاؤں کے ایک کائستھ کا تھا جو اپنے والد کے انتقال کے بعد بیحد پریشان ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اور جواہر لال نہرو کی اچانک عنایت سے اپنے گھر کا پالن کرتا ہے۔ اس شخص کے اندر پیسے کی اہمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی کیوں کہ اس نے تکلیفیں جھیلی تھیں۔ کبھی کبھی اس کی یہ سوچ اس قدر حاوی ہوتی کہ بعد میں فراق کو بھی چھو لیتی۔ دوسرا چہرہ فراق کا تھا۔ ایک سادہ سے انسان کا چہرہ جو ۱۹۱۳ء میں میٹرک کر کے ایف۔اے۔ کی تعلیم کے لیے الٰہ آباد آتا ہے اور اچھے نمبروں سے پاس کر کے کرسچن کالج لکھنؤ اور سناتن دھرم کالج کانپور میں پڑھانا شروع کرتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی یہ ادا جلد ہی فراق کو چھو لیتی ہے۔ تیسرا چہرہ یا شاید چوتھا چہرہ فراق کا ہوتا تھا۔ فراق گورکھپوری کی شخصیت کا یہ چہرہ اتنا تابناک، ذہین اور طاقتور تھا کہ جب اس کی چمک اٹھتی کہ پھر وہ نہ کائستھ رہ جاتے، نہ رگھوپتی سہائے۔ نہ جانے یہ چہرے کن تہوں میں دب جاتے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے فراق صاحب کی ایک ہی شخصیت میں نہ جانے کتنی شخصیتیں دیکھی ہیں۔ حیرت میں پڑا ہوں، خوف بھی محسوس کیا اور حقارت بھی۔ اور اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اسے تبدیل ہوتے بھی دیکھا۔ اُف تبدیلی کا یہ منظر۔ ہونٹوں پہ کانپتا ہوا سگریٹ، گلاس میں چھلکتی ہوئی شراب، آسمان کی چھوتی ہوئی تخیل کی لہریں اور چشم زدن میں فراق ان سب پر ایسا غالب آتا کہ خدا کی پناہ۔ پھر ایسے ماحول میں گل افشانی گفتار کا ایسا سلسلہ چلتا، علم وفضل کی ایسی بجلیاں کوندتیں کہ سماعت جگمگا اٹھتی۔ ہوش وحواس فضا میں تیرتے نظر آتے۔ بس یہیں پر، اسی مقام پر نہ جانے کتنی بار فراق صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر محسوس ہوا کہ فراق صاحب کی ذاتی شخصیت اور شاعرانہ شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب وہ شاعر ہوتے تو لاشعوری طور پر ان کی ڈھلی ہوئی نفسیات، علمی چمک، تخلیقی قوت کام کرتی رہتی۔ بچپن کے حالات، غیر موزوں شادی، ازدواجی زندگی کی تلخی لیکن وہ صرف فنکار ہوتے اور اس سے ہٹ کر وہ ایک معمولی سے انسان ہوتے۔ سنجیدہ و تخلیقی سوچ

وفکر سے بالکل پرے وبرعکس۔ ایسا کیوں؟ جب کہ اقوالِ زرّیں ہمیں بتاتے ہیں کہ خالق اور تخلیق، شعوری اور لاشعوری دونوں اعتبار سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی گتھی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے عہد اور ان کے نظریات سے جڑی ہوئی ہے۔ نفسیات کے ماہرین نے اس نازک رشتے پر ضرور تحقیق کی ہے۔ لیکن ان کے نظریات بھی جدا ہیں۔ فرائیڈ شعرو شاعری کو شخصیت کا مرض نفسی اور اس کے حاصل کو حرماں نصیبی کا خواب بتاتا ہے اور اس طرح فرائیڈ کے یہاں شاعری، شاعر کی مریض شخصیت کا شاخسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شاعر عام انسانوں سے ہٹ کر ایک مخصوص قسم کی ایب نارملٹی کا شکار ہوتا ہے تب شاعر ہوتا ہے اور اگر یہ ساری چیزیں نہ رہتیں تو وہ اچھا خاصا انسان رہتا، ہرگز شاعری نہ کرتا۔ فرائیڈ کے اس نظریے میں اپنے آپ میں دم خم ضرور ہوگا لیکن ضروری نہیں کہ یہ بات ہر فنکار اور شاعر پر صادق آسکے۔ اسی لیے ڈاکٹر سی. ینگ کا نظریہ فرائیڈ سے نہ صرف مختلف ہو جاتا ہے بلکہ فراق کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں حلق سے نیچے اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ینگ کا نظریہ ہے کہ شاعری ہو یا کوئی دوسرا آرٹ، غیر شخصی اور معروضی ہوتا ہے۔ اس میں ذات اور شخصیت کا براہ راست دخل نہیں۔ کیوں کہ شاعری میں شاعر ایک میڈیم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال یہ خیال قابلِ توجہ ہے کہ ینگ ''شاعر کو بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان الگ الگ دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاعر بحیثیت انسان ایک عام انسان کی طرح اپنی خصوصیات اور کمزوریاں رکھتا ہے۔ لیکن فنکار و شاعر کی حیثیت سے وہ اکیلا نہیں رہتا بلکہ اجتماعیت کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر ایک نئی دنیا اس کے سامنے ہوتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ ان اقوال کی روشنی میں فی الوقت ہم یہ مان لیں کہ خالق کی وہی شخصیت جڑی رہتی ہے جو تخلیق کار ہوتی ہے، باقی کچھ اور نہیں تو کم از کم اس وقت ہمارا کام چل جائے گا۔ دنیا کا تقریباً ہر شخص کئی پردوں اور پرتوں میں سمٹا رہتا ہے۔ تضادات کا شکار رہتا ہے۔ پھر شاعر اور ادیب کو اس دنیا سے الگ کر کے کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔

فراق صاحب کے بچپن کے بارے میں پڑھا یا ان کی زبان سے سنا۔ جوانی کے قصے وہ اکثر مزے لے لے کر خود ہی سناتے تھے۔ ان کے وہ تمام حالات جوان کے شاعرانہ

محرکات وعوامل کا سبب بنے، میں نے نہیں دیکھے۔ میں تو ان سے اس وقت ملا جب انھیں
ان کی زندگی بھر کی خدمات کا صلہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ ''گیان پیٹھ''
کی شکل میں مل چکا تھا، جس کی خوشی میں انھوں نے اپنے گھر پر ایک جلسہ کیا تھا اور الہ آباد کے
انگریزی، ہندی اور اردو کے تمام عمائدین ادب اس میں شریک ہوئے۔ بی.اے. کا یہ حقیر
طالب علم پروفیسر احتشام حسین کی انگلی پکڑ کر اس جلسہ میں پہنچا۔ اب تو صرف منظر ہی یاد
ہے۔ گھر کے چوکور آنگن میں فراق صاحب تن تنہا بالائے تخت جلوہ افروز تھے اور نیچے فرش پر
ادیبوں اور قلم کاروں کا اجتماع۔ فراق صاحب تمام لوگوں کے سوالوں کا تر کی بہ تر کی جواب
دے رہے تھے۔ لطیفوں اور قہقہوں کی گونج میں سماعت اور فہم دونوں ہی اس قدر کمزور ہو گئی
تھیں کہ ذرا بھی یاد نہیں کہ کن کن باتوں پر قہقہے گونجے تھے اور کیا کیا سوالات اُٹھے تھے۔ کچھ
دنوں بعد ایک جلسہ کی صدارت کے سلسلے میں ان سے ذاتی طور پر ملاقات ہوئی اور انھوں
نے لائبریری سے مجھ سے کچھ کتابیں منگوائیں اور پھر ایسا سلسلہ چل پڑا کہ بلا مبالغہ چھوٹی
بڑی دو ڈھائی سو صحبتیں میں نے ان کی خدمت میں گذاریں۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر
شاعری اور تفہیم کی الف۔ بے۔ سیکھی۔ ان کی نزاکتوں اور رفعتوں سے قربت ہوئی۔ ادب کی
بنیادی قدروں سے واقف ہونے کی جسارت کی۔ تبادلۂ خیالات کے ادب و آداب سے
آگاہ ہوا۔ بڑے بڑے ناموں کے ذریعہ چھا جانے والے خوف اور دُھند کو فراق صاحب
نے کم کیا۔ کسی تقریر کے ذریعہ نہیں، کسی سنجیدہ تحریر کے ذریعہ بھی نہیں۔ بس عام گفتگو، روز
مرہ بول چال، لطیفوں اور قہقہوں کے ذریعہ۔ لیکن یہ سب باتیں اس وقت ممکن ہوتی تھیں
جب وہ فراق ہوتے تھے۔ لیکن یہ سب بھی اسی وقت ہوتا تھا جب کوئی انھیں فراق بنانے والا
پہنچ جائے۔ ورنہ گھر میں جب بھی داخل ہو تو وہ کچھ اور ہوتے۔ کبھی نوکر پر غصہ کر رہے
ہوتے، جھاڑو دینے والی ملازمہ پر برس رہے ہوتے، سبزی دال کی باتیں ہو رہی ہوتیں یا
زیادہ سے زیادہ خوبصورت لان میں لگے ہوئے پھول پودوں کی باتیں ہو رہی ہوتیں۔

فراق صاحب کو پھولوں کے پودے بہت پسند تھے۔ خواہ وہ کسی قسم کے ہوں،
بس ان کا خوش رنگ ہونا کافی تھا۔ ایک بار مجھے لان میں لے جا کر ایک ایک پودے کے

بارے میں تفصیل سے بتاتے رہے کہ کس کو کہاں سے، کس طرح سے اور کتنی قیمت میں حاصل کیا ہے۔ کون کتنی زندگی کا حامل ہے۔ کون اب ختم ہونے والا ہے۔ جب ہم ختم ہونے والے پودے کے قریب پہنچے تو میرے منھ سے نکل گیا کہ ''حضور! ان میں سے ایک پودا مجھے عنایت کر دیں......'' میرے منھ سے ابھی یہ جملہ مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بگڑ گئے۔ ''خبردار! یہ پودے میری جان ہیں۔ انھیں تمھیں کیا جوش اور مجنوں بھی مانگیں تو نہیں دے سکتا۔'' ''جوش سالہ کیا آئے گا مانگنے، وہ خود ہی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اپنی خوشبو کھو رہا ہے.....'' وہ خود ہی بُد بُدائے۔

انگریزی ادب کے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ جس فنکار کی ابتدائی زندگی ناکام اور مایوس کن رہتی ہے اس کے یہاں ایک مخصوص قسم کی انا اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے پڑھنے لکھنے کی ابتدا زیادہ تر اپنے حالات سے متعلق لکھ کر کرتا ہے۔ انگریزی ادب میں خود نوشت سوانحی ادب کے پیچھے کچھ اسی قسم کے جواز پیش کیے جاتے ہیں۔ فراق صاحب کے سلسلے میں یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ وہ زبردست Egoist تھے، غرور بھی تھا۔ جوش نے انھیں مجموعۂ اضداد کہا۔ شاعری میں بھی آپ ملاحظہ کریں تو ان کے زیادہ تر مقطعوں میں فراق آسمان کو چھوتے نظر آئیں گے۔ لیکن یہ سب ان کی تحریر میں ملتا تھا۔ گفتگو میں میں نے اس طرح کی باتیں شاذ و نادر ہی پائیں۔ یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ فراق صاحب کے قریب میں اس وقت آیا جب وہ مائل بہ زوال تھے۔ جسم کی آنچ نکل رہی تھی۔ سانسوں میں تھکن کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ لیکن ذہن ہمیشہ تازہ اور جاگتا رہتا۔ آنکھوں میں چمک اور زندگی مرتے دم تک ختم نہ ہونے پائی۔ دماغی طور پر میں نے ان کو ہمیشہ بیدار پایا۔ اور ایسی گفتگو کرتے دیکھا کہ حیران رہ جاتا۔ ایسا لگتا تھا کہ گفتگو میں تخلیق ہو رہی ہو۔ جب کبھی ان کی انگلیوں کی جنبش شروع ہوتی، پتلیوں کے رقص سے آنکھیں ڈوبنے لگتیں، دماغ تفکر کے سانس لینے لگتا تو ہم سمجھ لیتے کہ تخلیقی گفتگو کا وقت آ گیا۔ اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ دورانِ گفتگو میر آتے، مومن اور امیر مینائی کا بھی ذکر آتا۔ داغ اور نوح کے چرچے ہوتے۔ گفتگو کا زیر و بم بڑے بڑے دیدوں کا نشیب و فراز فیصلہ کرتا تھا

کہ وہ کس شاعر کو کیا مقام دے رہے ہیں۔ داغ، سیماب اور بالخصوص نوح کا ذکر کرتے وقت ان کے حلق سے باریک قہقہہ نماں آوازیں نکلتیں۔ لیکن جلد ہی وہ سنجیدہ ہو کر کہتے اردو شاعری کو مخلصانہ اور استادانہ آہنگ سے مالا مال کرنے میں جو کام ان استادوں نے کیا وہ فراق بھی نہ کر سکا۔ اسی طرح وہ عزیز، آرزو، وغیرہ کا ذکر بھی قدر سے کیا کرتے۔ پھر دورانِ گفتگو اگر فراق آجاتے تو آجاتے۔ ورنہ انھیں فرصت کہاں تھی کالیداس، تلسی داس، کیٹس، ورڈسورتھ، ٹینیسن، میر، غالب، مومن وغیرہ سے نیچے اترنے کی۔

کسی رسالے کے لیے میں نے ایک بار ان سے سجاد ظہیر کے بارے میں گفتگو کی اور بات ترقی پسند تحریک کی چل پڑی۔ تحریک کے بارے میں انھوں نے جو نتیجہ نکالا تھا اسے آپ بھی سن لیجیے:

> ''تحریک اس وجہ سے پھلی پھولی کہ اس کو سجاد ظہیر لے کر چلے تھے اور سجاد ظہیر اپنی تحریک سے زیادہ عظیم تھے اور تحریک ان کے مقابلے میں کمزور۔''

اس دن ادب، جمالیات، وجدان پر ایسی ایسی باتیں کیں کہ مجھ جیسا کم علم منھ پھیلائے رہ گیا اور ایسا لگا کہ میں کہیں اور ہوں۔ میرا وجود زمین سے اوپر اُٹھ کر ہوا میں تیر رہا ہے۔ گفتگو اور علمیت کے جادو سے دو چار ہونے کے ایسے مواقع اب کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ باتیں بعد میں مجھے ان کے خطوط کے مجموعے ''من آنم'' میں بھی نظر آئیں اور پھر سردار جعفری کے نام کے ایک خط میں بھی دو تین جملے ملے۔ اس خط کو آپ بھی ملاحظہ کریں:

> ''میرے نزدیک ادب برائے ادب کا مفہوم داغ اور نوح کی شاعری نہیں بلکہ حافظ اور کیٹس کی شاعری ضرور برائے ادب ہے۔ اس فقرے میں برائے ادب کا مفہوم نہ برائے لفاظی، نہ برائے چونچلہ نگاری، نہ برائے شاعری، نہ برائے سطحیت بلکہ برائے ادب کے معنی جمالیاتی مہک اور جمالیاتی وجدان جس کا کوئی تعلق عمل سے نہیں ہے۔''

یہ وہ فراق ہیں جنھوں نے پریم چند سے بے پناہ اثر لے کر پروفیسر اعجاز حسین اور پروفیسر احمد علی وغیرہ کے ساتھ مل کر الہ آباد میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کے اہتمام میں اپنی فعالیت کا ثبوت دیا تھا۔ ہر ذی شعور قلم کار کے تفکرات، تصورات کی کئی منزلیں ہوتی ہیں، ضروری نہیں کہ ایک صاحبِ فکر جو کل تک تھا وہ آج رہے۔ جو آج ہے وہ کل بھی رہے۔ فراق صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ابتدا میں وہ کچھ جذبے، کچھ ذاتی الجھنوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے سیاست اور جنگ اور جنگِ آزادی میں لگ گئے۔ ترقی پسند تحریک کے پُرزور حامی اور کارکن رہے لیکن رفتہ رفتہ جب حالات معمول پر آنے لگے تو اندر کا فن کار انھیں لے گیا۔ شاعری کی اس سرمئی فضا میں جس کے پچھلے پہر صرف معشوق کی آہٹیں محسوس ہونے لگیں اور انھوں نے کہا۔

یہ سرمئی فضاؤں کی کچھ کنمناہٹیں
ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تیری آہٹیں
اس کائناتِ غم کی فسردہ فضاؤں میں
بکھرا گئے ہیں آ کے وہ کچھ مسکراہٹیں

فراق صاحب کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بھی لکھا جائے گا۔ اس منتشر سے مقالے میں ان کا شاعرانہ تجزیہ ہرگز مقصود نہیں ہے۔ بس ان کی ذاتی اور شاعرانہ شخصیت سے متعلق کچھ بکھرے ہوئے خیالات ہیں۔ میں نے ایک بار ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا آپ اب بھی شعر کہتے ہیں؟ کچھ جواب نہیں ملا۔ بس ایک گنگناہٹ طاری ہوگئی اور ایک غزل کے چند اشعار کچھ ایسے انداز میں سنائے کہ جسے ترنم کہا جا سکتا تھا نہ تحت۔ میں نے جلدی جلدی وہ اشعار نوٹ کر لیے، یہ سوچ کر کہ تازہ ہوں گے۔ مطلع آپ بھی سن لیجیے۔

عشق کی آغوش میں بس اک دلِ خانہ خراب
حُسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب

بعد میں دیکھا تو یہ غزل ''گلِ نغمہ'' میں موجود تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ فراق صاحب نے آخیر عمر میں شعر کہنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ انھیں اپنے اشعار بھی زیادہ نہیں یاد رہ گئے تھے۔

ذاتی محفلوں میں وہ اکثر داغ، عزیز، آرزو، جلیل وغیرہ کے اشعار مزے لے کر سناتے۔ مشاعروں میں شعر کم لطیفے زیادہ سناتے۔

الہ آباد میں ان کی آخری تقریب اور تقریر فانی صدی تقریبات کی افتتاحی تقریر تھی۔ ہر چند کہ وہ فانی کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے لیکن ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب جنھیں وہ کافی عزیز رکھتے تھے، ان کی درخواست پر تشریف لائے اور ایک نہایت نپی تلی متوازن تقریر کی۔ اسی تقریر میں انھوں نے اپنی ضعیف العمری کی شکایت کی اور یہ شعر پڑھا۔

دمِ واپسیں ہم سفر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

فراق صاحب کا علم، اظہارِ علم، گفتگو، اندازِ گفتگو، شعر اور اس کی پیش کش سب اس قدر معمولی اور جادوئی تھے کہ سامعین پر ایک کیف طاری ہو جاتا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل کی کتاب ''نئی علامت نگاری'' کو ریلیز کرتے ہوئے جو انھوں نے تقریر کی یا پروفیسر احتشام حسین کی موت پر جو انھوں نے متعدد جذباتی تقریریں کیں وہ آج بھی سننے والوں کے دلوں میں دھڑک رہی ہوں گی۔ ان کی تقریر سے ایک ایسا جمالیاتی اور تخلیقی کیف طاری ہوتا کہ ہم سب تخیل اور تصور کی نہ جانے کن وادیوں میں پہنچ جاتے۔ ہمارے کانوں میں رس گھلنے لگتا۔

فراق صاحب جیسا شاعر اور فراق جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ میری آنکھوں میں، میرے حافظے میں آج بھی ان کی شخصیت کا رچاؤ، ان کی گفتگو کی کشش جذب و پیوست ہے۔ ان کی گفتگو کی مخصوص ادائیں، ان کی شاعرانہ، فنکارانہ کیفیتیں، ان کی آنکھوں کا رقص، انگلیوں میں جھولتا ہوا سگریٹ، ہاتھوں میں کانپتا ہوا نارنجی گلاس، کولھے پر کھسکتی ہوئی لنگی اور پھر رفتہ رفتہ لحاف کے اندر جاتا ہوا جسم جو اپنی قوت کھو چلا تھا اور پھر ان کی لرزتی مگر گونجتی ہوئی آواز.......... ''اقبال کہتا ہے کہ

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

بتائیے! اگر ہندوستان دنیا میں سب سے اچھا ہے تو پھر بُرا ملک کون ہے؟ ہم کو اسی طرح کے سستے قومی جذبوں نے مات دی..... سچ یہ ہے کہ ہندوستان سارے جہاں

سے بُرا ملک ہے..... جہاں جمہوریت قے کر رہی ہو.....
سیاست ننگی ہو کر چوراہے پر آ گئی ہو...... اس ملک میں
شاعری کرنا......"

پھر وہ نڈھال ہو جاتے اور سر تکیے پر ڈھلک جاتا۔

فراق کی شخصیت کی صفائی، دل و دماغ کی بیباکی اور ذہن کی تخلیقیت نے انھیں مجسم فنکار بنا رکھا تھا اور اسی لیے تمام عمائدینِ ادب و سیاست نے انھیں اجازت دے رکھی تھی کہ وہ آزاد ہیں، ہر طرح سے آزاد........!

آج فراق صاحب ہم میں نہیں۔ بس یادیں ہی یادیں ہیں، جنھیں بھلانا تو ممکن ہی نہیں، جنھیں سمیٹنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ ایسی تہہ دار، نیرنگ اور متضاد شخصیت کے بارے میں لکھنا ناممکن سہی لیکن ایک مشکل کام ضرور ہے۔ بقول ظ. انصاری "ان کی شخصیت لکھی ہی نہیں جا سکتی، بلکہ اس کے بارے میں کچھ باتیں ہی لکھی جا سکتی ہیں۔" میں نے بھی کچھ اسی انداز سے محض کوشش کی ہے۔

ان کے سامنے جب کبھی جوش، مجنوں وغیرہ کے بارے میں ذکر کیا جاتا تو وہ نہایت جذباتی ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

آج وہ اپنے دوست جوش کے پاس جا چکے ہیں اور ہمارے پاس ان کی شاعری، ان کی گفتگو اور ان کی پُرکشش شخصیت سے لبریز یادوں کے سرمایے کے ساتھ ساتھ ایک سرمایۂ افتخار بھی ہے کہ ہم آنے والی نسلوں سے یہ کہہ سکیں گے کہ ہاں ہم نے واقعی فراق کو دیکھا تھا، سنا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس پر فخر کرے گی یا نہیں۔ پر سچ تو یہ ہے کہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(اپریل ۱۹۸۳ء)

□□□

فراق کے ساتھ ایک صبح

۱۳ر ستمبر ۷۳ء کو جب سجاد ظہیر کا انتقال ہوا تو پوری اردو دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اس لیے کہ سجاد ظہیر صرف ایک انسان، ایک ادیب نہ تھے بلکہ ایک تحریک تھے۔ ایک تاریخ تھے۔ اخبار 'حیات' نے بطور خاص اپنے لیڈر کا غم منانے کا اعلان کیا اور ایک وقیع نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا اور راقم الحروف کو یہ ذمہ داری سونپی کہ فراق صاحب سے سجاد ظہیر کے بارے میں تاثرات فراہم کر کے جلد از جلد روانہ کروں۔ فراق صاحب سجاد ظہیر کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ لندن سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو ان دنوں ان کے والد سر وزیر حسن الہ آباد میں ہی تھے۔ چنانچہ سجاد ظہیر نے بھی اپنے والد کے ساتھ الہ آباد میں قیام کیا۔ الہ آباد میں سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالنے میں جن لوگوں سے خاص مدد لی ان میں احمد علی کے علاوہ اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری اہم تھے اور یہ مقتدر حضرات الہ آباد میں سجاد ظہیر کے گھر پر منعقدہ ۳۰ر دسمبر ۳۵ء کی اس تاریخی نشست میں بھی شامل تھے جس میں پریم چند، جوش، عبدالحق، دیا نرائن نگم وغیرہ تھے اور جن کی موجودگی میں انجمن کے منشور پر دستخط ہوئے اور ایک طرح سے ہندوستان میں الہ آباد میں انجمن کی بنیاد پڑی۔ اس طرح فراق صاحب انجمن کے بنیاد گذاروں میں سے ہیں۔ بعد میں وہ انجمن کی الہ آباد شاخ کے سکریٹری بھی رہے۔ برسوں تک انجمن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سمینار اور کانفرنسوں میں مقالے پڑھے۔ اردو اور ترقی پسندی کی حمایت میں صدا بلند کی۔ کئی بار تو اپنی بیباک اور بے لگام شخصیت کی وجہ سے بحث طلب ہوئے اور کسی حد تک بدنام بھی۔ فراق نے ایک نہیں کئی جگہ تحریک سے وابستہ ہونے اور اشتراکیت سے متاثر ہونے کی بات کہی ہے۔ باقاعدہ تحریری طور پر بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی سیمابی کیفیت اور تخلیقی رو کبھی کبھی ترقی پسند فکر کی بیجا بندشوں کے خلاف بھی اظہار کر جاتی، جس سے اکثر غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں۔ ایک

آزاد اور جمہوری انجمن ہونے کی وجہ سے اس میں ایسی کوئی پابندی بھی نہ تھی۔ آخر وہ ایک ادیبوں وشاعروں کی انجمن تھی اور فراق کے بڑے شاعر و فنکار ہونے میں کسے شبہ یا انکار ......! جو لوگ فراق صاحب کے قریب رہے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ فراق کی آزادانہ، خلاقانہ طبیعت اور ان کی ذاتی پسند و ناپسند اکثر خود ان کے ہی بیانات وخیالات کی ضد پیش کر دیتی تھی اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کے وفاداران و خدمت گزاران ہی ان کی ضد اور عتاب کا شکار ہو جاتے۔ ان سب کی وجہ سے فراق صاحب نے جہاں اپنی شاعری اور فنکاری کے ذریعہ ہردلعزیزی وشہرت حاصل کی وہیں اپنی متضاد آرا اور جھگڑالو شخصیت کی وجہ سے اچھے خاصے لوگ لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ فراق کی شاعری کو اس لیے زیادہ ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ وہ ذاتی اور شخصی طور پر فراق کو ناپسند کرتے ہیں۔ بہر حال انجمن اور سجاد ظہیر سے ان کی وابستگی ایک تاریخی حقیقت ہے، اسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

ایسی مزاجی کیفیت اور پیچیدہ صورت میں سجاد ظہیر کی موت کے بعد تاثرات فراہم کرنا وہ بھی عمر اور مزاج کی اس منزل پر جہاں "مسند ہے میرا فرمایا ہوا" خواہ کتنا ہی مبالغہ آمیز اور ناقابلِ یقین سا ہو، مجھ جیسے حقیر طالب علم کے لیے مشکل تو تھا ہی لیکن اس زمانے میں میں ان کے بہت قریب تھا۔ ایم۔اے۔ سال اوّل کا طالب علم تھا۔ احتشام حسین کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی موت کا فراق صاحب پر اچھا خاصا اثر تھا۔ وہ احتشام حسین صاحب کو بیحد عزیز رکھتے تھے اور احتشام صاحب کا آخری شاگرد ہونے کی وجہ سے کسی حد تک مجھے بھی ان کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہو چکی تھی۔ ان کی شفقت وعنایت کا شرف حاصل ہو چلا تھا اور ان کی مزاجی کیفیت، اس کے پیچ وخم اور زیر و بم کی قدرے معرفت بھی حاصل ہو چلی تھی۔ مجھے اس بات کا اندازہ بہر حال ہو چلا تھا کہ ان کی گفتگو کا انحصار عموماً ان کے موڈ پر ہوا کرتا ہے اور یہ موڈ کسی معمولی انسان کا نہ ہوتا بلکہ واقعتاً ایک فنکار کا ہوتا تھا۔

ایک بار گرمی کے موسم میں جب ان کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک بجلی چلی گئی شدید گرمی کی وجہ سے جب وہ پسینہ پسینہ ہونے لگے تو میں پاس میں پڑے ہوئے اخبار کو پنکھے کی طرح جھلنے لگا انھوں نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر اچانک چیخے اور نوکر کو آواز دی۔

''پنّا ......پنّا.....!''

اور پنّا بھاگا ہوا آیا۔

''ارے فوراً روح افزا کا شربت پلا ورنہ میں ابھی دم توڑ دوں گا۔''

انھوں نے کچھ اس طرح یہ جملہ ادا کیا جیسے کہ بس ابھی دم نکلنے والا ہو۔ پھر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولے۔

''صدیاں ہوگئیں اس خوش رنگ شربت کو پیے ہوئے۔ کم بخت اچھا خاصا مزے کا ہوتا ہے۔''

اور پھر وہ روح افزا کی تاریخ بیان کرنے لگے۔ بات ہمدرد تک پہنچی۔ حکیم عبدالحمید سے بات ہوتی ہوئی حکیم اجمل تک آئی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد تک پہنچی۔ ملاحظہ کیجیے کہ کہاں گرمی سے دَم نکلا جا رہا تھا۔ کہاں مولانا کی گرمی فکر کی بات نکل آئی۔ وہ ان کی قومیت کی تعریف کرتے رہے۔ اس کے بعد اچانک قے کرنے والی اسٹائل میں بولے۔

''اور ایک اقبال کی قومیت ہے.........''

مجھے معلوم تھا کہ فراق صاحب کو اقبال کی برائی کرنے کا بہانہ چاہیے۔ اس درمیان پنّا شربت لے کر آ گیا اور بولا۔

''شربت لیجیے حضور۔''

اس کی آواز سے فراق کا سلسلہ گفتگو ٹوٹ گیا اور وہ بھی اقبال کی برائی کا سلسلہ۔ بپھر کر بولے۔

''حرام زادے دیکھتا نہیں کہ اقبال کی سَستی قومیت کی مذمت میں مصروف ہوں اور تجھے شربت کی پڑی ہے۔''

پنّا ہوشیار ملازم تھا اور فراق کا مزاج شناس بھی۔ چُپ چاپ سرک لیا۔ جس روح افزا کی ابھی وہ تعریف کر رہے تھے وہ انھیں اقبال کی برائی سے زیادہ عزیز نہ تھا۔ میری مجبوری دیکھیے کہ مجھے اقبال کی برائی سُننی پڑی اور شربت سے بھی محروم رہا۔ یہ تو تھی ان کی مزاجی کیفیت۔ ایک پل میں کچھ، دوسرے پل میں کچھ اور ایسی صورت میں ہمہ وقت یہ خطرہ بنا رہتا تھا کہ آپ جس مقصد سے ان کے پاس گئے ہیں اس کی تکمیل ہو پائے گی یا

نہیں۔آپ تعریف پائیں گے یا ڈانٹ کھا کر واپس آئیں گے۔کبھی کبھی تو زہر کے گھونٹ پینے پڑ جاتے۔۔میں اس کا بھی عادی ہو چلا تھا۔

مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ صبح کے وقت جب ان کے ہاتھوں میں اخبار ہو اور سامنے چائے کی پیالی تو وہ نسبتاً بشاش رہتے ہیں۔اخبار کے حوالے سے بات نکالی جا سکتی ہے اور اسے ادب کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔چنانچہ اسی نیت کے ساتھ جب میں ایک صبح تقریباً ۹ ربجے ان کے گھر پہنچا تو بنگلے والے دالان میں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔حسب معمول ان کے ہاتھ میں اخبار تھا۔سامنے چائے کی پیالی اس کے علاوہ ایک بیحد خوبصورت اضافہ بھی تھا۔سامنے کرسی پر ایک نہایت حسین وجمیل، گوری چٹی پُرکشش لڑکی، ڈائری اور قلم لیے ہوئے بیٹھی ہوئی ہے اور فراق صاحب کی گفتگو کو لکھنے میں مصروف ہے۔غیر متوقع طور پر اتنی صبح ایسی حسین لڑکی کو دیکھ کر میں ڈگمگا سا گیا۔حالانکہ فراق صاحب کے یہاں جاتے ہوئے قدم پھونک پھونک کر رکھنے پڑتے تھے، لیکن آج معاملہ کچھ عجیب سا تھا۔انتہائی خاموشی سے دالان میں قدم رکھا تو فراق صاحب انگریزی ادب کے کسی موضوع پر زوردار تقریر کر رہے تھے۔میں تقریر ٹھیک سے سمجھ نہ سکا، ایک تو وہ انگریزی میں تھی، دوسرے یہ کہ کوئی بھی زندہ دل انسان ایسی خوبصورت شے کو دیکھ کر تقریر سمجھنا تو کیا سننا بھی گوارہ نہیں کرے گا۔خواہ وہ کتنی ہی جمالیاتی نوعیت کی ہو۔میں چُپ چاپ ایک مونڈھے پر ٹِک گیا پتہ ہی نہیں چلا۔فراق صاحب تقریر میں مصروف، لڑکی تقریر کو سمیٹنے میں مصروف اور میں نظارگی میں۔بس ذرا میک اَپ کچھ زیادہ تھا۔وہ لکھنے میں منہمک تھی۔اس کی مخروطی انگلیوں میں قلم بڑی تیزی سے کاغذ پر دوڑ رہا تھا۔پھر میں نے فراق صاحب کو غور سے دیکھا۔ان کی نظریں چھت کی طرف تھیں اور وہ لڑکی کے بالکل مخالف سمت چھت کی طرف گھورتے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔چونکہ ان کی گفتگو کی اپنی ادائیں ہوا کرتی ہیں اس لیے پہلے تو میں نے اس کو بھی ادا ہی سمجھا، لیکن کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسا شعوری طور پر کر رہے ہیں اور اس شعور کو ظاہر بھی کرتے چل رہے ہیں تو شاعرِ جمال کی حُسن سے بے نیازانہ ادا میرے سمجھ میں نہ آئی۔میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو فراق کے طبعِ نازک پر

گراں گذر رہی ہے۔ شاید یہ غلط وقت پر آ گئی یا کوئی غلط قسم کا سوال کر لیا۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک تقریر ختم ہوگئی اور اسی رفتار سے لڑکی کی اُنگلیاں بھی رُک گئیں۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ نمستے!''

وہ اُٹھی اور چل دی اور چشمِ زدن میں منظر بدل گیا اور پھر بقول جوش۔

''پٹری چمک رہی تھی گاڑی گذر چکی تھی''

فراق صاحب نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ایک یادگار شفقت کے ساتھ بولے۔

''کہیے مولانا.........اتنی صبح خیریت تو ہے۔''

''کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں....'' میں نے دبے لفظوں میں عرض کیا۔ میرے اعصاب پر ابھی بھی کچھ اور سوار تھا۔

''ابھی رک جایئے... پہلے میں ناشتہ کروں گا، ایک پیالی گرم چائے کی پیوں گا۔ اس کے بعد..... پنا...... پنا'' اور پنا حسب عادت تیز رفتار قدموں کے ساتھ انتظام میں مصروف ہوگیا۔ اس درمیان فراق صاحب نے سگریٹ سلگائی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون تھی.....؟''

''کون لڑکی.....؟''

''ارے یہ جو ابھی یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔''

''یہ کسی ڈگری کالج کی لکچرار ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنے آئی تھی۔''

''اچھا.......لیکن آپ اس کی طرف دیکھ کر بات کیوں نہیں کر رہے تھے......... اتنی خوبصورت، خوش شکل لڑکی آپ سے ہم کلام تھی اور آپ چھت کی طرف دیکھ رہے تھے ....آخر یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے از حد جسارت کی۔

فراق نے ایک لمبا کش ہوا میں پھینکا اور ٹیڑھا منھ کرتے ہوئے بولے۔

''خوش شکل، خوبصورت! میاں صاحبزادے ابھی آپ بچے ہیں۔ خوبصورت شخصیت کے لیے صرف خوش شکل ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اسے تھوڑا سا سمجھدار بھی ہونا چاہیے

اور پھر ادب وغیرہ کو سمجھنے کے لیے تو تھوڑی بہت بد چلنی بھی ضروری ہے، جو اس کے بس کی بات نہیں تھی...... پھر آپ اس کے چہرے کا گوبر دیکھ رہے تھے........''

''گوبر!'' میں چونکا۔

''جی ہاں...... اس کا میک اَپ۔''

''اب میک اب تو لڑکیاں کرتی ہی ہیں......'' میں نے عرض کیا۔

''میک اَپ لڑکیاں نہیں، عورتیں کرتی ہیں... جناب والا میک اَپ کا اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔''

''میک اَپ کا فلسفہ...... وہ کس طرح؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی.... آپ اسے ابھی نہیں سمجھ سکیں گے..... بھائی سیدھی سی بات یہ ہے کہ حُسن اگر واقعی حُسن ہے تو پھر اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی، جو حُسن سہارا مانگے تو پھر وہ فطری حُسن نہیں ملاوٹ ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میک اَپ کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب حُسن ڈھل رہا ہو تب اس کو سہارا دینے کی غرض سے میک اَپ کی مدد لی جاتی ہے.... جس طرح دیہات میں چھپّر کو سہارا دینے کے لیے تھونی وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ چھپّر گر نہ پڑے۔ اس طرح حُسن کا چھپّر گرنے پر آجائے تب میک اَپ تھونی کی طرح اسے سہارا دیتا ہے۔'' فراق صاحب نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو گول گول کر کے اس طرح سے اشارے کئے کہ جیسے چھپّر گرنے والا ہو اور فراق اسے سنبھالے ہوئے ہوں۔

''لیکن آپ باتیں تو بڑی اچھی کر رہے تھے، اتنی خراب موڈ کے باوجود۔''

''وہ تو غصہ کے عالم میں تھا۔ آدمی کبھی کبھی غصہ میں بھی اچھی باتیں کر جاتا ہے۔ ق.... ق.... ق....''

کم از کم فراق صاحب کے تعلق سے یہ بات سچ ہے۔ اکثر ناپسندیدہ صورت انھیں مہمیز کرتی اور وہ مخالف فلسفہ سے ہوتے ہوئے جس طرح علم و فضل کی گنگا بہاتے کہ سننے والا بھی اسی میں سرشار اور شرابور ہو جاتا۔ اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میک اَپ کے ذریعہ جس طرح وہ فلسفۂ حُسن تک پہنچے اور پھر اس کے بڑے اور عالی تصورات کو پیش

کرتے ہوئے جس طرح کی باتیں اور مثالیں دیں وہ کس قدر فکر انگیز اور حیرت انگیز تھیں کہ جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اس وقت میرے لیے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ گفتگو کا جو موضوع اور بہاؤ تھا اور جس طرح وہ دریائے حُسن و جمال میں بہہ رہے تھے اور مجھے بھی بہائے لیے جا رہے تھے اس میں سجاد ظہیر کو درمیان میں کیسے لاتا۔ لیکن خدا بھلا کرے پنّا کا کہ ایسے موقع پر وہ ہم لوگوں کے بڑے کام آتا تھا۔ اسی درمیان وہ چائے وغیرہ لے کر آ گیا۔ پہلے میں سمجھا کہ کہیں پھر نہ ڈانٹ پڑ جائے لیکن اس وقت فراق صاحب کو واقعی چائے کی ضرورت تھی۔ بس گفتگو کی اور چائے پینے لگے، مجھے نہ پوچھا اور نہ کہا۔ غصہ آیا لیکن پنّا نے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر میں ایک چھوٹے سے گلاس میں مجھے بھی چائے دے گیا۔ میں چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ گفتگو کہاں سے شروع کروں۔ چائے کے بعد وہ کچھ غنیمت نظر آنے لگے تو میں نے گفتگو چھیڑنے کی جرأت کی حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اتنی گفتگو کر چکے ہیں کہ اب میرے موضوع پر زیادہ نہیں بول پائیں گے۔ پھر بھی مجھے کچھ نہ کچھ تو چاہیے تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"حضور آپ سے سجاد ظہیر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو......"

"کیوں بھائی خیریت تو ہے......"

"دراصل بات یہ ہے کہ 'حیات' سجاد ظہیر کا نمبر نکال رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے کچھ خیالات و تاثرات جاننا چاہتا ہے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

"پوچھو بھئی..... بنّے کے بارے میں بھی پوچھ لو..." پھر وہ بغیر پوچھے خود ہی بول پڑے۔

"ارے بھئی..... اب یادِ رفتگاں کی بھی طاقت نہیں رہی۔ اَسّی سال کا ہو رہا ہوں۔ میرا بھائی تو اکسٹھ سال میں چل بسا...... دوسرا بیمار چل رہا ہے...... بنّے بھی میرا بھائی جیسا ہی تھا۔" انھوں نے یہ جملے بڑے دُکھ کے ساتھ ادا کیے اور پھر بولنے لگے۔

"سجاد ظہیر سر وزیر حسن کے لڑکے تھے۔ ان کے والد کچھ طبقاتی کمزوریوں کے باوجود ایک عظیم آدمی تھے۔ الہ آباد کے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کے یہاں

سے آمد و رفت تھی۔ بس انھیں کے ذریعہ سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی۔ شروع شروع میں سجاد ظہیر سے کم ان کے دوسرے بھائیوں سے زیادہ اچھے تعلقات رہے لیکن رفتہ رفتہ میں اپنے آپ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرا ذہنی جھکاؤ سجاد ظہیر کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ بعد میں تو سجاد ظہیر سے ایسے تعلقات ہو گئے کہ انھیں کلیجے کا ٹکڑا سمجھتا رہا۔ بڑا افسوس ہوا مجھے ان کے انتقال کا.....'' وہ ذرا پژمردہ ہو گئے۔ میں بولا۔

''جی ہاں..... سجاد ظہیر کا انتقال ایک سانحہ ہے۔ آپ سجاد ظہیر کے بہت قریب تھے، آپ کو ان میں کیا زیادہ پسند آیا۔ چائے تھرتھرا اُٹھی اور آخری گھونٹ ان کے حلق تک جا پہنچا۔ سگریٹ بجھ چکی تھی انھوں نے اس کو دوبارہ جلایا۔ ایک ایک طویل کش فضا میں تیر گیا۔ وہ کہنے لگے۔

''بھئی..... سجاد ظہیر کی شخصیت ان کی تمام چیزوں پر بھاری تھی۔ ظہیر میں ایک عجیب مقناطیسی کشش تھی۔ اتنا پیار، اتنا خلوص اور اتنی مسکراہٹ میں نے آج تک کسی چہرے پر نہیں دیکھی۔ ایک عجیب شکل میں لوگ ان کے بارے میں محسوس کرتے اور سوچتے تھے کہ کے دلکش چیز ہے یہ سجاد ظہیر بھی۔ سجاد ظہیر نے اگرچہ لکھنے پر زیادہ زور نہ دیا، مگر ان کی تحریر زیادہ پسند ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سجاد ظہیر ایک نہ تھے، بلکہ دو تھے۔ پہلے Lover اور دوسرے Lover Worker۔ وہ ادیب کی حیثیت میں زیادہ رہے اور Worker وہ عوام میں رہے۔''

''فراق صاحب! جب آپ ان کی تحریروں کو اتنا پسند کرتے ہیں تو آپ کو ان کی تخلیقات میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند آئی.......؟''

''حافظ پر ان کی کتاب میرے خیال میں سب سے اچھی ہے۔ جو ان کی شعر فہمی اور سخن فہمی کی صلاحیتوں کی زبردست مثال ہے۔''

''ایک بات اسی سلسلے میں اور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے ان کی شعر فہمی اور سخن فہمی کی صلاحیت کو تسلیم کیا ہے تو آپ کی شاعری کے بارے میں کبھی سجاد ظہیر نے اپنی ناقدانہ رائے اپنی تحریر یا تقریر میں ظاہر کی یا آپ سے کبھی اس بارے میں زبانی بات چیت کی...؟''

شاید سوال دلچسپ تھا۔ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

''مجھے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کے اتنے بڑے قدر شناس اور قدرداں شاید دو ایک ملے ہوں، جتنے بڑے قدرداں سجاد ظہیر تھے۔ میرے ایک مصرعہ کو ایک بار میرے ہی اوپر چسپاں کر دیا۔

میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن

اور سجاد ظہیر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا:

''فراق تم ایسا وقت ہو جس کا گھٹنا ممکن نہیں۔''

''سخن فہمی میں بنّے کے برابر کم ہی لوگ ہوئے ہیں۔ حافظ پر ان کی کتاب اس بات کا ثبوت ہے۔ بہت سے ترقی پسندوں میں میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ ہر ادبی تخلیق میں کوئی پیغام یا سیاسی تحریک ڈھونڈتے ہیں۔ سجاد ظہیر اس نقطۂ نظر سے بہت بلند تھے اور اسی بات نے ان کو حافظ کا اتنا بڑا پرستار بنا دیا تھا۔ خود میری شاعری میں یہی پیغام ہے اور وہ مقصدی بھی ہے، لیکن زیادہ تر خالص جمالیاتی ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا ہے میری نظم ''شام عیادت'' کا سب سے پہلا ریویو سجاد ظہیر نے اپنے اخبار میں کیا۔ اسی سے ان کی سخن فہمی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے میری شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ ''فراق کے بعض اشعار نشتر ہوتے ہیں اور بعض بلاوجہ استادی کے لیے کہے ہیں........

میں نے یہ جملہ پڑھا تو چالیس شعر کہہ کر بھیج دیے اور لکھ دیا کہ جو چاہو کاٹ دو، جو چاہو چھاپ دو۔ انھوں نے پوری غزل چھاپ دی۔ ایک شعر اسی غزل کا یاد آرہا ہے، لکھ لو......

کسی نے نیم نگاہی سے مجھ کو دیکھا تھا   یہ زندگی ہے اسی زخم ناتمام کی یاد

اس کے علاوہ بعض دوسری غزلیں بھی ان کو بہت پسند تھیں۔ خاص طور پر وہ میری اس غزل کو بہت پسند کرتے تھے.....

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اور یہ شعر تو ان کو بہت ہی پسند تھا.....

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چُرا کے رہ گئیں

''سجاد ظہیر کے بارے میں کچھ اور بتائیے۔ آپ تو ان کے بہت قریب رہے ہیں؟'' میں نے ان کو کریدا۔

''سجاد ظہیر میں کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ وہ کسی معاملے میں چھوٹے پن کے ساتھ قطعی نہ سوچتے تھے۔ آج تک کوئی خوردبین ایجاد نہیں ہوئی جس سے ان کی شخصیت میں، ان کے عمل میں، ان کے نظریے میں چھوٹا پن آسکے۔ لڑکپن میں لیڈری اور دلفریبی کی ہر آن ان کی پیشانی پر تھی۔ ذرا سی دیر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کرنا ان کے لیے بہت آسان تھا۔ لکھنؤ کی راتیں سجاد ظہیر کے سلسلے میں یادگار رہیں گی۔ آج تک میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس سے اچھا آدمی میں نے اپنی زندگی میں دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ یہاں تک کہ جواہر لعل نہرو یا کسی اور بڑے آدمی میں بھی میں نے ایسی بلا کی کشش نہیں پائی۔ ایسی ہر دلعزیز شخصیت کا دشمن اس آدمی کے لیے بھی ممکن نہیں جو اس کا دشمن ہو۔''

وہ تھوڑا سا جذباتی ہوئے اور لڑکھڑائے۔ چہرے پر تکان صاف نظر آنے لگی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ بات زیادہ نہیں کی جاسکتی، حالانکہ باتیں بہت سی تھیں۔

''بس حضور! ایک چھوٹا سا سوال اور عرض ہے۔''

''پوچھو بھئی..........''

''جس وقت آپ نے سجاد ظہیر کی موت کی خبر سنی تو کیا ردِّ عمل رہا؟''

''جب میں نے سجاد ظہیر کی موت کی خبر سنی تو میں بہت غمگین ہو گیا۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ ایک نہایت قابلِ قدر ہندوستانی اور ایک بہت اچھا دوست اور ایک Born and highly gifted leader ہمارے درمیان نہیں رہا۔''

باتیں تو شاید اور ہو سکتی تھیں لیکن اب میں ان کو مزید زحمت دے کر اپنی عزت و آبرو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہ رہا تھا۔ اجازت لے کر رخصت ہوا۔

(فروری ۱۹۷۴ء)

□□□

امرت رائے کی یاد میں

امرت رائے صاحب کی شخصیت کے بارے میں لکھنا خوشبو کو مٹھی میں قید کرنے کے برابر ہے۔ ان کی اداؤں، گلابی قسم کی پُر لطف باتوں اور ان کے کھنک دار قہقہوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے، لکھا نہیں جاسکتا۔ ان کی شخصیت کے بارے میں بس کچھ اشارے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

میں نے جب ہوش و حواس کی آنکھیں کھولیں اور ادب کی محفلوں میں آنا جانا شروع کیا تو اس وقت الہ آباد کے ادبی اُفق پر چار پانچ لوگوں کا دور دورہ تھا۔ اردو میں فراق گورکھپوری اور پروفیسر احتشام حسین اور ہندی میں مہادیوی ورما، سمترانندن پنت اور امرت رائے تھے تو اپیدر ناتھ اشک، رام کُمار ورما، امرکانت، اعجاز حسین وغیرہ بھی۔ لیکن فراق اور امرت رائے کے مقابلے یہ لوگ کسی اور دنیا کے معلوم ہوتے تھے۔ فراق صاحب کی عظمت کا تو سبھی لوہا مانتے تھے، لیکن ان کی شخصیت جتنی عظیم تھی اتنی ہی متنازعہ فیہ۔ ان کی بیباکی اور بے لگامی خود ان کے لیے اور ان کے چاہنے والوں کے لیے مصیبت بنی رہتی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود فراق کی تخلیقی گفتگو اور علمی شخصیت سب کو اپنے حصار میں لیے رہتی کہ یہ سب کچھ فراق کا اپنا تھا، سب کچھ اپنا۔ اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود فراق کی شامیں اکثر آباد رہتیں اور انھیں شاموں کے بطن سے کوئی نہ کوئی شگوفے پھوٹتے رہتے۔ فراق اور پنت اپنی شہرت و عظمت کی بلندیوں پر تھے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ ان لوگوں کو ہی ملنے والا تھا اور آگے پیچھے دونوں کو ملا بھی۔ فراق نے اس اعزاز کے ملنے کے بعد اپنے گھر پر نشست رکھی تھی۔ شاید ۱۹۷۱ء کی بات ہے، ان کے گھر کے آنگن میں لمبی چوڑی نشست تھی۔ الہ آباد کے سبھی عمائدین ادب شریک تھے۔ ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کی بھیڑ، ادب کا چھلکتا ہوا جام۔ اسی بھیڑ میں میں نے پہلی بار امرت رائے صاحب کو بھی دیکھا۔ سب سے الگ، گورے چٹے، چھریرے بدن کے امرت رائے۔ غالباً اس وقت ان کی عمر پچپن یا ساٹھ سال

کی رہی ہوگی، لیکن لگے چالیس کے۔ لیکن ان کی عمر کم دکھائی دینے پر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کہ ان کی رنگت دیکھ کر۔ کہیں سُن رکھا تھا کہ کائستھوں کے پاس صرف کھوپڑی ہوتی ہے۔ بعد میں فراق کو بھی مزہ لے کر یہ کہتے سنا۔ (لیکن اس کے باوجود فراق اپنے آپ کو حسین وجمیل سمجھتے تھے)۔ امرت رائے جی کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے لگا کہ اردو ہندی کے اس بھرے پُرے جلسے میں پریم چند آگئے ہوں اپنے دوست کو مبارکباد دینے، اپنے ورثاء سے ملنے۔ پریم چند کی تصویر ذہن میں بسی تھی۔ امرت رائے اس میں فِٹ ہوتے نظر آئے، بس مونچھوں کا فرق تھا۔ امرت رائے صاحب کی مونچھیں نہیں تھیں۔ ولایت ہو آئے تھے، لمہی گاؤں چھوٹ چکا تھا۔ الہ آباد کے سب سے اچھے اور مہنگے علاقہ میں رہتے تھے، کچھ فرق ہونا ہی تھا۔ پہلی نظر میں کچھ ایسا ہی لگا۔ بعد میں جب پہلی بار ان کے عالی شان مکان ''دھوپ چھاؤں'' جانے کی سعادت ملی تو معاً یہ خیال آیا کہ پریم چند سے لکشمی کس قدر روٹھی رہی، دولت دھوپ چھاؤں کی طرح رہی اور آخر کار پیچش کی بیماری میں مرگئے۔ اولادیں آرام سے رہ رہی ہیں۔ ایک بچکانہ سا تاثر، ایک فطری احساس۔ پھر میں ایم۔اے۔ میں مصروف ہو گیا۔ اخباروں میں، محفلوں میں امرت رائے کے چرچے رہتے۔ احتشام حسین، گیان چند جین، سید محمد عقیل کی زبان پر ان کی کتاب A HOUSE DIVIDED کے تذکرے بھی سنے، ذرا الگ انداز میں لسانی پیچ وخم کے حوالے سے۔ تو سچ یہ ہے کہ ابتداً امرت رائے کے بارے میں کچھ اچھا تاثر نہ بن سکا، بالکل ویسا ہی تاثر جو بڑے باپ کے بیٹوں کے بارے میں اکثر بلاوجہ بن جایا کرتا ہے۔ ریسرچ کے درمیان میں نے جب امرت رائے صاحب کے بیٹے آلوک رائے کو دیکھا جو شعبۂ انگریزی میں استاد تھے اور ہاؤ بھاؤ میں انگریزی میں شرابور تو میری اس سوچ میں مزید تقویت پیدا ہوئی۔

بہار کے ایک ممتاز اور بزرگ افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی پریم چند اسکول کے بڑے مشہور افسانہ نگار ہوئے ہیں۔ ترقی پسندی کے تعلق سے ہمارے بھی ان سے اچھے رشتے ہوئے۔ ایک بار دہلی سے پٹنہ جاتے ہوئے ہم نے انھیں الہ آباد میں روکا۔ قیام کا انتظام ہم نے کیا تھا لیکن وہ اپنی وضع داری کے تحت امرت رائے صاحب کے یہاں

ٹھہرے۔ ہمیں یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ لیکن اس قیام نے میرے دل و دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ جس صبح وہ امرت رائے کیا یہاں قیام پذیر ہوئے میں ان سے ملنے امرت رائے صاحب کے گھر گیا، اسی وقت میں نے اپنا تعارف کرایا اور پھر میرا تعارف ہی کیا۔ سہیل عظیم آبادی کئی روز سے سفر پر نکلے ہوئے تھے، شدید تکان طاری تھی، بیمار سے لگ رہے تھے اور پھر طبیعت ان کی بگڑتی ہی گئی۔ امرت رائے صاحب کو میں نے خاصا پریشان دیکھا۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے مجھے اپنی کار میں بٹھایا اور ڈاکٹر کو بلانے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ دل کا دورہ پڑا ہے، فوراً اسپتال میں داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں ڈر گیا۔ امرت رائے صاحب فوراً اسپتال لے جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ سُدھا جی (بیگم امرت رائے) اس تگ و دو میں برابر کی شریک تھیں۔ سہیل صاحب کو لے کر ہم لوگ اسپتال پہنچے۔ اسپتال والوں نے INSENTIVE CARE میں بھرتی تو کرلیا لیکن بجلی ندارد تھی، اس لیے ڈاکٹر بھی غائب تھے۔ دوپہر تین بجے سے لے کر شام آٹھ بجے تک بجلی غائب رہی اور سہیل عظیم آبادی پانچ گھنٹے تک اس کسمپرسی میں نیم بیہوشی کے عالم میں پڑے رہے اور امرت رائے صاحب ایک پیر سے کھڑے اپنے دوست کی بے کسی، اسپتال والوں کی بے حسی اور اپنے بے بسی پر ہاتھ ملتے رہے۔ (اس زمانہ میں پرائیویٹ نرسنگ ہوم کا چلن عام نہ تھا) میرے لیے تو سب کچھ نیا تھا۔ حیرت ناک اور افسوس ناک بھی۔ جب لائٹ آئی تو سہیل صاحب کی حالت کافی بگڑ چکی تھی۔ آنکھیں کمزور ہو چلی تھیں، نبض ڈوب رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ آخری بار جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو کچھ اشارے کیے جسے میں سمجھ نہ سکا لیکن امرت رائے صاحب سمجھ گئے۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پٹنہ سے بلوانا چاہ رہے تھے۔ پھر انھوں نے میری طرف دیکھا، میرا ہاتھ پکڑا۔ امرت رائے صاحب کا ہاتھ انھوں نے پہلے ہی سے پکڑ رکھا تھا، دونوں کا ہاتھ ملایا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکٹر نے ایک عام آدمی کی طرح ان کی موت کا اعلان کر دیا۔ امرت رائے صاحب بلک اُٹھے۔ سُدھا صاحبہ جورات کا کھانا لے کر آئی تھیں، سناٹے میں آگئیں۔ میں تو جیسے احساسِ جُرم میں مبتلا تھا۔ ایک عجیب سی حالت، ایک بے نام سی

بے چینی۔ امرت رائے صاحب نے فوراً پٹنہ اطلاع دی اور ضروری ہدایات دے کر سہیل صاحب کے جسدِ خاکی کے پاس ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح بیٹھ گئے۔ مجھے ہاتھوں کی جنبش یاد آتی رہی۔ پریم چند کے جانشین سہیل عظیم آبادی کے ذریعہ دو ہاتھوں کا سنگم، کیا یہ محض محبت کا ایک سنگم ہے یا دو نسلوں کا یا دو زبانوں کا، دو تہذیبوں کا۔ اچانک امرت رائے صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے ''اس یار نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہیں آ کے دھوکہ دینا تھا۔ میں دنیا والوں کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ سہیل تم بڑے ظالم نکلے۔''

وہ رات صدیوں پر بھاری تھی۔ مردہ سہیل عظیم آبادی اور نیم مردہ ہم لوگ۔ صبح تک پٹنہ سے کئی لوگ آ گئے۔ سارے شہر میں سہیل صاحب کی موت کی خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی، لوگ اکٹھا ہونے لگے لیکن میری نظریں امرت رائے صاحب کی طرف تھیں۔ عجب اتفاق ہے کسی کے بچھڑنے سے ہم کسی کو حاصل کر رہے تھے۔ رات جب طوفان ایکسپریس سے سہیل صاحب کے ورثا ان کا جسم ان کے وطن پٹنہ لے جا رہے تھے تو ہم نے ایک بہت قیمتی فنکار اور مخلص انسان کو کھو دیا تھا۔ لیکن کم از کم میں نے ایک بہت قیمتی انسان پا لیا تھا، امرت رائے کی شکل میں۔ جاتے جاتے سہیل عظیم آبادی ہم پر یہ احسانِ عظیم کر گئے۔

وقت گذرتا رہا۔ ہم اپنے اوپر نازاں و فرحاں رہے کہ ہم نے پریم چند کے بیٹے امرت رائے کی قربت حاصل کر لی۔ صحبت حاصل کر لی، گویا پریم چند کی صحبت دیکھ لی۔ پھر تو برابر آمد و رفت رہی۔ وہ برابر یاد کرتے رہے، میں برابر حاضری لگاتا رہا۔ صاف اندازہ ہوا کہ امرت رائے صاحب ایک مخلص، مشفق بھولے بھالے، سادہ اور سچے انسان ہیں اور میرا یہ تاثر نہ صرف بدلتا گیا بلکہ ایک بے نام عزت و عقیدت میں تبدیل ہوتا گیا۔ بڑی بے تکلفی سے میں آتا جاتا، ان کی خدمت میں بیٹھتا اور کبھی کبھی تو یہ صورت ہوتی کہ ہم گھنٹوں دالان میں بیٹھیں باتیں کرتے۔ انھیں اردو ادب، اردو کے ناول نگاروں (پریم چند کو چھوڑ کر) خصوصاً سرشار، شرر، رسوا وغیرہ باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا۔ شاید قدما کے ہی ناول انھوں نے پڑھ رکھے تھے۔ شرر میرے تحقیق کا موضوع بھی تھا، اس لیے اکثر گفتگو کا مرکزی موضوع ناول نگار ہی ہوتے۔ اچھی اردو بولتے، اچھے لب و لہجے میں بولتے، ان کے منھ

سے جب اردو کے خوبصورت الفاظ نکلتے تو ایسا لگتا کہ بیلے کے پھول مہک رہے ہوں۔ فضا میں سوندھی سوندھی خوشبو تیر جاتی۔ وہ جو کہنا چاہتے پورے جسم کے ساتھ اس لب ولہجے میں ڈھل جاتے اور گفتگو آئینہ کی طرح آر پار تو ہو ہی جاتی لیکن اس میں فن اور رس پیدا ہو جاتا۔ ایک بار سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' پر گفتگو چلی تو بڑی دیر تک اس کی خوبیوں و خرابیوں پر باتیں کرتے رہے پھر ذکر خوجی کا چل نکلا تو عجیب طرح کا قہقہہ ان کے حلق سے نمودار ہوا۔ ایک ایسے قہقہہ جس نے بغیر کہے سنے خوجی کے کردار کے بارے میں سب کچھ کہہ دیا۔ مجھ کو گفتگو کا یہ انداز بڑا اچھا لگتا اور میرا خیال ہے کہ فراق اور امرت رائے یہ دونوں ایسی شخصیتیں تھیں جنھوں نے اپنی گفتگو اور اندازِ گفتگو کے ذریعہ اپنی فنکاریت کا سکہ جما رکھا تھا۔ کم لوگ تھے جو ان کے جادو کے اثر سے بچ رہے ہوں۔

جب میں نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر ڈی۔ فل کا مقالہ لکھنا شروع کیا تو باوجود اس کے کہ وہ شرر کی اسلامی احیاپرستی کو ناپسند کرتے تھے لیکن ان کے ناول ''فردوسِ بریں'' کی بہت تعریف کرتے اور اسے اردو ناول کے بہترین ناولوں میں شمار کرتے۔ وہ شرر کو ہمیشہ مولانا کہتے۔ ابتداً مجھے لگا کہ یہ طنز و تعصب میں ایسا کرتے ہیں، بعد میں جب میں نے انھیں پریم چند کو منشی جی کہتے سنا اور مجھے بھی وہ اکثر مولانا ہی کہتے۔ میرے ایک دوست جن کے داڑھی ہے ان کا کبھی وہ نام نہ لے پاتے، بس داڑھی کی طرف اشارہ کرتے تو میں سمجھ گیا کہ یہ ان کا اپنا اسٹائل ہے۔ انسانوں کو دو ایک ملاقاتوں میں نہیں پرکھا جا سکتا، اس کو اطمینان اور فراخ دلی سے دیکھنا اور سمجھنا چاہیے، لیکن فراق اور امرت رائے جیسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک عمر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وہ بھی ناکافی۔ اکثر ہوتا ہے کہ متعدد چھوٹی بڑی ملاقاتوں کے بعد آخرکار ایک انسان کے بارے میں ایک رائے بن ہی جایا کرتی ہے۔ احتشام حسین بہت بڑے ادیب و نقاد تھے، میرے استاد بھی تھے۔ ان کے بارے میں میری ایک رائے ہے۔ مسیح الزماں اور سید محمد عقیل بھی میرے استاد ہیں۔ ان کے بارے میں بھی غلط یا صحیح میری اپنی رائیں ہیں، لیکن فراق کے بعد امرت رائے مجھے دوسرے ایسے شخص ملے کہ جب جب میں نے ان کے بارے میں کوئی

رائے بنانی چاہی بعد کی ملاقاتوں میں اس کو بدلتے ہوئے ملے یا آگے بڑھاتے ہوئے ملے۔ عجیب رنگا رنگ شخصیت ہوتی۔ کتنی پرتیں، کتنے پہلودار، کیسے فنکار تھے یہ لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ امرت رائے سے ملاقات محض ملاقات نہ ہوتی، ایک واقعہ ہوتی۔ ایک تجربہ یا کم از کم کچھ بیحد دلکش اور لبھانے والے لمحے تو ہوتے ہی۔ ایسا اس لیے کہ یہ وہ لوگ تھے جو سماج کے نام نہاد رسم ورواج سے بیگانہ تھے۔ ہر طرح کے قید و بند سے آزاد۔ ان کی اپنی ایک دنیا تھی، اپنا ایک ماحول اور اپنی ایک سوچ اور فلسفہ۔ یہ سر سے پیر تک فنکار تھے جو تصوف، عشق، سیاست اور معاشرہ سے لے کر سبزی بھاجی کی باتوں کو بھی، نوکر چاکر کے مسائل کو بھی فنکارانہ ومصورانہ انداز میں لیتے اور بات سے بات پیدا کرتے ہوئے خیال کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے جہاں عام آدمی کا گذر نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ اپنے آپ سے سنجیدہ ہوں اور موضوع کے تئیں ایماندار تو پھر سب کچھ تو بدل جاتا ہی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی بہت بدلے ہوئے انسان تھے۔ فراق صاحب جب گفتگو کرتے تو آنکھیں کھلی رہتیں، دیدے رقص کرتے رہتے اور کبھی کبھی تو لگتا کہ اس قدر بولتے اور جاگتے ہوئے دیدے ہیں اور ان میں اتنی زندگی اور توانائی ہے کہ اپنی بات کہنے کے لیے وہ ایک شریر بچے کی طرح حدیں توڑ کر باہر نکل آئیں گے۔ لیکن امرت رائے کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ان کی آنکھیں اکثر بند رہتیں، سر جھکا رہتا۔ صرف ہاتھ اور ہاتھوں کی انگلیاں رقص کرتی رہتیں یا پھر حلق کے راستے سے نکلنے والے باریک اور مترنم قہقہے۔ آدھی بات وہ زبان سے کہتے اور باقی کی بات ان کا قہقہہ کہہ دیتا اور ہم سب ایک مخصوص دلکش فضا میں ڈوب جاتے۔ ذرا سوچیے کہ بند آنکھوں، جھکے سر کے ساتھ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا کس قدر مشکل کام ہے لیکن وہ یہ نازک اور مشکل کام اتنی آسانی سے کر جاتے کہ ہم حیرت میں ڈوب جاتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں بیٹھا زبان وادب پر کچھ باتیں کر رہا تھا۔ اچانک بولے۔ ''میاں فاطمی! اکثر سنتا ہوں کہ کسی بھی تخلیق کو آپ کتنا ہی اُٹھائیے یا گرائیے لیکن اصل فیصلہ تو وقت کرتا ہے۔''

''جی ہاں! اصل فیصلہ تو وقت ہی کرتا ہے۔'' میں نے عرض کیا۔

"لیکن کس طرح کرتا ہے؟ کیسے کرتا ہے؟"

اب میرے پاس اس کا کیا جواب تھا۔ اسی درمیان ملازمہ چائے لے کر آگئی۔ پھر وہ خود ہی بول پڑے۔

"خیر میاں چھوڑو، پتا تو ہمیں بھی نہیں ہے لیکن کم بخت کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔"

انھوں نے پہلے کمبخت پر زور دیا، اس کے بعد خوب پر۔ اور خوب پر اتنی لچک دی کہ مجھے لگا کہ یہ ایک بہت بڑا فلسفہ پھوٹ پڑا ہو۔ حالانکہ انھوں نے بھی اپنی نادانی ہی ظاہر کی تھی۔ لفظوں کا اتار چڑھاؤ اور اس کا فنکارانہ استعمال۔ معمولی لفظیات کو زندگی اور توانائی دینے کا فن میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے اس عمل میں بلا کا جادو تھا، بلا کی کشش تھی۔ بس اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔

کئی سال گذر گئے۔ امرت رائے صاحب سے نہ جانے کتنی ملاقاتیں ہوئیں، کتنی باتیں ہوئیں لیکن اس کا سب سے دلچسپ یا حیرت کا پہلو یہ ہے کہ ہم دونوں کے درمیان پریم چند کبھی نہیں آئے۔ ابتدا میں میں انھیں پریم چند سے الگ کر کے سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ خود بھی اور شاید میں بھی اس اثر سے باہر نکل چکے تھے۔ ان کے گھر میں پریم چند کے تہذیبی اثرات کے عکس تو ہر طرف دکھائی دیتے لیکن بذاتِ خود پریم چند نہیں دکھائی دیتے۔ یہ سب کچھ عجیب تو لگتا تھا لیکن خود امرت رائے کی شخصیت اس قدر عجیب وغریب تھی کہ سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ جاتا۔

۱۹۸۰ء میں جب پورے ہندوستان میں پریم چند صدی تقریبات منائی جانیں لگیں تو جگہ جگہ امرت رائے کی بھی مانگ ہونے لگی۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے زیادہ، ایک اسکالر کی حیثیت سے کم۔ وہ عام طور پر نظر انداز کرتے لیکن کہیں کہیں ناگزیر بھی ہو جاتا۔ اس زمانے میں ہر طرف پریم چند پر باتیں ہو رہی تھیں۔ پریم چند پر نئے نئے زاویے سے سوچا جا رہا تھا۔ بولا اور لکھا جا رہا تھا۔ میرا بے ساختہ جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی پریم چند کے بارے میں نئے نئے انداز سے سوچوں اور امرت رائے صاحب سے تبادلۂ خیال کروں۔ اسی درمیان بہار کے ایک ممتاز رسالے کے مدیر کا میرے پاس خط آیا کہ میں پریم چند نمبر

کے لیے امرت رائے سے ایک تفصیلی انٹرویو لے لوں۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا لیکن کچھ مشکلیں بھی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے دو حصوں میں باتیں کروں۔ ایک میں ادیب و ناقد کی حیثیت سے، دوسرے میں بیٹے کی حیثیت سے۔ کیا ایسا ہو سکے گا۔ کام مشکل تھا لیکن میں بھی ٹھان رکھی تھی۔ خاصی محنت کرنی پڑی، فضا ہموار کرنی پڑی۔ آخر ایک شام میں نے ایک کمزور لہجہ میں گذارش کر ہی دی۔

''حضور! بہار کا ایک رسالہ پریم چند نمبر نکال رہا ہے۔ ''قلم کا سپاہی'' کے مصنف سے ایک انٹرویو لینا چاہتا ہے۔''

میں نے بات گھما کر کہی۔ وہ تاڑ گئے۔ گردن میں لچک پیدا کی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے لب کھولے۔

''قلم کا سپاہی'' کا مصنف اب منشی جی سے بہت دور نکل آیا ہے، بہت ہو چکا۔ بہت ہو چکا۔ اب منشی جی پر باتیں کرنے کا من نہیں ہوتا۔ میاں معاف ہی کرو۔ کچھ اور باتیں کرو۔ آج کی باتیں کرو۔ پریم چند کی روایت کی بات کرو۔''

''جی! میں وہی کرنا چاہتا ہوں لیکن روایت کی شروعات تو پریم چند سے ہی ہوگی۔''

وہ ہچکچائے، رکے، مسکرائے لیکن اس سے پہلے کہ گردن نفی میں ہلتی میں بول پڑا۔

''پلیز! میری خاطر ایک زحمت اور سہی..........''

''چلو میاں۔ زہر کا ایک جام اور سہی........لیکن ایک بات میری ماننی پڑے گی کہ مجھ سے ان کے بیٹے کی حیثیت سے بات نہیں کروگے۔ اگر یہ تسلیم ہو تو کل شام آجاؤ۔''

''جی! تسلیم۔''

میں نے تسلیم تو کر لیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ خیر دیکھا جائے گا۔ دوسرے دن شام کو گفتگو شروع ہوئی۔ بڑی اچھی گفتگو۔ بڑے اچھے مسائل۔ بھرپور علمی و تحقیقی انداز۔ نہ جانے کیا کیا سوال ہوئے۔ اب یاد نہیں۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ مجھے اپنی طرف سے پریم چند کی بات نہیں کرنی پڑی۔ وہ خود ہی منشی جی منشی جی کرتے رہے اور ان کے فن، ادب اور سادگی پر روشنی ڈالتے رہے۔ ان کی محنت، ان کے روز مرہ

کے معمولات احاطۂ ذکر میں آئے۔ اماں کا بھی ذکر آیا اور بار بار آیا اور وہ قدرے جذباتی بھی ہوئے۔ میں نے لوہا گرم دیکھا تو فوراً وار کیا۔

''کیا آپ فخر نہیں کرتے کہ آپ ہندوستان کے اتنے بڑے ادیب کے چھوٹے بیٹے ہیں؟''

''کیوں نہیں فخر کرتا۔ منشی جی نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا۔ کہانی لکھنے کے گُر سکھائے۔ ایک بار کیا ہوا کہ میں نے اپنے بچپن میں ایک کہانی لکھی۔ غربت و مفلسی کی کہانی قارئین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے اصل کردار کو بے موت مار ڈالا، پھر کہانی منشی جی کو سنائی کہ غریبی کی کہانی ہے وہ خوش ہوں گے۔ انھوں نے کہانی پڑھنے کے بعد جو پتے کی بات کہی وہ میرے دل میں گھر کر گئی۔''

''میاں کہانی لکھنا ہے اور قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہے تو کردار کو مارے بغیر ہمدردی حاصل کرو۔ قاری کے کمزور جذبات سے کھیل کر کوئی کہانی کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

''بس میں نے وہ بات گرہ میں باندھ لی اور کرداروں کو مارنا اور خواہ مخواہ انھیں مظلوم و مجبور بنانا بند کر دیا اور اس طرح میری کہانیوں و ناولوں میں جان آتی گئی۔ منشی جی رخصت ہو گئے اور میں دھیرے دھیرے اپنی پہچان بنانے کی کوشش کرنے لگا۔''

''آپ کی اپنی پہچان بنانے میں منشی جی کے نام نے کوئی مدد کی۔''

''مدد.........میاں فاطمی! تم مدد کہتے ہو۔ اس نام نے ادبی سطح پر مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ میرے ہر کام کو منشی جی کے حوالے سے دیکھا جاتا۔ میرا ناول 'بیج' چھپا، خاصا مقبول ہوا۔ لوگوں نے پڑھا اور پسند کیا لیکن آخر میں یہ کہا گیا.... ناول 'بیج' اچھا تو ہے لیکن 'گئودان' سے ہلکا ہے....'' ''اب بتائیے 'گئودان' اور 'بیج' کا مقابلہ کیوں؟''

''اب بہت ساری آسانیاں ہیں تو کچھ دقتیں ہوں گی ہی......''

''کچھ نہیں.........تم اسے وقت کہہ رہے ہو، میری ادبی پہچان کے لیے تو یہ عذاب ثابت ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑے باپ کا بیٹا ہونا ایک عذاب ہے۔ ایک عمر لگ جاتی ہے برگد کے سائے سے نکلنے میں۔''

جب میں نے دیکھا کہ ان کے لہجہ میں تلخی آچکی ہے تو میں نے باتوں کا رُخ بدل دیا اور نئے ادب پر آگیا۔ اردو کے نئے ادب سے ان کی واقفیت زیدہ نہ تھی۔ پھر ہم نے اس دن ادب سے لے کر سیاست تک، ہندو مسلم تہذیب اور نہ جانے کیا کیا باتیں کر ڈالیں اور اس طرح وہ انٹرویو دوڈھائی گھنٹے کا ہو گیا لیکن اپنی طوالت کے باوجود وہ ایک اچھا انٹرویو تھا جسے بعد میں امرت رائے صاحب نے انٹرویو کی کتاب میں بھی شامل کیا۔ اسی سال میں نے اردو میں ''سوزِ وطن'' چھاپنے کی اجازت چاہی تو انھوں نے فوراً اجازت دی۔ صد سالہ تقریب کے موقع پر اردو میں ''سوزِ وطن'' کی اشاعت کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

ستمبر ۱۹۸۰ء میں، میں آگرے کے سینٹ جانس کالج میں لکچرار ہو کر چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں ملنے گیا۔ ''الہ آباد چھوڑ کر آگرے جا رہے ہو۔ میاں نظیر سے ہمارا سلام کہنا۔''

''میاں نظیر! میں چونکا ضرور لیکن وہ تو میرے نام کے ساتھ بھی میاں لگاتے تھے اس لیے اس اشاریت کو اس وقت سمجھ نہ سکا بعد میں آگرے جا کر بسنت کے دن مزارِ نظیر کے آس پاس عقیدت مندانِ نظیر کو جس طرح دیکھا طرح دیکھا سمجھا تب اندازہ ہوا کہ انھوں نے نظیر اکبرآبادی کو میاں نظیر کیوں کہا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرار ہو کر واپس الہ آباد آ گیا اور ملاقاتوں کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔

۱۹۸۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر لیے تو چاروں طرف گولڈن جبلی تقریبات منائی جانے لگیں۔ لکھنؤ میں اردو ہندی ترقی پسند ادیبوں کا اجتماع ہونے والا تھا لیکن عین انھیں دنوں وہ پتہ نہیں کیسے اور کس طرح ہندی کے ان ادیبوں کے گروہ میں چلے گئے جو اردو کو کسی بھی طرح دوسری سرکاری زبان دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ان دنوں ہندی کے کچھ ممتاز ادیبوں نے جن میں مہادیوی ورما، جگدیش

گپت وغیرہ بھی شامل تھے، اردو کے خلاف اخبار میں بیان دیا۔ مجھے اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس میں امرت رائے جی کا نام دیکھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ سے کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اردو کے تعلق سے ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کا رویہ کچھ نیا نہیں ہے۔ اس سے قبل یش پال، امرت لال ناگر بھی ایسا ہی کر چکے ہیں۔ لیکن امرت رائے صاحب! وہ تو ان سب سے بہت الگ مزاج اور کردار کے انسان تھے۔ پھر وہ تو پریم چند کے بیٹے ہیں۔ وہ پریم چند جو اردو افسانے کا بابا آدم ہے۔ ہم تمام ترقی پسند ادیبوں کا رہنما۔ ان کا بیٹا امرت رائے اردو کے خلاف۔ لکھنؤ کی کانفرنس میں الہ آباد سے ہم لوگ یعنی سید محمد عقیل، امرکانت، اجت پشکل وغیرہ شرکت کرنے گئے تو بھیشم ساہنی نے مجھ سے سوال کیا۔ ''امرت نہیں آئے؟'' میں کیا بتاتا۔ کسی نے کہا'' آج کل ان کی غیر ترقی پسندوں سے زیادہ پٹ رہی ہے۔''

لکھنؤ کی کانفرنس میں اردو ہندی سے متعلق جو تکلیف دہ تصویریں دیکھنے کو ملیں اس نے میری اس تکلیف کو اور بڑھایا۔ لکھنؤ سے واپس آتے ہی ان کی کتاب A House Divided پڑھی۔ کچھ سمجھ سکا۔ ہاں ایک بات ضرور گرفت میں آئی کہ امرت رائے صاحب کا خیال ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک عوامی سرمایہ ہوتا ہے۔ لوک ادب کا سرمایہ۔ اور چونکہ اردو کا اپنا کوئی عوامی سرمایہ نہیں ہے اس لیے اردو باقاعدہ کوئی زبان نہیں ہے۔

جلد ہی ان ہی دنوں میری کتاب ''نظیر اکبرآبادی چھپ کر آئی تو میں اس کی ایک کاپی امرت رائے صاحب کو دینے لگا۔ نظیر پر کتاب دیکھ کر وہ خوش ہوئے۔ میں نے بات چھیڑ دی۔ ''آپ کا خیال ہے کہ اردو میں عوامی ادب، عوامی شاعری اسرمایہ نہیں ہے۔ پورے طور پر یہ سچ نہیں ہے۔ آپ اس کتاب کو ملاحظہ کیجیے، آپ کو اندازہ ہوگا۔'' شاید پہلی بار میں نے کچھ تیور کے ساتھ لب کھولنے کی جسارت کی۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ گھر کے اندر گئے اور پھر برآمدے میں واپس آکر اپنی نئی کتاب مجھے عنایت کی اور اپنے اسی مخصوص انداز میں بولے۔ پہلے میں حساب چکتا کردوں، اس کے بعد باتیں۔ ورنہ میں احسان تلے دبا رہوں گا تو باتیں نہ کرسکوں گا۔'' اس درمیان وہ تیار ہو چکے تھے اور میرے کام

و ذہن میں جو ہلکی سی کڑواہٹ تھی دور ہو چلی تھی۔

''مبارک ہو فاطمی میاں! تم نے نظیر پر کام کر کے جی خوش کیا لیکن کیا تم نظیر کو پورے طور پر عوامی شاعر مانتے ہو؟ عوامی شاعر سے مراد لوک شاعر۔ اور لوک شاعر سے مراد وہ شاعر جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، جو گلی کوچے، گاؤں دیہات کا شاعر ہوتا ہے جس کے گیت عورتیں زچہ خانہ میں موںڈن، چھٹی میں گاتی ہیں۔ بیٹی کی رخصتی کے وقت، موت پر بین کرتے وقت جس میں دیہات و قصبات کے عوام کی دھڑکنیں بول رہی ہوں، جس میں گرمی، جاڑا، برسات جیسے موسم بول رہے ہوں جس میں آم کے بور کی، امرود کی کھٹی میٹھی مہک بول رہی ہو..... '' اور پھر وہ بڑی دیر تک بے تکان بولتے رہے اور میں پھر ایک بار ان کے طلسم کا شکار ہو گیا۔ ان کے لب و لہجہ میں کھو گیا۔ لیس ہو کر گیا تھا لیکن چاروشانے چت ہو چکا تھا۔

''بتاؤ کیا تم سمجھتے ہو کہ نظیر اس طرح کا عوامی شاعر ہے؟'' میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی، علم کو نچوڑا اور عرض کیا۔ ''یہ سچ ہے کہ جس فوک پوئٹری کی بات آپ کر رہے ہیں نظیر اس طرح کے شاعر تو نہیں ہیں لیکن کم از کم موضوعات کی سطح پر اور کہیں کہیں زبان و بیان کی سطح پر بھی نظیر ان سرحدوں کو چھوتے ہیں۔''

''چلیے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن کیا اکیلے نظیر سے کام چلے گا.....؟''

وہ پھر بولے ''نہیں ایسا نہیں ہے کہ نظیر اکیلے ہیں۔ نظیر کے علاوہ اور بھی ہیں۔ وقار انبالوی، مطلبی فرید آبادی، وامق جونپوری، نازش پرتاب گڑھی، سلام مچھلی شہری وغیرہ۔ دورِ قدیم میں بھی اچھا خاصا سرمایہ ہے جو کسی کے نام سے وابستہ نہیں ہے لیکن وہ عوامی شاعری ہے اور ایسی شاعری تو بس چلن میں آ جاتی ہے اور پھر سینہ بہ سینہ اپنا سفر طے کرتی رہتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ جس کو آپ لوگ گیت اور ہندی کا لوک ادب کہتے ہیں، ان میں سے بہت ساری چیزیں مشترک ہونے کی وجہ سے اس کے بیشتر حصہ کو اردو کا سرمایہ بھی کہا جا سکتا ہے۔''

لیکن اردو والوں نے تو اسے کبھی اپنا حصہ نہیں مانا بلکہ اسے علاحدہ کرنے یا اپنے آپ کو اس سے الگ رہنے میں ہی شان سمجھی۔ پھر ان گیتوں کی جو زبان ہے وہ اردو سے لگا

نہیں کھاتی تو آپ اسے اردو کا کیوں کر کہہ سکتے ہیں......"

وہ پوری سنجیدگی سے بحث کرتے ہوئے بولے۔

"بس اردو والوں سے یہیں پر گڑبڑ ہوگئی جس نے اس طرح کے عوامی سرمایہ سے متعلق نقصان پہنچایا۔ سچ تو یہ ہے حضور کہ اردو کی اُٹھان یا اردو کا خمیر کچھ اس طرح تیار ہوا کہ اسے ایک شہری زبان سمجھا گیا۔ تہذیب وتمدن کی زبان، نوک پلک کی زبان۔ نظیر پر ہی مضمون لکھتے وقت احتشام حسین نے اچھی بات کہی تھی کہ اردو کی اس معیار پرستی سے جہاں کچھ فائدے پہنچے ہیں، اچھے خاصے نقصان بھی ہوئے ہیں۔ تو اس معیار کی وجہ سے ہم نے بلا وجہ یہ عوامی سرمایہ کھو دیا۔ اگر امیر خسرو نے غزلیں نہ کہی ہوتیں تو ہم انھیں بھی کھو دیتے۔ یہی رویہ نظیر کے ساتھ اپنایا گیا۔ غالب کے زمانہ کے استاد شاعر شیفتہ نے جب اپنا تذکرہ "گلشنِ بے خار" لکھا تو نظیر کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کسی نے پوچھا کہ نظیر؟ بولے۔ وہ تو بازارو شاعر ہے۔ تو اس بازارو پن یا عوامی پن سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ اس معمولی پن کو بڑا بنایئے تو بات ہے، جیسے پریم چند نے بنایا۔ تو ہم نے اپنے اسی رویہ کی وجہ سے بہت کچھ گنوایا۔ کبیر، رسکھان، رحیم وغیرہ اسی قبیلے وسلسلے کے شاعر لیکن ہم غزل کی زلفیں سنوارنے میں اس قدر الجھے رہے کہ ہماری نظریں وہاں تک نہیں گئیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو کا عوامی سرمایہ نہیں ہے۔ سرمایہ ہے شاعری کا اور بولی کا بھی میری اس کتاب میں نظیر کی عوامی شاعری کے حوالے سے اردو کی عوامی شاعری پر تھوڑی سی باتیں ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ بیسویں صدی میں آکر جب پریم چند نے نثر میں، کہانی میں دیہات، قصبات، دُکھ درد، بھینس گوبر وغیرہ کی باتیں کیں تو اردو کے رومان مزاج افسانہ نگاروں نے پوری ایک تحریک چلا دی۔ تو ایسی صورت میں اٹھارویں صدی میں نظیر کو کس طرح قبول کیا جاتا۔ یہ تو کہیے کہ ترقی پسندوں نے نظیر کو دریافت کر لیا اور اسے ایک حیثیت عطا کی۔"

تھوڑی دیر کے لیے شاید میرا بھی جادو چلا یا میری خوش فہمی ہو لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ ان کا بڑکپن تھا جو اپنے سے چھوٹوں کی باتیں دھیان سے سُن سکتے تھے، جس طرح وہ اپنی بات کہتے تھے۔ اچانک انھیں کیا سوجھی کہ وہ بولی پر اتر آئے۔ بولی اور

زبان میں فرق بولی کا عوامی سرمایہ اور نہ جانے کیا کیا۔ جوابی حملہ تھا، پھر میں زبان کا آدمی بھی نہیں۔ صرف گردن ہلاتا رہا۔ زمانہ شناس امرت رائے نے میری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ حملے پر حملے کرتے گئے۔ یہاں تک کہ میں ٹوٹ کر بکھر گیا اور میرا وجود ہوا میں تیرنے لگا۔ اس دن امرت رائے پورے اسکالر نظر آئے۔ ان کا جمال تو آئے دن دیکھتا تھا۔ اس دن ان کا جلال دیکھا، جو ذرا کم دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس لیے کہ ان کی دانشوری، ان کا علم ہر وقت ان کو گھیرے نہ رہتا بلکہ ان کے اندر کا انسان کھلا اور چُلبلا انسان ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر حاوی رہتا۔

میں نے ان کے ادب کو زیادہ نہیں پڑھا، اس لیے ادیب و ناقد کی حیثیت سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ضرور محسوس کیا کہ جب وہ ہندی / اردو، ترقی پسندی پر، مارکسزم پر باتیں کرتے تو ان کا کھلا پن دور ہونے لگتا۔ عجیب طرح سے وہ ان موضوعات پر سوچتے اور اظہارِ خیال کرتے۔ کبھی سمجھ میں آتا، کبھی نہ آتا۔ لیکن جب وہ سجاد ظہیر، فیض، فراق، سردار وغیرہ پر باتیں کرتے تو ایسا لگتا کہ ہندی کے اس ادیب کے ہونٹوں پر صحیح غلط کے ساتھ اردو شاعروں اور ادیبوں کے نام ادا ہو رہے ہیں۔

میں نے امرت رائے صاحب سے جذباتی پہلوؤں پر کم باتیں کی ہیں، میری ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ دھیرے دھیرے میری دوستی ان کے بیٹے آلوک رائے سے بڑھتی گئی اور ایک نیا رشتہ بننے لگا۔ کتنی ملاقاتوں کا ذکر کروں۔ کن کن باتوں کو یاد کروں۔ آخر دنوں میں پتہ نہیں کیوں اور کس طرح ان کو اپنی کتاب A House Divided کے بارے میں دوبارہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ زبان سے متعلق اردو کی کئی کتابیں مجھ سے اور پروفیسر سید محمد عقیل سے منگوائیں۔ ہم لوگوں نے حاضر کیں۔ ہم لوگوں کو تجسس ہوا کہ کیا وہ اپنی رائے پر دوبارہ غور کر رہے ہیں یا پھر کوئی نیا گل کھلنے والا ہے۔ وہ ہم لوگوں سے باتیں بھی کرنا چاہ رہے تھے لیکن اسی زمانے میں ان کی بیوی سُدھا جی بیمار ہو گئیں اور اس کے فوراً بعد امرت رائے صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ ایک ہی نرسنگ ہوم کے دو روم میں میاں بیوی داخل کیے گئے۔ میں اور عقیل صاحب ان کو دیکھنے گئے۔ فالج کا اثر زبان پر بھی تھا، بول

نہیں پا رہے تھے۔ ساری زندگی زبان اور بولی پر بحث کرنے والا ادیب آج بول نہیں پا رہا تھا۔ ہم بے چین ہو گئے، زیادہ دیر ٹھہرا نہ گیا۔ تکلیف اور دُکھ کے عالم میں ہم واپس ہوئے۔ بیس برس کی کتاب کے ورق پھڑ پھڑانے لگے۔ بعد میں امرت رائے صاحب اور سُدھا جی اسپتال سے واپس گھر تو آگئے لیکن گھر ہی اسپتال بن گیا۔ جلد ہی سُدھا جی چل بسیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اب امرت رائے بھی بچ نہ سکیں گے اور وہی ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے اور اس طرح چوہتر سالہ زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا۔

عجب ستم ہے کہ گذشتہ دنوں موت نے الٰہ آباد میں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ کبھی بھیرو پرساد گپت، کبھی اُپیندر ناتھ اشک اور اب امرت رائے...... یہ سبھی لوگ خاص طور پر امرت رائے اردو، ہندی کے تعلق سے ایک روایت تھے۔ ایک دبستان، دو زبان اور دو تہذیبوں کا سنگم اور وہ ان دونوں کے درمیان ایک پُل۔ امرت رائے کی موت نے ادب کے لیے کتنا نقصان پہنچایا یہ فیصلہ تو وقت کرے گا۔ میرے لیے تو ایک پُل ٹوٹ گیا۔ سرشار اور شرر کا پُل، سجاد ظہیر اور پریم چند کا پُل، اردو ہندی کا پُل۔ تہذیبوں کے بکھراؤ کے اس دور میں ایسے پُلوں کا ٹوٹنا کے اس دور میں ایسے پُلوں کا ٹوٹنا کس قدر نقصان دہ ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

□□□

علی سردار جعفری: ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت

ترقی پسند فکر و فلسفہ تحریک کے ستون اور صفِ اوّل کے شاعر، ادیب، دانشور علی سردار جعفری یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے۔ عالمی سطح پر ان کے چلے جانے کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ اس سوگ کے پیچھے ان کے بچھڑنے کا غم تو ہے ہی اس سے زیادہ ان کے ساٹھ پینسٹھ سالہ ادبی صحافتی، ثقافتی اور سیاسی خدمات کا یاد کیا جانا اور اعتراف کیا جانا زیادہ ہے۔

سردار جعفری کی شخصیت اور ادب ابتدا سے ہی جتنے مقبول اور مشہور ہیں اتنے ہی بحث طلب اور نزاعی۔ ان کی ہر کتاب، ہر فکر، ہر قدم غرض کہ ہر ادا پسند بھی کی جاتی رہی اور بحث و مباحثے کے نئے نئے دروازے بھی کھولتی رہی اور ساتھ ہی ان کی ہر دلعزیزی اور محبوبیت میں اضافے بھی کرتی رہی۔

عام طور پر یہ خیال ہے کہ سردار جعفری کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن جدید خیال رکھنے والوں کا ایک حلقہ انھیں ایک سرے سے شاعر ہی نہیں مانتا۔ خود ترقی پسند حلقہ میں بھی ان کی شاعری کو لے کر طرح طرح کے خیالات ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سردار کی شاعری انیس، اقبال، جوش وغیرہ کا ایسا ملا جلا آہنگ ہے کہ ان کا اپنا کوئی آہنگ نہیں بن پاتا۔ ترقی پسند فکر و خیال کے کچھ ناقدوں نے بھی سردار کو ایک اچھا اور اہم شاعر ماننے میں تامل برتا ہے لیکن پھر بھی سردار کا شمار چند گنے چنے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں؟

''ایک خواب اور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے یہ لکھا:

> ''سردار جعفری کی شاعری جدید اردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے...... جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اردو کی ترقی پسند خلاّقی اپنی پوری آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔''

سجاد ظہیر نے یہ بھی اعتراف کیا کہ سردار جعفری کی شاعری کا ابتدائی سرا اقبال، جوش کی شاعری سے ملتا ہے جو اس زمانے کی دوسری تیسری دہائی تک نظریاتی اعتبار سے حاوی تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جیسے جیسے بعد زمانے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشتراکی تحریکات اور فکر کا بڑھاوا ہوا اور ہندوستان کی قومی آزادی بھی متاثر ہوئی تو پھر مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانشوروں نے اس تحریک کو بائیں بازو کی طرف موڑ دیا۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں کام سردار جعفری اور ان کی شاعری نے کیا۔

پاکستان کے ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی بھی لکھتے ہیں:

> ''علی سردار جعفری کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ گذشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ میں ترقی پسند خیالات کی حد تک کلیدی کردار ادا کیا ہے.....اس حقیقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ علی سردار جعفری سماجی، سیاسی اور معاشی حقیقتوں کے ردعمل میں کسی نہ کسی انداز میں جمالیاتی پیکر تراشنے میں ماندانہ کردار کرتے رہے۔''

پروفیسر زاہدہ زیدی جو فیض کے بعد راشد اور اختر الایمان کو بڑا تسلیم کرتی ہیں لیکن جب سردار پر قلم اُٹھاتی ہیں تو لکھنے پر مجبور ہوتی ہیں:

> ''وہ ایک خلاق، مفکر اور اور بجل شاعر تھے جن کی شاعری کے کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا اور ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقا پسند ہیں۔ پرولتاریہ کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طے کئے اور ہر منزل پر ان کی فکرِ والہانہ جذبوں سے سرشاری، شدتِ فکر و احساس، وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی کچھ

نمایاں خصوصیات ہیں ......سردار جعفری شاعر ہونے
کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈر شپ کی
صلاحیتیں بھی ان میں خداداد تھیں۔ ساتھ ہی وہ ایک
فعال اور دلکش شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان کو جو
شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے ہم عصروں
میں فیض کے علاوہ کسی کو نہ نصیب ہوئی۔''

زاہدہ زیدی نے وژن کی وسعت، فلسفیانہ تفکر، اسلوب کی بلند آہنگی وغیرہ کو ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت شمار کیا ہے۔ خود سردار جعفری کا جو سرمایۂ شعر و نقد ہے وہ ایک طرف اگر جدید ترین موضوعات سے وابستہ ہے تو دوسری طرف کبیر، میر، غالب، حافظ، رومی وغیرہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف شاعری کی صوفیانہ روایت بالخصوص انیس، اقبال اور جوش اور دوسری طرف آزادی کی تحریک، انقلاب، سماج واد، مزدور کسان اور اس زمانے میں تقریباً پوری ادبی فضا میں غالب مارکسی فکر اور لہر......سردار جعفری کے پورے فکر و نظر اور علم و ہنر اور خاص طور پر ان کی شاعری کو انھیں دوسروں کے درمیان رکھ کر دیکھا جائے تو سردار کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بہر حال آسانی ہو جائے گی اور اس سردار کا سردار حاصل ہوگا جو انتہائی کچی عمر میں گھر کی شیعی تہذیب میں رہ کر منبر پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھنے والا نوجوان اندھی عقیدتوں میں غرق ہونے کے بجائے حضرت حسینؑ کے غیر معمولی کردار سے ظلم کے خلاف بغاوت کا سفر سیکھ کر، جاگیردارانہ نظام کو ٹھوکر مار کر لکھنؤ آتا ہے اور یہاں آکر لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم ہوتے ہی انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اُٹھاتا ہے اور وہ ساری تکلیفیں برداشت کرتا ہے جو اس وقت کے دیوانے باغیوں کا مقدر بنی ہوئی ہے۔ روس کا انقلاب اور بہت سے دوسرے انقلابی اقدامات۔ پابلو نرودا، ناظم حکمت، جواہر لعل نہرو، قاضی نذر الاسلام، وطن کی نامکمل آزادی، خواب درخواب، ایک نئی جنگ کی تیاری، دنیا کی تاریخ، تہذیب، تصوف، انسان دوستی غرض کہ خیالوں کی دنیا میں کروٹیں ہی کروٹیں۔ نئے نئے

چراغ جلتے چلے گئے۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ حافظ، سعدی، رومی، پابلو نرودا، ناظم حکمت، کبیر، نانک، میرا، میر، غالب، اقبال سب کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ دنیا کے انسانوں کے درد کو ایک لے میں ڈھال دیا۔ اردو شاعری ایک نئے تیور اور آہنگ سے آشنا ہوئی۔ عالمی فکر اور انسان دوستی، دردمندی کے نئے نئے دبستان کھلنے لگے۔ ان سب میں سردار جعفری کی شاعری عالمی فکر اور اصل ہندوستانی تہذیب کو سموئے ایک نئے شاعرانہ آہنگ و فکری کردار سے مالا مال ہوتی رہی۔ ہر سطح پر انقلاب لانے میں سردار ہمیشہ پیش پیش رہے اور اسی لیے سب سے زیادہ سردار کی مخالفت بھی ہوئی۔ مخالفت کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ترقی پسند خیال کے ہی مخالف تھے۔ دوسری قسم ایسے لوگوں کی تھی جو دردمندی تو رکھتے تھے لیکن اردو شاعری کو درد دل اور درد جگر سے الگ کر کے دیکھنے کے عادی نہ تھے اور آگے بڑھ کر ان لوگوں نے بھی سردار کی مخالفت کی جو شاعری کو صرف باطنی کیفیات کا پیچیدہ اظہار مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو سردار کی انقلابی شاعری کیوں کر پسند آسکتی تھی۔ اعتراض تو ہوئے ہی، ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر کیے جنھوں نے بقول سردار جعفری "میری شاعری کو سلیقے اور سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں تھا۔"

سچ بات یہ ہے کہ سردار کی بڑی شاعری وہیں جنم لیتی ہے جہاں وہ جوشِ خطابت اور انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد جب پورے ہندوستان میں اُتھل پُتھل تھی، ۴۸ء میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا اور ۴۹ء میں بھارت کا دستور بنا۔ انھیں دنوں تلنگانہ تحریک شروع ہو گئی۔ سیکڑوں جوان مارے گئے۔ عین انھیں دنوں سردار جعفری کا ایک بیحد اہم مجموعہ "خون کی لکیر" چھپ کر آیا جس کا نظم میں لکھا ہوا دیباچہ ہی دامنِ دل کھینچتا ہے۔

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں
میکشوں آتش بہ جام آیا ہوں

حُسنِ معنی ہو رہا ہے بے نقاب
اُٹھ رہے ہیں استعاروں کے حجاب
خون پیانوں میں اب ڈھلتا نہیں
اب امیروں کا فسوں چلتا نہیں
زلزلہ ہے قصرِ استبداد میں
حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک شباب پر تھی۔ زیادہ تر فن کار شاعر جیل میں تھے۔ ایسے ہی میں دو شاعر ایسے تھے جن کا ڈنکا بج رہا تھا، مخدوم اور سردار۔ مخدوم نے لکھا لیکن سردار کا قلم تلوار بنا ہوا تھا۔ ذہن میں آگ تھی اور سینے میں لاوا کھول رہا تھا۔ پورے ادبی ماحول میں نئی نسل کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں سردار کی شخصیت اور شاعری ایک باغی اور انقلابی کی تصویر جھانک رہی تھی اور سردار سب کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ تلنگانہ کے بارے میں ان کی نظم ہر اک کی زبان پر تھی۔ آزادی مل ضرور چکی تھی لیکن کمیونسٹ پارٹی تحریک اس جھوٹی آزادی کے خلاف آواز اُٹھا رہی تھی اور سردار کی نظمیں گونج رہی تھیں۔

کون آزاد ہوا
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی دور ہوئی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے
موت آزاد ہے لاشوں سے گذرنے کے لیے

یہ سچ ہے کہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ بقول جعفری پہلی بار اقبال نے استعمال کیا۔ جوش کی انقلابی شاعری میں گھن گرج ہے اور خلوص وسچائی بھی لیکن کوئی صاف ستھرا نظریہ یا راستہ نہیں۔ ایجیٹیشنل شاعری کا یہ باقاعدہ راستہ مخدوم، فیض اور سردار نے عام کیا۔ سردار ان سب میں دو قدم آگے تھے۔ اس لیے ان پر سب سے زیادہ اعتراض بھی

ہوئے لیکن انھوں نے ہی سب سے زیادہ اس نوع کی شاعری کو فکر و جمال کا حصہ بنایا۔
اپنے ایک مضمون میں ایک جگہ انھوں نے صاف طور پر لکھا:

''ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی طور پر انسانی جذبات پر مبنی ہے جنھیں رس کہا جاتا ہے۔ان رسوں میں غصہ اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ غصہ اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا بُرا، یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔ میں شاعری میں اس کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں....نفرت کا یہ شعلہ مہابھارت، فردوسی کے شاہنامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔''

''خون کی لکیر'' ''پتھر کی دیوار'' ''پیراہن شرر'' وغیرہ کی نظمیں اردو کی عمدہ و معیاری اجتجاجی شاعری کا حصہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان نظموں میں ظلم کے خلاف آوازیں، امیری اور سرمایہ داری کے خلاف تیز دھارا ملے گی جو دھیرے دھیرے ان کی شاعری کی دھارا اور لے بن گئی جس کا الزام سردار پر یہ لگا کہ وہ محبت کی شاعری کر ہی نہیں سکتے، اس لیے کہ عشق و محبت کی شاعری لطیف فنکارانہ اظہار چاہتی ہے جو سردار کے بس کا نہیں۔ الزام لگانے والوں نے سردار کی عشقیہ شاعری بھی نہیں پڑھی اور اس باغیانہ شاعری کے بھی رُخ کو نہ دیکھا نہ سمجھا کہ یہ غم و غصہ، نفرت اور انقلاب سردار کے ذاتی نہیں ہیں بلکہ اس کی بنیاد انسان اور زندگی سے شدید محبت پر ہی رکھی ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ سبک انفرادی خود غرضانہ محبت سے دور، عوامی و اجتماعی محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کا وژن بڑا ہوگا اور عمل میں فلسفیانہ تفکر ہوگا۔ اردو کی غزلیہ شاعری کی سبک روی سے نکل کر یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور کردے گا۔

مری نگاہ میں بسے ہوئے ہیں
ہزار اندازِ دلربائی

میں اپنے سینے کو چاک کر کے
اگر تمھیں اپنا دل دِکھاؤں
تو تم کو ہر زخم کے چمن میں
ہزار سروِ رواں ملیں گے
اداس مغموم وادیوں میں
ہزارہا نغمہ خواں ملیں گے
مرے عزیزو، مرے رفیقو
یہ عہدِ حاضر کی آبرو ہے
حسیں بنانے کی آرزو ہے

اردو شاعری کا روایتی ورومانی مزاج سردار کی اس کاٹ کی آسانی سے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ڈھکے چھپے کہیں وہ اُس نظام کے ساتھ تھا جو اس اُلٹ پلٹ کے لیے تیار نہ تھا۔ ہماری روایتی تنقید کا بھی ایک حصہ اسی سوچ کا تسکار تھا لیکن حق پسند اور بیباک جعفری کو اس بات کی قطعی پروانہ تھی کہ کل کا ادب ان کے فن، ان کی شاعری اور ان کی جمالیات کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔ وہ آج کی حقیقت اور انسانی جمالیات پر یقین رکھتے تھے تبھی تو کہتے ہیں:

''مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ کوئی اور اسے مانے یا نہ مانے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے وبے سُرے ہو جائیں گے۔ آنے والے زمانے کا جو بھی راگ ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی۔ ہم تو آج کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔''

اسی بات کو سارتر نے دوسرے ڈھنگ سے یوں کہا ہے کہ موجود لمحہ اپنے تاریخی مقصد کی ترجمانی ہی ادبی تجربے کا تقاضا ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ آنے والے زمانوں اور

نسلوں کا فیصلہ کریں، ہر دور، ہر نسل اپنا اقتدار خود بناتی ہے۔ سردار نے زندگی، تاریخ و تہذیب پر کھل کر بحثیں کی ہیں اور انقلابی شاعری، خطیبانہ شاعری و افادیت پر عالمانہ باتیں کی ہیں کچھ اس کے بطن سے دوستی۔ روشن خیالی اور بڑی شاعری کی اعلیٰ قدریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ عالمیت سے بھری ایک خاص قسم کی بڑی شاعری کے یہی حصے اور یہی مزاج ہوا کرتا ہے۔ کم سے کم ترقی پسند شاعری اور احتجاجی شاعری کے بنیادی پہلو اور سردار کی بنیادی پہچان تو یہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا انقلابی شاعری یا خطیبانہ شاعری بڑی نہیں ہوتی تو پھر بڑی شاعری کے پیمانے کیا ہوتے ہیں۔ کیا دھیمے لہجے کی رومانی، مبہم شاعری ہی بڑی شاعری ہوتی ہے اگر یہی سچ ہے تو دنیا کی وہ تمام بڑی شاعری جو خطابت سے وابستہ ہے خواہ وہ مولانا روم کی مثنوی ہو یا شیکسپیر کے ڈرامے یا اقبال کی نظم نگاری۔ اسے کس خانے میں رکھیں گے۔ زندگی کی طرح شاعری کے معاملات بھی بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ کینوس پر ایک اچھی تصویر صرف دھیمے اور ٹھنڈے رنگوں کی مانگ نہیں کرتی اسے اکثر شوخ اور روشن رنگوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں جیسی ضرورت ہو۔ سجاد ظہیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میکسیکو کے عوام کی انقلابی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ وہاں کے فنکاروں نے عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بری عوام کے انقلابی مزاج سے شرابور بیحد زوردار اور جوشیلی تصویریں بنانے کا فن پیدا کیا تھا اور آج اسے دنیا میں شہرت حاصل ہے۔ تقریباً اسی طرح ہندوستان کے فنکاروں نے ایودھیا کے حادثہ کے بعد کیا۔

سردار جعفری نے جس غلامی دور میں آنکھیں کھولیں۔ انقلاب کے بیحد قریب سے دیکھا۔ آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ ساتھ زنجیروں اور قید خانوں کو معشوق کی طرح گلے لگایا۔ وہ جس طرح کا رومانی باغیانہ مزاج رکھتے تھے ایسے میں ان سے اسی طرح کی شاعری کی امید کی جاسکتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ سردار کے یہاں دھیمے لہجے کی شاعری نہیں ہے۔ انھوں نے غزلیں کہیں، خواب دیکھے، رومانی حسرت میں ڈوبے، طرح طرح کے تجربے بھی کیے لیکن انسان اور زندگی سے اوپر اُٹھ کر انھوں نے کبھی نہیں سوچا۔ تخیل و تصور کی دنیا میں وہ کم کم ہی رہے۔ انھوں نے زندگی کے کھردرے حقائق، تپش اور تشنہ لبی کو بھی

ایک نام دیا اور وقار دیا۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی مئے کدے بناتی ہے

ان کا اصل میدان نظم کی شاعری ہے۔ زندگی کی شاعری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خواب ٹوٹنا انسان کا مقدر ہے لیکن خواب دیکھنا اس کی فطرت۔ اسی لیے تراشیدم، پرستیدم، شکستم کے قائل تھے۔ ان کی شاعری کی ان اعلیٰ قدروں کو سمجھنا ہوگا۔ جہاں ایسا ممکن نہیں وہاں سردار کو سمجھ پانا بھی ممکن نہیں۔ سردار صرف شاعر نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ قسم کے دانشور اور اسکالر تھے اور اپنی شاعری اور اس سے زیادہ دانشوری کے زور پر پوری ترقی پسند تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ کئی نسلوں کو پروان چڑھایا، وہ ایک ہیرو کی طرح کئی دہائیوں تک چھائے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک لیجنڈ اور ایک تاریخ بن گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب یوں ہی تو نہیں تھا اس کے پس پردہ کئی دہائیوں کا تیاگ اور تپسیا، محنت و لگن، ایثار و قربانی اور ہمہ دانی ان کا منطقی انداز، خطابت کا سوز و گداز الفاظ کے اُبلتے ہوئے چشمے بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔

سردار اپنی زندگی، اپنی فکر کے ہر موڑ پر باعمل، باخبر اور با اثر ہے اور اپنے شعور و ہنر اور ادب دوستی و انسان دوستی کے ذریعہ نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہے۔ کبھی تحقیق، کبھی تنقید، کبھی تحریر کبھی تقریر، کبھی اکیلے کبھی بھیڑ کے ساتھ، کبھی ڈھال بنے کبھی تلوار، کبھی محبت، کبھی تکرار غرض کہ ہر دور میں وہ اپنی تخلیق، اپنی تنقید کے ذریعہ اپنے گروپ میں اپنے دور میں بینادی اور لیڈنگ رول ادا کرتے رہے۔ ایسے سردار جعفری کو جس نے ادب کی سب سے بڑی تحریک کو اپنے خون جگر سے سینچا ہو۔ جس نے شاعری کے کم از کم دس مجموعے دیے ہوں۔ جس نے چند غیر معمولی نثری کتابیں لکھی ہوں۔ جس کی تقریروں نے ہنگامے برپا کر رکھے ہوں۔ جس نے میڈیا، فلم، صحافت، ثقافت، سیاست پر اپنی مہریں ثبت کر رکھی ہوں۔ جس نے جمالیات، نفسیات، تصوف، بھگتی، مارکسواد، سماج واد، گاندھی واد وغیرہ پر دسترس حاصل کر رکھی ہو۔ جس نے حافظ، ذوق، کبیر، نانک، میرا، امیر، انیس، اقبال، جوش

وغیرہ کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہو، اس سردار جعفری کو سمجھ پانا اور سمجھا پانا ایک ناممکن کام نہ سہی لیکن مشکل کام ضرور ہے۔ ایسا اس لیے کہ یہ سب چیزیں ان کی شاعرانہ و دانشورانہ شخصیت میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ ان کو الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

اس سے کون انکار کرے گا کہ خیال کی سطح پر جتنے مورچے سردار نے لیے کوئی اور ہمت نہ کر سکا۔ اقبال کے بعد سردار ہی ہیں جنھوں نے شاعری کو دانشوری اور دانشوری کو شاعری بنا دیا۔ دونوں کو باہم شیر و شکر کر کے ایک نئے طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اور اسے عالمی شاعری کے مقابلے لا کھڑا کیا۔ احتجاجی شاعری یا ایجی ٹیشنل شاعری کی نئی توضیحات پیش کر کے ایک نئے قسم کی شعریت، آہنگ اور وقار عطا کیا۔

صوفی ازم اور مارکسزم دونوں کو بیحد قریب کیا اور شاعری کو ایرانی جمالیات سے نکالنے کا جو کام جوش نے شروع کیا تھا اسے سردار نے انتہائے کمال تک پہنچایا اور ہندوستانی اور انسانی جمالیات کے نئے ابعاد بنائے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اس کی دیرینہ روایات کا نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ کبیر، نانک، میرا وغیرہ پر کام کر کے اردو والوں کو اصل ہندوستانی جمالیات سے اور اسی طرح میر، غالب وغیرہ کو ہندی میں پیش کر کے غیر اردو والوں کو اردو شاعری کے اصل صوفیانہ مزاج سے آشنا کیا۔

علم و عمل کے درمیان کے فاصلے کو کم کیا اور اپنی زندگی کی سرگرمیوں، حرکت و عمل سے یہ ثابت کیا کہ ادیب و شاعر اگر باعمل (Activist) نہ ہو تو اس کی حیثیت بقول مارکس ایک بانجھ عورت سے زیادہ نہیں۔

گفتگو، بحث، اختلاف، تنازعہ، چیلنج وغیرہ زندگی کی کھردری حقیقتوں کو کہ جس سے بڑے بڑے ادیب و شاعر گھبراتے ہیں۔ سردار نے ایک حرف شیریں اور دلنواز تبسم سے زیر کیا اور اسے آسمان تر بنا کر ادب میں اختلاف کو احترام بخشا اور ادبی تبادلۂ خیال کو عام کیا۔

اپنی بات کہنے سے زیادہ انھوں نے دوسروں کی بات سننے کا مزاج عام کیا اور کہا کہ سماجی جمہوریت سے زیادہ بڑی ہوتی ادبی جمہوریت۔ غرض کہ بقول یوسف ناظم ان کی

زنبیل میں ہر قسم کے نسخے تھے اور ہر نسخہ پر ہوالشافی لکھا ہوا تھا۔

اتنے غیر معمولی اوصاف ومحاسن نے جہاں سردار کو بے پناہ شہرت وعزت بخشی۔ فطری طور پر اتنی ہی اس کی حفاظت بھی ہوئی۔ اتنی نزاعی شخصیت اور اتنی مقبولیت وشہرت۔ یہ باتیں حیرت میں ڈالتی تھیں اور ان کی شخصیت معمہ نظر آنے لگتی تھی۔ پھر ان کی مقبولیت کو محبوبیت میں بدلتے دیکھا۔ ایسے ایسے مناظر آنکھوں کے سامنے گذرے ہیں کہ جن پر رشک آنے لگتا۔ اکثر خیال آتا کہ اُسّی برس کا یہ نوجوان بڑے سے بڑے فلمی ہیرو سے زیادہ مقبول ومحبوب ہے۔ ہندوستان کی تمام زبان وادب میں ان کی شہرت وعزت تھی۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی سے انھیں دنیا کا بڑا اسکالر تسلیم کیا جس سے اردو زبان کی شہرت و عزت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

ان کی شاعری سے اختلاف کل بھی تھا اور آج بھی ہوگا لیکن ان کی بڑی ادبی و دانشورانہ شخصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ علم کا اپنا جادو ہوا کرتا ہے۔ وہ جادو تو ان کے پاس تھا ہی، ساتھ ہی ان کی شخصیت کا رچاؤ۔ ان کے لمبے گھنیرے سرمئی بالوں کا غبار۔ تمام دنیا کے حسن کو جذب کر لینے والی آنکھیں۔ ان کی مخروطی انگلیاں، ان کی ہوش ربا مسکراہٹ۔ ان کی گفتگو کا سلجھا ہوا منطقی انداز سب کہ سب ان کے علم ودانش کی گواہی دیتے اور اس کے اظہار کا پُرکشش حصہ بن جاتے۔ ان سب غیر معمولی خوبیوں نے ان کے اظہار وایثار نے سردار کی شخصیت کو ایک تاریخ ساز اور نظریہ ساز بنا دیا تھا جن سے اختلاف کیا جانا فطری تھا، لیکن سردار کی طلسمی من موہنی شخصیت کے جو بھی قریب آتا غیر معمولی تاثر لیے بغیر نہ رہتا۔ سردار کی فنکارانہ اداؤں کے قیدی تو نہ جانے کتنے سلطان اور سلطنتیں تھیں لیکن ان کی علمی اور طلسمی شخصیت کا قیدی تو پورا زمانہ تھا۔

آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی رحلت کا سوگ منایا جانا صرف ایک شخص وشاعر کا سوگ نہیں ہے بلکہ ۸۶ سالہ تاریخ وتہذیب، ادب وشاعری، تنقید وفلسفہ، سیکولرزم، سوشلزم وغیرہ کا سوگ منایا جانا ہے۔ سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ اس طرح کہ وہ صدی کی پہچان اور صدی ان کی پہچان کو حوالہ بن جاتی ہے۔ وہ

پوری صدی پر چھائے رہے۔ سرگرم رہے۔ زندگی کے آخری لمحہ تک فکر مند، سرگرم، متبسم، متکلم، بے پناہ کام، بے پناہ مصروف، بے پناہ سفر لیکن وہ خوش رہتے اور مسکراتے رہتے۔ زبردست اختلافات ہوتے لیکن وہ مسکراتے رہتے۔ اپنے ہی دوستوں سے گلے شکوے لعن طعن ہوتی وہ مسکراتے رہتے۔ اکثر گھریلو قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے وہ مسکراتے رہتے کہ مسکراہٹ ان کی دلنواز شخصیت کا حصہ بن گئی۔ آج سردار ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن تاریخ میں زندہ ہیں۔ جو کام کرتے ہیں وہ تاریخ بن جاتے ہیں۔ دوسری شکلوں میں، دوسری نسلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ سردار نے خود کہا تھا۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

□□□

معین احسن جذبی: ''ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے''

۲۴ر مئی ۲۰۰۰ء کو مجروح سلطانپوری اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اردو شاعری کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ ابھی اردو دنیا مجروح کا غم منا رہی تھی کہ پہلی اگست ۲۰۰۰ء کو علی سردار جعفری کا انتقال ہو گیا۔ اردو شاعری کے ساتھ اردو دانشوری کا بھی ایک عہد ختم ہوا۔ اردو دنیا ان دونوں کے غم میں ڈوب گئی۔ یہ دونوں شخصیتیں یادگار اور لازوال تھیں۔ ان کی موت بھی یادگار اور لازوال ہو گئی۔

''موت وہ ہے کہ کرے جس پہ زمانہ افسوس''

پہلی اگست ۲۰۰۰ء کو سردار جعفری کا انتقال ہوا۔ ۳۔۴ر اگست کو پروفیسر سید محمد عقیل اور یہ خاکسار چند خطبات دینے کی غرض سے علی گڑھ یونیورسٹی پہنچے۔ علی گڑھ سے سردار جعفری کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ رشتہ تو کسی نہ کسی شکل میں مجروح کا بھی تھا۔ رشید احمد صدیقی، جگر اور علی گڑھ اس تثلیث میں مجروح ہمیشہ گرفتار رہے لیکن سردار کا رشتہ کچھ زیادہ ہی عجیب و غریب تھا۔ اس علی گڑھ میں ۱۹۳۶ء میں ایک باغی طالب علم کی حیثیت سے نکالے گئے۔ پھر اسی یونیورسٹی میں ایک دانشور، اسکالر کی حیثیت سے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پورے پچاس سال بعد ۱۹۸۶ء میں انھیں ڈی.لٹ. کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اسی علی گڑھ میں جہاں خطیبانہ و بیانیہ شاعری کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا اسی علی گڑھ میں سردار کی اکہری و خارجی شاعری کی معنویت و مقبولیت کو از سرِ نو سمجھنے کی کوشش کی گئی (ابوالکلام قاسمی کے مضامین)۔ اسی علی گڑھ میں جہاں مجاز و جذبی کا طوطی بولتا تھا وہاں فیض کے بعد علی سردار کو ایک نہایت اہم اور عمدہ شاعر تسلیم کیا گیا (زاہدہ زیدی کی تقریر و تحریر)۔

علی گڑھ کے اسی قیام کے درمیان ہم نے بطور خاص آل احمد سرور اور معین احسن جذبی سے ملاقاتیں کیں۔ تسکینِ قلب کا مطالبہ تھا کہ ان بزرگوں کی آنکھوں میں سردار کو جھانک لیں۔ ان کی زبان سے سردار کے بارے میں کچھ سُن لیں، کچھ جان لیں۔ چنانچہ

ہم لوگ (سید محمد عقیل، اصغر عباس، طارق چھتاری، صغیر افراہیم، سراج اجملی اور راقم) پہلے سرور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سرور صاحب ایک گاڑی کے سہارے چلتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے۔ ہم سب کو پہچان لیا۔ علیک سلیک کے بعد ان کا پہلا جملہ تھا ''جعفری بھی چلے گئے۔'' انھوں نے اس طرح یہ جملہ ادا کیا جیسے وہ شمشاد مارکیٹ تک گئے ہوں۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی پھر اندازہ ہوا کہ عمر کی اس منزل پر موت سے آشنائی کچھ اس طرح سے ہو جاتی ہے جیسے آپ شب و روز کے معمولات سے سرسری گذر جاتے ہیں۔ سرور صاحب ہم سب کی، اردو دنیا کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ ہم سب ان کی باخبری سے حیرت میں تھے۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے یہ شعر سُنایا

سرور اس واسطے سردار سے ہم کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مُجرم ہیں اقبالی

ہم جلدی اُٹھ لیے، اس کے بعد ہمارا قافلہ جذبی صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ وہ باقاعدہ ٹہلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انھوں نے بھی سب کو پہچانا۔ سب کا سلام لیا۔ ہمیں ان کی صحت دیکھ کر خوشی ہوئی اور ان کے ساتھ اکثر شام کی چہل قدمی یاد آئی۔ باوجود اس کے کہ وہ ۸۸ برس کے ہو چکے ہیں اور سردار مجروح سے بڑے ہیں۔ ادھر ادھر کی رسمی گفتگو کے بعد میرا یہ سوال تھا:

''مجروح صاحب رخصت ہوئے اور اب سردار بھی چلے گئے۔ آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے؟''

انھوں نے لمبی سانس لی اور یہ شعر پڑھا۔

یہ وہ ہیں جن سے فروزاں تھے آگہی کے چراغ
یہ وہ ہیں جن سے تھا اک دورِ شاعری کا بھرم

اس کے بعد تھوڑا رک کر یہ شعر بھی پڑھا۔

مجاز و اختر و مخدوم و فیض آہ کہاں
مرے ندیم مرے ہمنوا مرے ہمدم

مگر اس میں سردار کا نام تو نہیں ہے؟ میرا سوال تھا۔
جذبی صاحب تھوڑا رُک کے، تھوڑا سا ہنسے پھر بولے۔

''بھائی معاف کیجئے گا میں سردار کو بڑا شاعر نہیں مانتا، وہ نثر نگار بہت اچھا ہے۔ ہمارے گروپ میں اتنی اچھی نثر لکھنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ تم نثر کے لیے پیدا ہوئے ہو لیکن وہ اپنے آپ کو شاعر منوانے پر مُصر تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ہمارے اس خیال سے واقف نہ تھا۔ وہ فیض سے آگے جانا چاہتا تھا لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ شاعری کرنے سے نہیں ہوتی وہ الہام ہوتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر نثر کے آدمی تھے۔ ترقی پسند ادب ان کی بہت اچھی کتاب ہے۔ ان کے پاس علم تھا، اُسے بولنا آتا تھا۔ اُسے لکھنا آتا تھا۔ نثر کے تعلق سے الفاظ پر زبردست گرفت تھی۔ خیالات ادا کرنے کی غیر معمولی قوت تھی۔ اچھے نثر نگار تھے۔ پڑھے لکھے انسان تھے۔ ہمارے گروپ کے تھے۔ ایک بات ان میں اچھی تھی کہ وہ اپنی مخالفت ہنس کر برداشت کرتے تھے......''

''آج وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''

''ایک دوست تھا کم ہو گیا۔ بیحد افسوس ہے۔ میں تو مجاز کو برداشت کیے ہوئے بیٹھا ہوں۔ فیض و مخدوم چلے گئے۔ ۸۸ برس کا ہو گیا ہوں۔ بہت تنہائی محسوس کر رہا ہوں اور پھر انھوں نے غزل کا مطلع پڑھا

نہ کوئی آہ نہ کوئی خلش نہ درد نہ غم
وہ یاد آئے تو پہروں سکوت کا عالم

انھوں نے پوری غزل نہ صرف سُنائی بلکہ ہمیں عنایت بھی کی، جسے ہم نے بعد میں "نیا سفر" میں شائع بھی کیا۔ یہ ان کی تازہ غزلوں میں سے تھی جو ان کے کسی مجموعہ میں نہ تھی۔

جذبی صاحب کی تنہائی اور مایوسی دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ جذبی فطرتاً تنہائی پسند اور مایوس ذہنیت کی شخصیت کے مالک ہیں۔ ابتداً ملال تخلص تھا جو انھیں راس آتا تھا۔ ۱۹۲۹ء کی ایک مختصر سی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے جب ان کی عمر محض اٹھارہ سال کی تھی۔ یعنی عین عالمِ شباب میں وہ اس نوع کی غزلیں کہہ رہے تھے۔

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں
خاطرِ درد آشنا ہوں میں
ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی
خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

جذبی کا ضبطِ غم واقعی بے سبب نہیں تھا۔

جن لوگوں نے جذبی کی زندگی اور شاعری پر کام کیا ہے، انھیں صاف اندازہ ہے کہ جذبی کا بچپن اور جوانی تکلیف اور پریشانی میں گذرے۔ وہ ابتدا سے ہی مغموم اور سنجیدہ سے رہے۔ دربدری رہی، انتشار رہا اور آزار بھی۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ایسی پریشانی اور بجھی ہوئی شخصیت کی دوستی مجاز سے کس طرح ہوگئی جو مزاجاً جذبی کے عین برعکس تھا۔ ہنسوڑ، بذلہ سنج اور لااُبالی۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ آپ میں جو نہیں ہوتا ہے اور دوسروں میں ہوتا ہے وہ اُسے حسرت و امید سے دیکھتا اور پسند کرتا ہے۔ شاید یہی رشتہ جذبی اور مجاز کا تھا۔ عجیب و غریب ہنسنے والا بھی رونے والا بھی۔ یہ کیفیت میں نے جذبی کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی۔ علی گڑھ کی ابتدائی ملاقاتوں میں جب میں تحقیقی مقالہ برائے ڈی فل لکھ رہا تھا اور علی گڑھ کثرت سے جاتا اور مہینوں قیام رہتا۔ انھیں دنوں میرے احباب شارق ادیب، طارق چھتاری وغیرہ نے میری ملاقاتیں رشید احمد صدیقی، معین احسن جذبی، مختار الدین احمد آرزو، اسلوب احمد انصاری جیسے اکابرینِ ادب اور بزرگ ترین نابغۂ روزگار سے کرائیں اور پھر یہ سلسلے دراز ہوتے گئے۔ نہ جانے کتنی شامیں میں نے جذبی صاحب کے

ساتھ ٹہلتے ہوئے گذاریں کہ ان دنوں علی گڑھ کی سکوں پر درویران سڑکوں پر چہل قدمی کرنا اچھا لگتا تھا اور جذبی چہل قدمی کے بیحد شوقین تھے۔ بشرطیکہ کوئی ان کے ساتھ ہو۔ میرے جیسا طالب علم ہی سہی۔ اکثر ہم جاوید کمال کے ہوٹل جاکر چائے پیتے، جہاں اکثر وحید اختر، شہریار، قاضی عبدالستار وغیرہ بھی ہوتے۔ لیکن الگ الگ جیسے شاعری اور فکشن الگ الگ ہوا کرتے ہیں۔ جذبی ان سب سے الگ۔ خلیل الرحمن اعظمی کی صحت خراب ہو چلی ہے، اس لیے کم دکھائی دیتے۔ صحت تو ان دنوں شعبۂ اردو کی بھی خراب تھی اور کئی لوگ بیمار بھی تھے۔ صحت اگر کسی کی اچھی تھی تو وہ تھے خورشید الاسلام۔ ان کی ایک شاخ نہال غم تھی جو سب کو غمزدہ کیے رہتی اور سرور کا تو پورا چمن ہی جل رہا تھا۔ بہرحال ان سب سے بے نیاز بے فکر جذبی کی دنیا الگ تھلگ تھی۔ وہ شعبۂ اردو کا ذکر نہ کرتے جہاں انھوں نے دہائیاں گذاری تھیں۔ شاید اس لیے کہ شعبۂ اردو یا آل احمد سرور نے ان کے ساتھ کچھ اچھے سلوک نہ کیے تھے۔ ان کی زبان پر تو بس مجاز کا ذکر ہوتا صرف مجاز کا۔

مجاز کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی پر وہ رشک کرتے کہ جذبی کی شخصیت میں یہ عناصر کم کم تھے وہ اس کے برعکس کم سخن۔ سنجیدہ اور رنجیدہ سے انسان تھے۔ مجاز میں آوارگی تھی، جذبی میں صرف چہل قدمی۔ مجاز میں تبسم تھا، جذبی میں تکلم۔ مجاز میں انتشار تھا، جذبی میں اضطرار۔ ان سب کے باوجود مجاز اور جذبی میں دوستی تھی اور یہ دوستی اس وقت سے تھی جب یہ دونوں سینٹ جانس کالج، آگرہ میں طالب علم تھے۔ شاعری کی ابتدا کر چکے تھے۔ آگرہ میں فانی بدایونی اور میکش اکبرآبادی سے ملتے اور اصلاح لیتے۔ اس زمانے میں جذبی کا تخلص 'ملال' تھا اور مجاز کا 'شہید'۔ جذبی تو اس سے قبل حامد شاہجہاں پوری اور صوفی شاعر حضرت صادق دہلوی سے بھی اصلاح لے چکے تھے۔ غزلوں میں ابتدا سے ہی کلاسیکی مزاج ملتا ہے اور بقول کمال احمد صدیقی:

> "جذبی کی شاعری میں ایک ہلکی سی قنوطیت کی لہر شاید فانی کا اثر ہے۔"

مجاز نے فانی کا کوئی اثر نہیں لیا، بلکہ خود فانی نے ہی مجاز سے کہا:

''تم مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو۔ تمھارا رنگ نشاطیہ ہے اور
میرا حزنیہ۔ میرا حزن تمھارے نشاط کو کھا جائے گا۔''

اس کے برعکس جذبی فانی سے متاثر رہے کہ غمزدگی اور افسردگی دونوں میں مشترک تھی او شاید جذبی فطرتاً فانی کی راہ پر چلے گئے ہوتے اگر وہ علی گڑھ نہ آجاتے جہاں کے اشتراکی ماحول نے ایک نئے جذبی اور ترقی پسند شاعر جذبی کو جنم دیا۔ ۱۹۸۰ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب مجھے پہلی ملازمت سینٹ جانس کالج آگرہ میں ملی تو شعبہ کو مضبوط و متحرک کرنے کے لیے میں نے ایک سمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ سمینار میں آل احمد سرور او مشاعرے میں جذبی، تاباں وغیرہ کو مدعو کیا کہ یہ سب کہ سب اسی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ سرور صاحب تو اپنی مصروفیت یا علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے لیکن جذبی، تاباں، وامق، کیفی، اجمل اجملی وغیرہ مشاعرے میں شرکت کرنے آگرہ آئے۔ جذبی صاحب تو دن میں ہی آگئے۔ میں اپنے ہوسٹل کے کمرے میں تھا کہ کسی طالب علم نے آکر اطلاع دی کہ علی گڑھ سے جذبی صاحب آگئے ہیں۔ گیٹ پر ہی کھڑے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں گیٹ کی طرف لپکا۔ جذبی صاحب شیروانی پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے کالج کے در و دیوار اور شاندار عمارت کو یادوں سے بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر ماضی کا ایک خوشگوار سا کرب جھلک رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا، ان کا بیگ لیا اور قیام گاہ کی طرف چلنے کی گذارش کی۔ فرمایا ''نہیں، پہلے مجھے اس کمرے کی طرف لے چلو جہاں ہم اور مجاز ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ ''ہیلی بری ہاؤس، کمرہ نمبر۔۶'' میں حیران کہ تقریباً پچاس سال کی لمبی مدت گذر جانے کے بعد ان کو ہاسٹل کا نام اور کمرہ نمبر تک یاد ہے۔ ہمیں تو کل کی بات یاد نہیں رہتی۔ خواہش کے مطابق ہم رفتہ رفتہ اس ہاسٹل پھر اس کمرہ کی طرف چل پڑے۔ جذبی صاحب کا ایک ایک قدم دہائیوں کی مدت اور یادوں کی حرارت کو سمیٹے ہوئے تھا۔ پھر چھڑی اٹھا کر اشارہ کیا۔ ''اُس طرف.........دیکھو دیکھو یہ کمرہ.........!''

اتفاق سے وہ کمرہ خالی تھا اور گرد آلود لیکن وہ بے جھجک دروازے کا پٹ کھولتے ہوئے چھڑی سے جالوں کو چیرتے ہوئے اندر تک چلے گئے۔

''یہ۔ یہ۔ یہی کمرہ تھا۔ دیکھو یہاں میری میز تھی۔ میرا بستر اس طرف تھا اور مجاز کا اُس طرف۔ حالانکہ اس کو کوئی اور کمرہ الاٹ ہوا تھا، لیکن وہ اکثر میرے ساتھ میرے کمرے میں رہتا۔ یہیں سوتا تھا۔ ہم دونوں نے اسی کمرے میں کتنی شامیں کتنی راتیں گذاری ہیں۔ ہم لوگ......ہم......!''

اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں مجازی جگنو چمک اُٹھے اور وہ یادِ غم اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں ڈوب گئیں، بلکہ چھلک گئیں۔ پھر وہ ہنسنے لگے۔

''کم بخت اسی عمر میں وہ شراب اور شباب کا عادی ہو گیا تھا۔ گئی رات تک آتا کبھی نہیں بھی آتا۔ ایک بار کسی نے کہہ دیا کہ گوریا کا بھیجا لا کر دو تمھاری محبت کا یقین ہوگا اور محبوب سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ رات رات بھر غُلیل لیے بھاگا بھاگا پھرتا۔ عجیب شخص تھا۔ بھولا، معصوم اور جذباتی۔ یہی چیزیں اسے کھا گئیں۔ شراب اسے پی گئی۔''

اور وہ پھر رونے لگے۔ دیر تک حسرت بھری نگاہوں سے کمرے کو، گرد و پیش کو، کالج کے درو دیوار کو دیکھتے رہے۔ یادوں میں ڈوبے رہے۔ پھر انھوں نے جذبات پر قابو پایا کہنے لگے۔

''میں حضرت میکش سے بھی ملنا چاہتا ہوں اور تاج گنج بھی جانا چاہتا ہوں جہاں نظیر اکبر آبادی کا مزار ہے۔''

''ضرور ضرور۔ لیکن کیا اسی وقت ضروری ہے۔ اس وقت آپ آرام کیجیے۔ رات مشاعرہ ہے۔ کل صبح ناشتہ کے بعد ہم آپ کو لے چلیں گے۔''

وہ مان گئے۔ رات مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا اور اسے خوب ہونا ہی تھا۔ جس مشاعرے میں جذبی، کیفی، وامق، تاباں وغیرہ ہوں وہاں تو اصل اور اور یجنل مشاعرہ ہونا ہی تھا۔ آگرہ

ایک رات کے لیے اکبر آباد ہو گیا۔ صبح میں جذبی صاحب کو حضرت میکش اکبر آبادی کے آستانہ پر لے گیا۔ میکش صاحب تو اپنے آپ میں ایک داستان اور دبستان تھے۔ تصوف کی آن بان۔ خاکساری اور فقیری کی شان۔ چنانچہ جذبی صاحب کی حاضری پر وہ اُلٹا جھکے جاتے تھے اور جذبی صاحب ان سے زیادہ مہذب اور موڈب۔ کیا منظر تھا۔ کیا دور تھا اور کیا تہذیب تھی۔ اسی آستانہ پر جوش و جگر، فانی، مانی، سیماب اخضر وغیرہ سبھی آتے کہ یہ سب کے سب میکش صاحب سے عقیدت رکھتے تھے۔ جب کہ بعض شعراء میکش صاحب سے عمر میں بڑے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ان دنوں آگرہ ''قصر الادب'' تھا۔

جذبی صاحب نے نظیر اکبر آبادی کے مزار پر حاضری دی، ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ استاذی پروفیسر سید محمد عقیل، ڈاکٹر اجمل اجملی، تصور حسین زیدی، میکش صاحب کے بیٹے منظم علی شاہ اور بعض دیگر احباب بھی۔ اس کے بعد جذبی صاحب علی گڑھ واپس چلے گئے اور میں ان کے اور قریب آ گیا۔ میں تقریباً ہر ہفتہ آگرہ سے علی گڑھ آ جاتا۔ سنیچر، اتوار علی گڑھ کے دوستوں اور بزرگوں میں گذارتا۔ جذبی سے برابر ملاقاتیں رہتیں۔ کیا کیا باتیں ہوئیں جواب ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن یہ احساس ضرور ہے کہ وہ مجھے ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کا ایک ممبر اور خورد ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے لینے لگے تھے۔

تین سال کے بعد میرا تقرر الہ آباد یونیورسٹی میں ہو گیا (۱۹۸۳ء) اور میں آگرہ سے الہ آباد آ گیا۔ اب جذبی صاحب سے خط و کتابت ہونے لگی۔ مجھے خطوط نویسی کا شوق بھی تھا اور خط لکھنا ان دنوں ایسا ہی مشغلہ تھا جیسے آج موبائل رکھنا۔ لیکن دونوں کی تہذیب میں فرق ہے۔ خط نویسی سے یہ تو ہوا کہ آج میرے پاس جذبی کے متعدد قیمتی خطوط ہیں اور دیگر اکابرین کے بھی کہ ان خطوں میں دُعائیں ہیں، خوشیاں ہیں اور بہت ساری بے چینیاں بھی کہ خط میں شاعر و فنکار اکثر اوریجنل ہوتا ہے اور اپنے دل کی بات لکھتا ہے۔ نہاں خانوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ غالب کے خطوط اور بعض دیگر بڑے فنکاروں کے خطوط کی تاریخی و ادبی اہمیت یوں ہی تو نہیں ہے۔ دو ایک جذبی کے خط ملاحظہ کیجیے۔

میں نے الہ آباد میں سجاد ظہیر کی یاد میں ایک تقریب کا اہتمام کیا، جذبی صاحب

کو بھی مدعو کیا۔ ان کا جواب آیا۔

فاطمی صاحب!

خط ملا۔ میں ادھر کافی دنوں سے علیل تھا۔ اب بہتر ہوں، لیکن کمزوری اتنی بڑھ گئی ہے کہ گھر سے نکلنے کی بھی ہمت نہیں رہی ہے۔ کئی سال سے کہیں نہیں گیا۔ یہاں تک کہ دِلّی کا سفر بھی اک عذاب معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں الہ آباد کا سفر اور پھر سیمنار اور مشاعرے کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے بادلِ خواستہ معذرت ہی کرنا پڑتی ہے۔

آپ کی ذات سے امید ہے کہ سجاد ظہیر پر جو سیمنار ہو رہا ہے وہ ان کی شان کے شایاں ہوگا۔ وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت انسان وہ اک عظیم ہستی تھے۔ ان سے کوئی لاکھ اختلاف کرے، لیکن ان کی دلآویز شخصیت ہر کس و ناکس کو متاثر کرتی تھی۔ اب ایسے لوگ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

اور کیا عرض کروں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ عقیل صاحب سے میرا سلام کہیے۔

آپ کا

جذبی

۱۶ر اکتوبر ۱۹۹۲ء

دیکھیے اس خط میں سجاد ظہیر سے متعلق ان کے خیالات و تاثرات۔ یہی نہیں اپنے خورد سے بھی گفتگو کا لہجہ۔ یہ بڑے لوگ ہی کرتے ہیں۔ کچھ ماہ کے بعد میں نے الہ آباد میں ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ اس میں بھی مدعو کیا لیکن پھر معذرت اور خط لکھا۔

برادرم!

ابھی چند دن ہوئے آپ کی طرف سے مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ آج خط بھی ملا۔

اس دعوت نامہ کا بہت بہت شکریہ، لیکن شاید آپ جانتے ہیں کہ پہلے بھی مشاعرہ میرے لیے مارے باندھے کا سودا ہوتا تھا اور اب جب کہ ۸۰ سال پورے کر چکا ہوں اور صحت قریب قریب جواب دے چکی ہے تو مشاعرہ بازی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا چنانچہ اندورنِ ملک یا بیرونِ ملک سے جو بھی دعوت نامے آئے میرا جواب صرف معذرت تھا۔ سودا کا قطعہ یاد آرہا ہے۔

سودا پیئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آن کو کب تک
حاصل یہی اس سے کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اردو میں ترقی پسندی یقیناً سجاد ظہیر کی دین ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ کمیونسٹ تھے۔ ۱۹۴۴ء میں کوئی مہینہ بھر بمبئی میں رہا۔ چوپاٹی کی بنچ پر بیٹھ کر ان سے گھنٹوں بحث ہوتی رہتی تھی۔ جب تھک جاتے تو کہیں پاس کے ریستوران میں جا کر ایک پیالی چائے پیتے اور پھر آ کر اسی بنچ پر گھٹ جاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ادب کمیونسٹ پارٹی کی لائن کے مطابق ہونا چاہیے تا کہ پارٹی کے کام آسکے۔ چنانچہ اچھا ادب ہو یا پروپگنڈا ادب دونوں کی حیثیت ان کے نزدیک ایک سی تھی۔ مجھے اس سے اختلاف تھا۔ اکثر یہ کہتے کہ تمھارا دماغ خواجہ منظور نے خراب کر دیا ہے (خواجہ منظور حسین، پروفیسر شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)۔ خواجہ منظور سجاد ظہیر کے قریبی دوستوں میں تھے۔ صحیح معنوں میں عالم، سرور، اسلوب احمد انصاری اب ان کے شاگرد ہیں۔ افسوس کہ ان لوگوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔

آپ کا

جذبی

سجاد ظہیر سے متعلق جذبی کے ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ضرور تھے لیکن انھوں نے شعر و ادب کی تخلیق کے لیے پارٹی کے اصولوں کو لازمی قرار نہیں دیا۔ (کم از کم میری نظر سے کوئی تحریر ایسی نہیں گذری۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو اتنی بڑی تحریک میں غیر کمیونسٹ اتنی بڑی تعداد میں ہرگز نہ ہوتی) بہرحال جذبی صاحب کی رائے ہے اور وہ رائے دینے میں کسی بھی رو رعایت کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ یہ

ان کی معصومیت وشرافت تھی اور حق گوئی بھی۔

ایک اور خط میں انھوں نے ایک تازہ غزل لکھی اور رائے بھی مانگی۔

غزل کا مطلع یوں ہے۔

ہم ایک خواب لیے ماہ و سال سے گذرے
ہزاروں رنج ہزاروں ملال سے گذرے

اور مقطع ہے۔

گلے لگاتی ہے منزل انھیں بھی اے جذبی
قدم قدم پہ جو خوفِ مآل سے گذرے

غزل کے ساتھ یہ جملہ:

''ادھر بیٹھے بیٹھے کچھ شعر ہو گئے۔ معلوم نہیں کیسے ہیں۔
کہئے تو سناؤں تو لیکن بتانا پڑے گا کہ ان میں کچھ جان
ہے کہ نہیں.....''

ملاحظہ کیجئے ایک طالب علم اور کم علم کو ایک بزرگ پختہ شاعر یہ درجہ دے رہا ہے۔ یہ تمام بزرگ ترقی پسندوں کا شیوہ رہا ہے۔ ذاتی طور پر میرا تجربہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں وغیرہ کی قربتوں سے وصحبتوں سے ہوا کہ یہ سب کہ سب اپنے خوردوں کو برابر کا درجہ دیتے ہیں۔ تنظیم وتحریک کے کچھ ادب وآداب ہوا کرتے ہیں۔ اس آداب سے سب سے زیادہ واقف تھے سجاد ظہیر۔ جذبی کی یہ غزل اس وقت نئی تھی جوان کے کسی مجموعہ میں شامل نہ تھی۔ اب ان کے کلیات میں شامل ہے۔ خطوط اور بھی ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے نظر انداز کر رہا ہوں۔ بس دو ایک جملہ پر اکتفا کروں گا۔ ایک خط میں مجاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''یہ حقیقت ہے کوئی مانے یا نہ مانے مجاز نے ترقی پسند
شاعری کی بنیاد رکھی۔ ہاں یہ تاریخی حقیقت ہے۔''

ایک جملہ اور دیکھئے:

''کاش ہماری سوسائٹی شاعرانہ فطرت کو سمجھے اور
شاعروں سے وہی کام لے جس کی صلاحیت فطرت نے
انھیں عطا کی ہے۔''

اور یہ خیال ملاحظہ کیجیے:

''ہم سب ترقی پسند شاعر ایک طرف ہو جائیں تو بھی
جوش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

کم و بیش یہی احترام اقبال اور انیس کے سلسلے میں بھی ملتا ہے اور حالی کے بارے میں بھی۔
''فروزاں'' کے مقدمہ یا بعض نہ جانے کن تحریروں سے کچھ لوگ یہ اندازہ
لگانے لگتے ہیں کہ جذبی ان معنوں میں ترقی پسند نہ تھے جیسے کہ مجاز، فیض، مخدوم وغیرہ۔ یہ
سچ ہے کہ وہ فیض، مخدوم تو نہ تھے اور ترقی پسندی سے ان کا رشتہ متوازن تھا اور مدلل تھا۔
بعض احباب ان کا یہ جملہ:

''میں ہنگامی ادب کا کچھ زیادہ قائل نہیں۔ یہ کیسے ممکن
ہے کہ ادھر واقعہ ہوا ادھر نظم ہوگئی۔''

(مقدمہ فروزاں)

اور دیگر جملے گرفت میں لے لیتے ہیں، لیکن یہ جملہ نہیں دیکھتے جب وہ یہ کہتے ہیں:

''شعر و ادب کے لیے ایک مربوط نظامِ فکر کی ضرورت
ہے۔ ایسا نظامِ فکر جو عقیدہ بلکہ ایمان بن چکا ہو۔''

ایسی کئی تحریریں جذبی کی ملتی ہیں جہاں خواہ مارکسی فکر نہ ہو لیکن ترقی پسند فکر بہر حال موجود
ہے اور ترقی پسند ہونے کے لیے مارکسی ہونا ضروری بھی نہیں۔ جذبی کی غزلوں میں یہ
متوازن ترقی پسند فکر ہر موڑ پر ہر عہد میں موجود ہے۔ نظموں میں بطور خاص ان کا شعر کس
قدر مقبول ہوا۔

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اس وقت یہ شبنم موتی ہے

اور یہ شعر۔

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

ہر شاعر کا اپنا ایک تخلیقی عمل ہوا کرتا ہے۔ جذبی کا بھی تھا۔ ان کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا۔ پورے اطمینان کے ساتھ شعر کہتے۔ مجاز نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جذبی ایک غزل اور کبھی ایک شعر ایک مصرعہ کہنے میں دنوں اور مہینوں صرف کر دیا کرتے تھے۔ خود جذبی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''کم گوئی میری طبیعت کا خاصہ ہے، لیکن ادھر میری کم گوئی کی ایک وجہ اور تھی۔ صحت کی خرابی سے قطع نظر ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات نے ایک عجیب سی اُلجھن پیدا کر دی تھی۔''

دیکھئے بدلتے ہوئے ماحول اور نظریات پر جذبی کی س قدر نظر تھی اور ساتھ ہی بے چینی بھی کہ یہ بے چینی ہی شاعر و دانشور کی اساس ہوا کرتی ہے۔ جذبی میں کچھ اضطراری کیفیت تو ابتدا سے ہی تھی دونوں نے مل کر شاعر جذبی کو حُزن و ملال کی اس منزل پر پہنچا دیا تھا جہاں سے تخلیق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ان کے اس رنگ کو کچھ لوگ دیکھ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ جذبی اصلاً فانی، میکش اسکول کے شاعر تھے۔ غزل کے شاعر تھے۔ غم کے شاعر تھے۔ ترقی پسند تو وہ زبردستی بنا دیے گئے۔ اوّل تو یہ کہ شاعری میں کوئی کسی کو بناتا نہیں۔ پھر جذبی جیسے خوددار اور عزّت نفس کے شاعر کو۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کا کوئی ایسا نامور شاعر نہ تھا جو کلاسیکی و قدیمی مزاج و مذاق نہ رکھتا ہو۔ سردار، مخدوم جیسے غالی مزاج کے ترقی پسند شاعر بھی میر، غالب، اقبال، انیس تو کیا رومی حافظ کی شاعری پر نظر رکھتے تھے۔ سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' اس کی دلیل ہے جہاں وہ میرا کبیر کو بھی اپنی وراثت اور روایت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ سردار کے دیگر مضامین، احتشام حسین کے مقالات قدیم وراثت کی پاسداری اور روایت کا احترام کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، لیکن انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور اس وقت کہی ہیں جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی۔ ''گل''۔ ''مطربہ''۔ ''ہلالِ عید''۔ ''ایک دوست سے'' وغیرہ ۳۲ء سے ۳۵ء کے درمیان کی نظمیں ہیں۔ ''فطرت ایک مفلس کی نظر میں'' تو ان کی وہ شاہکار نظم ہے جسے چند عمدہ ترقی پسند نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ جب تک جذبی آگرہ اور دوسرے شہروں میں رہے تو روایتی غزل کے شاعر رہے لیکن جب وہ آگرے سے علی گڑھ پہنچے تو علی گڑھ کا ماحول بقول آل احمد سرور:

> ''اس وقت علی گڑھ میں نئے خیالات کی رو شروع ہوئی تھی۔ اختر رائے پوری نے اپنا مضمون ''ادب اور زندگی'' اسی زمانہ میں لکھا تھا۔ ''انگارے'' شائع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔''

سردار جعفری نے بھی ایک جگہ لکھا:

> ''یہ ۳۳ء۔۳۴ء کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک عام سی بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی اور فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔''

جذبی ہزار سوشلسٹ نہ ہوں لیکن ایک سچے درد مند اور حساس شاعر تو تھے ہی۔ علی گڑھ کے اس ماحول کا اثر پڑنا فطری تھا۔ جیسے مجاز پر پڑا، دیگر فنکاروں پر پڑا۔ یہ ایک فطری عمل ہوا کرتا ہے اور ساتھ ہی فکری بھی کہ ایک فنکار کی زندگی میں فکر و نظر کے مختلف پڑاؤ آیا کرتے ہیں جس سے ذہن بدلتا ہے۔ فکر بدلتی ہے۔ لیکن فطری سرشت کہیں نہ کہیں باطن میں پوشیدہ رہتی ہے اور انفرادی طور پر کام کرتی رہتی ہے۔ جذبی میں بھی تھی۔ اسی لیے ان کی سنجیدگی، بالیدگی اور کم سخنی انھیں ہنگامی یا لمحاتی ادب کے قریب نہ لا سکی۔ انھوں نے کئی بار کہا:

> ''میں ہنگامی ادب کا کچھ زیادہ قائل نہیں۔ تجربہ تخلیق کی منزل تک پہنچنے کے لیے صرف تحلیل تجربہ کے مراحل ہی سے نہیں

گذرتا بلکہ شاعر کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔"

کتنی سچی بات لکھی ہے اس لیے کہ عمدہ اور اور یجنل شاعری مکمل صداقت چاہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی حقیقت تحلیل ہو کر مکمل صداقت کا حصہ بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو چشمِ تصور اور تخلیقی بصیرت ایک نئی صداقت کو بھی تلاش کر لیتی ہے اگر شاعر کا مشاہدہ و مطالعہ مستحکم ہو، دور بین ہو، حیات شناس ہو۔ یہ عناصر جذبی میں تھے۔ لیکن یہ بھی تھا کہ جذبی میں حیات شناسی تو تھی لیکن دنیاداری نہ تھی۔ شو بازی تو بالکل نہ تھی کہ ذاتی حالات اور فانی و میکش کے ساتھ گذارے ہوئے صوفیانہ نوعیت کے لمحات نے جذبی کو بھی تنہائی پسند اور گوشہ نشین بنا دیا تھا جس کا انھیں بظاہر کچھ نقصان بھی پہنچا۔ اس سے نہ صرف علی گڑھ دور ہوا بلکہ دنیا بھی دور ہوئی اور وہ بھی دنیا سے دور ہوتے گئے اور پھر ایک مخصوص لمحۂ کرب میں اسی دوری احساس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا۔

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

جذبی کے چاہنے ماننے والے اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ جذبی کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ ان کو وہ مقام نہیں ملا جس کے کہ وہ حقدار تھے۔ ان سب کی شکایت اپنی جگہ درست ہو سکتی ہے لیکن میں ایسی شکایتوں کے بارے میں اکثر سوچتا ہوں کہ ادب میں مقام دینے اور نہ دینے کے معاملات کس طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ کون مقام دیتا ہے، کون انصاف کرتا ہے اور نہیں کرتا ہے اور یہ سب کیسے ہوتا ہے، اسے سمجھ پانا مشکل ہے۔ کتنے معمولی شعراء ایسے ہیں جنھیں نقادوں نے بڑا بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہ پائے اور عمدہ شاعر نظر انداز ہونے کے باوجود وقت کا سینہ چیر کر اپنا مقام بنا لیتا ہے۔ بہر حال یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم اکثر وقت اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جذبی کے تعلق سے میں بھی اس شکایت میں شامل ہو تو جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ ادبی دنیا نے، تنقید نے اگر جذبی کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو خود جذبی بھی اپنے ساتھ مسلسل ناانصافی کرتے رہے۔ ان کی ضرورت سے زیادہ گوشہ نشینی، کم آمیزی، ناراضگی

بھی آڑے آتی رہی۔ جتنی لمبی عمر انھوں نے پائی ان کا تخلیقی سفر بھی خاصا طویل تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے محض دو پتلے پتلے مجموعے "فروزاں"۔ "سخن مختصر" شائع ہوئے۔ عرصہ کے بعد تیسرا "گدازِ شب" آیا تو اس میں چند غزلیں نئی تھیں، باقی سب پرانا تھا۔ اتنے کم مقدار کا سرمایۂ سخن اگر زندہ رہا تو معیارِ سخن اس کی اوّلین وجہ تو رہی لیکن تحریک و تنظیم اور اس کی اجتماعیت نے ان کی انفرادیت کو بچائے رکھا اور اس کو مناسب مقام درجہ بھی دیا۔ اس لیے یہ بات حلق سے نہیں اترتی کہ جذبی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ جذبی کا اپنا ایک مقام ہے، ایک حیثیت ہے۔ اردو شاعری بالخصوص ترقی پسند غزلیہ شاعری کی کوئی فہرست، کوئی ذکر جذبی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند شاعری میں ان کا نام زندۂ جاوید ہے۔ وہ فیض، جذبی، مجروح کی تثلیث کا ناگزیر حصہ ہیں اور رہیں گے۔

یقین ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اس سجیلے شاعر اور علی گڑھ کے اس نامور فرزند کے صدی سال پر انھیں از سرِ نو دریافت کیا جائے گا اور جذبی شناسی کی نئی راہیں ہموار ہوں گی۔ حالی جذبی کے پسندیدہ شاعروں میں سے تھے۔ انھیں کے ایک شعر پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں جو جذبی پر بھی صادق آتا ہے۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو پالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

❑❑❑

تاباں جبیں پہ کج ہی رہا بانکپن کے ساتھ

کچھ یاد نہیں کہ پہلی بار یہ صغیر اُس کبیر سے کب ملا؟

یہ بھی یاد نہیں کہ اس ہیچ مداں کا اس نیرِ تاباں سے تعارف کب ہوا؟

شاید اجمل اجملی کے مکان پر یا ان کے آس پاس اور ساتھ ساتھ ترقی پسندی کی کسی راہ پر، فکر و خیال کے کسی موڑ پر۔

میں ایم۔اے۔ (۱۹۷۴ء) کر کے تازہ تازہ ریسرچ میں داخل ہوا تھا۔ دہلی آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں دہلی میں ہمارا قیام اجمل بھائی کے گھر (اوکھلا) پر ہوا کرتا تھا۔ بالکل بڑے بھائی جیسا گھر تھا کہ برسوں سے دہلی میں رہتے ہوئے بھی اجمل بھائی سے الہ آباد الگ نہ ہوا تھا اور الہ آباد والے بھی الگ نہ ہوئے تھے۔ شاید انھیں کے گھر پر یا اسی کے آس پاس پہلی بار تاباں صاحب کو دیکھا۔ بس دیکھا، تعارف تو کیا ہوتا کہ اس وقت تک میں تعارف کے لائق بھی نہ تھا اور ان کے پاس تو تعارف ہی تعارف تھا۔ پہلے دیدار میں ان کی لمبی چوڑی گوری چٹی شخصیت نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ سفید براق کرتا پائجامہ، سفید چمکتے ہوئے سر کے بال، پکّا گورا رنگ، سب کچھ سفید چاندی کی طرح۔ کچھ بھی سیاہ نہیں سوائے آنکھوں کے چشمہ کے کہ گورے وجیہ چہرے پر کالا چشمہ دو سیاہ ہیروں کی طرح لگتا اور اس کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی دو شاعرانہ اور دانشورانہ آنکھیں اور ان میں پھوٹتا ہوا سیاہ نور ان کی سفید شخصیت پر مزید چار چاند لگا دیتا۔ وہ صبح ہوا خوری اور چہل قدمی کے عادی تھے۔ ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی جوان کے لمبے قد کو دیکھتے ہوئے مذاق سی اُڑاتی ہوئی لگتی تھی۔ پیروں میں موٹے والے کینوس کے جوتے۔ کبھی کبھی ٹی شرٹ اور پتلون بھی، بالکل ایسا جیسے کوئی انگریز مغرب سے بیزار ہو کر مشرق میں آ گیا ہو۔

انھیں دنوں تاباں صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں تو تعارف بھی ہو گیا اور جب انھوں نے یہ جان لیا کہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں داخل ہو چکا ہوں اور الہ آباد شاخ

کا سکریٹری ہو گیا ہوں تو ان کی شخصیت نے نظریاتی کروٹ لی جو شفقت میں بدل گئی اور رفتہ رفتہ اجنبیت اُنسیت میں بدلنے لگی اور تاباں صاحب کے الفاظ فاطمی صاحب سے فاطمی اور دیکھو فاطمی، سنو فاطمی میں تبدیل ہونے لگے۔ ان کے نپے تلے الفاظ اور سنبھلے ہوئے لہجہ اور اعتماد میں غیر معمولی سوز و گداز تھا۔ کیسا مزہ تھا اس شفقت میں، اس اپنائیت میں۔ صاف لگنے لگا کہ تنظیم تحریک اور تفکیر کے بھی مضبوط رشتے ہوا کرتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اسی ڈور نے ہمیں باندھ لیا تھا سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری وغیرہ نے بھی۔ بے پناہ شفقت، خوردنوازی اور ہمت افزائی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان میں ہمارے اساتذہ (احتشام حسین، سید محمد عقیل، محمد حسن، قمر رئیس، اجمل اجملی) کے علاوہ ان بڑے شعراء کا غیر معمولی ہاتھ ہے۔ میرے پاس ان کی شفقتوں، محبتوں اور تحریروں کا ایک خزانہ ہے کہ یہ سب کہ سب تحریک و تنظیم سے وابستہ تھے۔ اس کے فکر و عمل کا ہنر بھی جانتے تھے کہ جو لوگ انسانیت و اجتماعیت پر یقین رکھتے ہیں ان کی تہذیب و تفکیر مختلف ہوا کرتی ہے۔ جو انفرادیت میں جیتے ہیں ان کے یہاں ''میں'' کا میم کچھ زیادہ ہی بڑا ہو جاتا ہے۔

تاباں صاحب تحریک سے وابستہ تھے اور اجتماعیت پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ سچ پوچھئے تو انھیں یہ فکری تہذیب ملی ہی تحریک سے، ورنہ وہ جس خاندان کے تھے اور جس نوع کے پٹھان تھے وہاں ایسی حلاوتوں و گھلاوٹوں کا دخل کم سے کم تھا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ تاباں صاحب جب محض غلام ربانی تھے تب بھی اپنے خاندان اور افراد سے قدرے مختلف تھے۔ قائم گنج کا آفریدی پٹھان کا خاندان ابتدا سے ہی حکومت میں دخل رکھتا تھا۔ محمد خاں بنگش کی شجاعت اور دلیری سے کون واقف نہیں۔ بنگش نے ہی اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا تھا۔ یوسف حسین خاں جو تاباں صاحب کے برادر نسبتی تھے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''ہمارے آبا و اجداد نے محمد شاہی دور میں تلاشِ روزگار میں افغانستان کی سرحد سے ہندوستان کا رخ کیا۔''

غلام ربانی تاباں ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء کو بمقام پتورہ قائم گنج ضلع فرخ آباد پیدا ہوئے۔ والد جناب عالم خاں کے یہاں سات اولادیں ہوئیں۔ سب کے ناموں میں عالم کی تکرار تھی جس سے رعونت ونخوت کی بو آتی تھی اس لیے ان کا نام غلام ربانی رکھا گیا۔ اس کے بعد پھر اولاد ہوئی تو اس کا نام خورشید عالم خاں رکھا گیا۔ اس طرح بقول عذرا رضوی (دختر تاباں) ''عالموں کے بیچ غلام ربانی تنہا نظر آتے ہیں''۔ عذرا رضوی نے یہ بھی لکھا:

> ''تاباں نہ صرف نام کی بہ نسبت عالموں سے الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں بلکہ ان کے اصول ونظریات بھی عالموں سے مختلف تھے۔ ان کے بھائی کھیل کود، آرام و آسائش پسند کرتے تھے لیکن تاباں ان چیزوں سے الگ رہتے تھے۔ ان کے بھائی سیر وتفریح، شہ سواری، نشانے بازی میں یکتا تھے۔ لیکن تاباں ان سب چیزوں کی جانب کبھی بھی مائل نہ ہوئے۔ وہ بچپن سے ہی سادہ مزاج، کم سخن اور حق گو تھے اور عمر کی آخری منزل تک اس پر مضبوطی سے گامزن رہے۔''

(بحوالہ غلام ربانی تاباں، ادبی سفر کے مراحل از عبدالحمید۔ ص:۱۳)

دیکھیے کتنے مختلف تھے غلام ربانی۔ یہ اختلاف فطری ہوسکتا ہے لیکن انحراف فطری کم ہوتا ہے، فکری زیادہ ہوتا ہے۔ ارادی اور شعوری بھی۔

میری ابتدائی ملاقاتیں بیحد معمولی اور سرسری تھیں۔ اس وقت تک میں ان کی گوری چٹی چاندی جیسی شخصیت کے طلسم میں ہی اسیر رہا۔ اصل ترقی پسند تاباں شاعر و دانشور تاباں سے اس وقت قربت ہوئی جب ڈی فل کی ڈگری حاصل کرکے پہلی ملازمت کرنے سینٹ جانس کالج آگرہ پہنچا۔ آگرہ جو کبھی اکبرآباد تھا اب متھرائی تہذیب، ورنداون کلچر میں ڈوبا ہوا تھا اور اور چھم چھم گلی کے میوہ کٹرہ میں تنہا میکش اکبرآبادی ہی رہ گئے تھے جو اکبرآباد کی گم ہوتی تہذیب کو سینے سے لگائے کبھی اپنے کو اور کبھی تہذیب کو

بچانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ بوقت قدم بوسی میکش صاحب قبلہ نے مجھے بتایا کہ جس کالج میں تم پڑھانے آئے ہو اس کالج میں کبھی حامد حسن قادری اردو کے استاد رہے ہیں جن کے شاگرد تھے مجاز، جذبی، آل احمد سرور اور غلام ربانی تاباں۔ یہ سن کر مجھے مسرت ہوئی اور حیرت بھی۔ اس وقت (۱۹۸۰ء) تک جذبی، سرور اور تاباں صاحب بقید حیات تھے۔ میں نے ان سب سے کالج کے حوالے سے ملاقاتیں کیں اور ادارے کا ذکر چھیڑا تو یہ سبھی جذباتی ہو گئے۔ تاباں صاحب ذرا کم ہوئے کہ کہیں نہ کہیں پٹھانیت اب بھی ان کے ذہن کے کسی کونے میں دُبکی پڑی تھی۔

میں نے شعبہ کو متحرک کرنے کے لیے ایک سمینار اور مشاعرہ کا اہتمام کیا اور ان بزرگوں سے شرکت کی درخواست کی اور یہ سبھی کالج کے نام پر آئے سوائے سرور صاحب کے کہ وہ ان دنوں علیل تھے۔ جذبی تو اپنے کالج کو، مجاز کی دوستی کو یاد کر کے اس قدر جذباتی ہوئے کہ آبدیدہ ہو گئے۔ لیکن تاباں صاحب آب دیدہ ہونے والوں میں سے نہ تھے وہ بہادر اور مضبوط انسان تھے نیز خاندانی رویّوں سے الگ ہو کر، الگ راہ اپنا کر زندگی کو دوسرے زاویے سے دیکھ رہے تھے اسی لیے ان کی آب دیدگی، دیدہ وری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تاباں صاحب اپنے پرانے کالج میں آئے تو ان کے ساتھ اجمل بھائی بھی تھے۔ مشاعرے میں شرکت کی۔ اسٹیج پر شعراء کی جھرمٹ میں وہ سمیں شخصیت غلام ربانی کم ماہ تاباں زیادہ لگ رہی تھی۔ ان دنوں میں نے اجمل بھائی کی زبان سے تاباں صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار بار بار سنے۔ وہ غزل یہ تھی۔

سنگ و خشت کو تاباں بام و در نہیں کہتے
ربطِ غم نہ ہو جس سے اس کو گھر نہیں کہتے

بات صرف اتنی ہے زندگی کی راہوں میں
ساتھ چلنے والوں کو ہم سفر نہیں کہتے

کوئی کیسے سمجھائے سادہ دل اسیروں کو
بال و پر کی حسرت کو بال و پر نہیں کہتے

سب چراغ بستی کے اونگھنے لگے تاباں
وہ کوئی کہانی ہو رات بھر نہیں کہتے

یہی غزل انھوں نے کالج کے مشاعرے میں سُنائی، شاید ایک نظم بھی جو بیحد سنجیدہ تھی۔ ان تخلیقات کو سننے اور ان کی بُردبار شخصیت سے کسی قدر واقف ہونے کے بعد جب مجھے پتہ چلا کہ کسی زمانے میں تاباں صاحب مزاحیہ شاعری بھی کرتے تھے فرچٹ تخلص تھا تو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی۔ شاید یہ طالب علمی کے زمانے کی بات رہی ہوگی، لیکن انھیں دنوں ان کے نظریات میں تبدیلی آتی گئی اور وہ اشتراکیت کی طرف مائل ہوتے گئے۔ غزلوں کی جگہ نظموں نے لے لی اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سازِ لرزاں'' (۱۹۵۰ء) میں شائع ہوا تو اس میں نظمیں ہی شامل تھیں لیکن وہ اپنی نظموں سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ ان دنوں اردو شاعری میں فیض، مجاز، مخدوم، سردار جعفری وغیرہ چھائے ہوئے تھے، ان کی بے مثال اور یادگار نظموں کا طوطی بول رہا تھا اور یہ بھی کہ تاباں صاحب کی جو ذہنی تربیت ہوئی تھی اور جس طرح آگرے کے قیام کے دوران وہ حضرت میکش اکبرآبادی کے قریب آگئے تھے اور متصوفانہ غزلیہ شاعری کا اثر قبول کیا تھا وہ انھیں نظموں کی طرف اس رغبت اور تخلیقیت کے ساتھ نہ لے جاتا۔ وہ باتوں باتوں میں میرے سامنے بھی فرما چکے تھے کہ مجھ کو غزل کی طرف لانے اور غزل کے اسرار و رموز سمجھنے اور سمجھانے اور زندگی کا ایک گہرا و سنجیدہ تعارف کرانے اور غزل سے اس کے رشتے استوار کرنے میں حضرت میکش اکبرآبادی کی شخصیت وصحبت کا بڑا اثر رہا ہے۔ ایسا اثر کہ وہ آگرے سے نکلتے ہی غزل پر غزل کہتے گئے۔ کچھ دنوں وکالت کی لیکن جی نہ لگا، سب چھوڑ چھاڑ کر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ حالات کے تقاضے ہی کچھ اور تھے، اس دور میں انھوں نے نظمیں بھی کہیں لیکن اس میں بھی دل نہ لگا تو کچھ دنوں کے لیے خاموشی اختیار کرلی اور کلاسیکی ادب کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے۔ قدیم وکلاسیکی اساتذہ کی شاعری کے مطالعہ نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ:

''ترقی پسندی کسی مخصوص صنفِ سخن تک محدود نہیں، وہ تو

نام ہے ایک اندازِ فکر، ایک نظریہ کا جس کا شعری اظہار
نظم اور غزل دونوں میں کیا جا سکتا ہے۔''

میر، غالب، اقبال سبھی بڑے شعراء نے حیات و معاشرہ کی باتیں کی ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں اپنے مخصوص اسلوب و علائم کے ذریعہ غزل کا سماجی اور فکری سفر طے ہوا۔ نئے سماجی تقاضوں اور سیاسی خارجیت کو براہ راست غزل میں کس طرح جذب و پیوست کیا جائے، اس سوال کا جواب دیا فیض، جذبی، مجروح کی غزلوں نے۔ یقیناً تاباں صاحب نے ان سب سے تحریک حاصل کی ہوگی، کیوں کہ ۱۹۵۳ء میں جب وہ باقاعدہ غزل کی طرف آئے تو فیض کا ''نقش فریادی'' اور مجروح کا مجموعہ ''غزل'' دھوم مچا چکے تھے اور ترقی پسند غزلوں کا ایک شور تھا، لیکن اس شور میں غزل کی کلاسیکیت قائم تھی کہ یہ سبھی شعراء قدیم شعر و ادب سے بخوبی واقف تھے۔ ترقی پسند غزل نے روایت سے انحراف تو کیا، لیکن ساتھ ہی غزل کی تہذیب و تحریم کی پاسداری بھی برتی اور سیاست سے براہ راست رشتہ جوڑا۔ حالانکہ اس قبل بھی سماج اور سیاست سے رشتہ کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا، لیکن ترقی پسند شاعروں نے جس نوع کی سیاسی رمزیت سے غزل کو متعارف کرایا وہ تصوف کے معنیاتی اور اسلوبیاتی نظام کی طرز پر ایک واضح سیاسی نظامِ حیات کے تابع ہے۔

تاباں صاحب جس جوش و جذبہ کے ساتھ آزادی کی تحریک اور ترقی پسند تحریک دونوں سے وابستہ ہوئے اور جس انداز سے ترقی پسند لہجے میں نظمیں کہیں، پھر اپنی نظموں سے غیر مطمئن ہونا، شعر گوئی ترک کر دینا اور پھر کلاسیکی ادب کی طرف واپس جانا یہ سب وہ محرکات و عوامل ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاباں صاحب حقیقتاً غزل کے شاعر تھے۔ غزل کا مزاج و مذاق اور اس کی روایت میں سراپا رچ بس جانے کے بعد انھوں نے باقاعدہ غزل کی راہ اختیار کی اور چل پڑے اور پھر ایسا چلے کہ پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ۱۹۶۰ء میں غزلوں کا پہلا مجموعہ ''حدیثِ دل''۔ ۱۹۷۰ء میں ''ذوقِ سفر''۔ ۱۹۷۶ء میں ''نوائے آوارہ'' اور ۱۹۹۰ء میں ''غبارِ منزل'' شائع ہوئے۔

تاباں صاحب نے جس عہد میں غزلیں کہنی شروع کیں، اس وقت دو مشکلیں

سامنے تھیں۔ اوّل یہ کہ وہ نظموں کا دور تھا۔ دوم یہ کہ فیض، جذبی، مجروح کی غزلوں کی ایسی دھوم تھی کہ ان سے الگ ہٹ کر یا آگے جا کر غزلیں کہنا بیحد مشکل تھا۔ لیکن تاباں صاحب نظم کے معاملے میں لڑکھڑا چکے تھے اور مزاجاً سنجیدہ و گہرا شعور و وجدان رکھتے تھے۔ زندگی کا ایک گمبھیر اور فلسفیانہ تصور۔ فطرتاً کم گو تھے۔ کم سخن، سلجھے ہوئے، تراش خراش کے انسان تھے۔ یہ ساری خوبیاں فطری انداز میں ان کی غزلوں میں سمٹ آئیں۔ پیش رووں کا تاثر، میکش صاحب کی تربیت چنانچہ غزل گوئی میں زندگی کے تجربات، تصوف کا رنگ اور طبیعت کی فطری نزاکت ان عناصر نے تاباں کی غزل گوئی کا خمیر تیار کیا اور ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ پروفیسر قمر رئیس کا یہ تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> ''انھوں نے عشق و تصوف کی لفظیات، بہار و خزاں اور شمشیر و سناں کی علامات اور مانوس تلمیحات کو اپنی ذات کے حوالے سے نئے سیاق و سباق میں برتا اور اس طرح اپنے لیے ایک نئی راہ نکالنے کا جتن کیا۔ وہ شعر بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔ ہر لفظ اور ہر بندش پر غور کرتے تھے۔ ایک غزل مکمل کرنے میں کبھی کبھی انھیں ایک ہفتے لگ جاتے تھے۔ انھوں نے بعض ترقی پسندوں کے اس تصور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا کہ غزل کو فکری اور جذباتی ریزہ کاری سے پاک کر کے ایک موڈ کا پابند کیا جائے۔ ان کی غزلوں میں حزن و یاس بھی ہے اور عزم و نشاط بھی۔ انسانیت پر اعتماد بھی، برہمی اور احتجاج بھی۔ خوابوں کے دھندلکے بھی۔ حقیقت کی روشنی بھی۔ تنہائی اور یادوں کا عذاب بھی اور انسانوں کی قربت کا حوصلہ خیز احساس بھی۔ الغرض ان کی غزل میں ہر طرح کے تلخ و شیریں تجربات، اندیشے اور آرزومندیاں موج در موج

اٹھتے نظر آتے ہیں۔"

(ایوانِ اردو۔اپریل ۱۹۹۳ء)

اب چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جلوہ پابند نظر بھی ہے نظر ساز بھی ہے
پردۂ راز بھی ہے پردۂ درراز بھی ہے

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بوئے گُل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

چمن میں عمر گذاری مگر صبا کی طرح
ترس گئے ہیں کسی درد آشنا کے لیے

خود اپنے شوق پہ ہے انحصار مرگ وحیات
ہمارا کوئی مسیحا نہ کوئی قاتل ہے

حیات نرم دھندلکوں میں کھو گئی ہوگی
سوادِ زلف میں اب شام ہو گئی ہوگی

مُدّتوں کے بعد گہری نیند کا ٹوٹا طلسم
شورشوں کو دہر کی انگڑائیاں کہہ لیجئے

یقیں کو وہم، حقیقت کو خواب کیسے کہوں
جہانِ شوق کو موجِ سراب کیسے کہوں

خود نما تو کیا کہیے خود شکن سی ہوتی ہے
زندگی کہ خوابوں کی انجمن سی ہوتی ہے

زندگی درد سہی درد میں لذت تو ملی
سر کو سودا تو ملا دل کو جراحت تو ملی

یہ اور نہ جانے کتنے اشعار ہیں جن میں زندگی سے متعلق ایک سنجیدہ اور ڈھلا ہوا تصور ملتا ہے۔ فکر ملے گی زندگی کی رنگا رنگی کے ساتھ اس کا احترام و وقار ملے گا۔ تاباں

صاحب نے براہ سیاسی نوعیت کے مضامین تو لکھے جو ان کی کتاب ''شعریات سے سیاسیات تک'' میں شامل ہیں، لیکن اشعار میں راست طور پر سیاسی رنگ نہیں کے برابر ہے۔ وہ سیاست کو کوئی مجرّد شے نہیں مانتے تھے، بلکہ زندگی کا ہی ایک حصہ ایک جُز۔ سماج کے اور بھی بہت سے نشیب وفراز، تجربات وحادثات، خیالات ونظریات سب سب کے سب وحدت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں جہاں سے سارے شاخسانے پھوٹتے ہیں۔ زندگی کے اسرار ورموز، سپید وسیاہ، سفر حضر سب پر ان کی گہری نظر ہے اور اس کو وہ اوپری ترقی پسندانہ نظر سے کم، گہری عارفانہ نظر سے زیادہ دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں سیاسی سُبک روی کے بجائے زندگی کا بھاری بھرکم احساس اس کا فلسفیانہ روپ نکھر کر سامنے آتا ہے اور جس طرح انھوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کے مشاہدات و تجربات اور تضادات پیش کیے ہیں وہ انھیں ان کو اپنے عہد سے آگے کا شاعر بنا کر پیش کرتے ہیں، جنھیں عارضی صورتوں اور وقتی اُبال سے ہٹ کر محض اردو کی ترقی پسند غزل گوئی کے حوالے سے نہیں بلکہ اردو شاعری کی ایک مخصوص عارفانہ ومتصوفانہ روایت کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تاباں صاحب شاخ، پتّوں پر نظر نہیں جڑ پر نظر رکھتے ہیں۔ ایک گہری نظر اور یہ نظر جامد وساکت نہیں بلکہ عمل، سفر اور جستجو سے پُر ہے اور یہیں سے ان کی اصل ترقی پسندی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ جابجا اپنے اشعار میں زندگی کو ایک حرکت، ایک سفر، ایک بہتے ہوئے چشمے اور ایک جلتے ہوئے چراغ کی طرح دیکھتے ہیں۔ چند اشعار اس مزاج کے بھی دیکھیے۔

رہِ طلب میں کسے آرزوئے منزل ہے
شعور ہو تو سفر خود سفر کا حاصل ہے

غبارِ راہ چلا ساتھ میں یہ کیا کم ہے
سفر میں اور کوئی ہم سفر ملے نہ ملے

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

ہو شوق اگر شوق تو ساماں کی کمی کیا
دیوانہ تو ہو کوئی بیاباں کی کمی کیا
رہ گذر ہو یا مسافر نیند جس کو آئے ہے
گرد کی میلی سی چادر اوڑھ کر سو جائے ہے
منزلوں سے بیگانہ آج بھی سفر میرا
رات بے سحر میری درد بے اثر میرا

تاباں صاحب کی پوری شاعری زندگی اور اس کے عمل و سفر کا ایک خوبصورت و دلکش منظرنامہ ہے، ذوقِ سفر ہے، نوائے آوارہ ہے۔ عمدہ شاعری اپنی کچھ فکری یادیں ہوا کرتی ہیں۔ تاباں صاحب کا مرکزی خیال حیات اور کارزارِ حیات ہے۔ زندگی ان کی شاعری کا مرکز و محور ہے۔ ترقی پسند جماعت کے وہ شعراء جنھوں نے عہد کے تقاضوں کے تحت شاعری کو خطابت، خارجیت اور سیاسی رمزیت کو ہی شاعری کا نام دیا تھا، تاباں کی شاعری اس سے الگ اپنی راہ بناتی ہے جو فیض اور ان کے مقلدین سے دور میکش اور جذبی کی شاعری سے قریب ہوتی ہوئی زندگی کی اس ڈگر پر کھڑی ہوتی ہے جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے چہرے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ جہاں حیات صرف ایک لمحاتی گونج میں نہیں بلکہ اپنی وسعت اور ارتعاش کے ساتھ مختلف جلوؤں میں نظر آتی ہے۔ ترقی پسندی کا ایک یہ بھی روپ تھا اور جس کے نقوش لازوال ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تاباں کی شاعری میں حسرت، جگر وغیرہ کی شوخی اور جگمگاہٹ نہیں ہے اور بظاہر توجہ اور کشش کا سبب نہیں بنتی، لیکن قدرے توقف کے بعد ٹھہر ٹھہر کر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو وہ فانی، یگانہ، اصغر، میکش کی راہ پر چلتے ہوئے ایک سنجیدہ، تصوف اور فلسفیانہ رنگ میں رنگے ایسے شاعر ضرور ہیں جن کا اثر دیر سے ہوگا لیکن دور تک ہوگا۔ ترقی پسندی کا یہ روپ ظاہر سے باطن، خارج سے اندرون کی طرف لے جاتا ہے اور عمدہ و بڑی شاعری تو باطن کی ہی ضمانت دار ہوا کرتی ہے۔

تاباں صاحب کی شاعری میں جو سنجیدگی، سادگی اور قلندری کا رنگ ملتا ہے کم و بیش یہی ان کی شخصیت کا بھی حصہ تھی۔ وہ زندگی بھر قلندر رہے، پاک، صاف، ایماندار اور

غازی کردار۔ آج جب میں ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کا حال دیکھتا ہوں تو تاباں صاحب، اجمل اجملی وغیرہ بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کردار تھا، کیا آزاد و بے نیاز شخصیت تھی۔ سرتاپا سچے حقیقی ترقی پسند۔ کبھی جھکے نہیں، کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ۱۹۸۵ء میں لندن میں انجمن کی گولڈن جبلی کانفرنس منائی گئی سبھی ترقی پسند اور بعض غیر ترقی پسند بھی ترقی پسند بن کر لندن کی سیر کو جا رہے تھے۔ تاباں صاحب کے پاس بھی دعوت نامہ تھا، لیکن کرایہ نہ تھا۔ سید عاشور کاظمی خود ہندوستان آئے اور تاباں صاحب کے ساتھ الہ آباد بھی آئے۔ ہم نے دونوں کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔ عاشور کاظمی اصرار کرتے رہے کہ لندن ضرور آئیے۔ ان دنوں تاباں صاحب کے چھوٹے بھائی خورشید عالم خاں مرکزی حکومت میں نائب وزیر خارجہ تھے، تاباں صاحب کے ایک اشارے پر سارے انتظامات ہو سکتے تھے، لیکن ان کی غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ زبان نہ کھولی اور لندن نہیں گئے۔ فرقہ واریت کے خلاف کیا کیا نہ قدم اور قلم اُٹھائے۔ پدم شری تک واپس کر دیا۔ زندگی بھر معمولی سی ملازمت کرتے رہے اور معمولی سے مکان میں رہے، لیکن اسی معمولی پن سے ہی وہ بڑے ہوئے، عزت کمائی۔ ان کے بھائی خورشید عالم خاں جو ذاکر حسین خاں کے داماد تھے، ہمیشہ گورنر منسٹر رہے۔ کل شاید لوگ ان کو بھول جائیں، لیکن تاباں صاحب کو بھولنا آسان نہیں جو کبھی حکومت کے قریب نہیں آئے، جو کبھی گھوڑے گاڑی پر نہیں چڑھے، اپنے بڑے بھائی کے اس غیر معمولی کردار و ایثار کو دیکھ کر ہی خورشید عالم خاں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

> ”سیاسی خیالات اور پالیسی سے متعلق ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے، نہ ان کو کبھی یہ خیال آیا کہ وہ اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے بہت سارو پیہ نہ کما سکے یا کوئی بڑا عہدہ نہ پا سکے۔ دراصل ان کو کبھی بہت سارو پیہ کمانے کی خواہش ہی نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی یہ خواہش کہ انھیں کوئی بڑا عہدہ ملے۔ وہ تو صرف اپنے خیالات اور نظریات کا پرچار کرتے رہے اور شاعری میں مگن اور مشغول رہے۔“

(میرے بڑے بھائی غلام ربانی تاباں)

تاباں نے جتنی کم شاعری کی اس سے کم اس کی تشہیر کی بلکہ ایک مخصوص قسم کی خاموشی اور ادائے دلبری ان کو گھیرے رہتی۔ تاباں صاحب ہر اعتبار سے صداقت اور طہارت کا ایک نمونہ تھے۔ فن اور فنکار کی ایک دلآویز تصویر جو ملمع اور تصنع کی دنیا میں دوسروں کی نظر میں بالعموم اپنی نظر میں بالخصوص ایماندار اور معتبر لگے۔

عشق میں بیگانۂ جذب و اثر ہو جایئے
کم سے کم اپنی نظر میں معتبر ہو جایئے

تاباں صاحب کی شخصیت و شاعری دونوں کا اعتبار و احترام لازوال ہے۔ جب طوفان تھمے گا تو تاباں صاحب کی گہری و سنجیدہ شاعری کی شناخت قائم ہوگی، کیوں کہ اس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اچھی اور بڑی شاعری کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔

تاباں صاحب آخری سانس تک غیرت مند اور ترقی پسند رہے۔ بامقصد و باعمل رہے اور ساتھ ہی کج کلاہ بھی۔

تاباں جبیں پہ کج ہی رہا بانکپن کے ساتھ
کانٹوں کا زندگی نے پہنایا ہمیں جو تاج

□□□

میکش اکبرآبادی۔تاثرات وخیالات

آج سے تقریباً۳۲۔۳۳ سال قبل کی بات ہے۔۱۹۸۰ء میں ایک نوجوان الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ڈی فل کی تعلیم مکمل کر کے بسلسلۂ ملازمت آگرہ آتا ہے اور یہاں کے مشہور ومعروف کالج سینٹ جانس کالج میں بحیثیت اردو لکچرر وابستہ ہوتا ہے۔سب جانتے ہیں کہ آگرہ مغربی یو۔پی کا سب سے بڑا شہر ہے۔اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔کبھی تہذیب بھی تھی جو اب صنعتی رنگ میں رنگ کر عالم کاریت کا حصہ بن چکی ہے۔مغل بادشاہوں کا آباد کیا ہوا یہ شہر بھگوان کرشن کی لیلاؤں،میلوں ٹھیلوں میں رچا بسا برج کا یہ علاقہ کبھی اکبرآباد تھا اور بہت زمانہ تک اکبرآباد ہی رہا۔مغل اور برج کی امتزاجی تہذیب نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی جس کے عوامی نمونے نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں اور صوفیانہ جلوے میکش اکبرآبادی کی غزلوں میں دیکھے جاتے ہیں۔شاید اسی لیے شعراء کل بھی اور آج بھی اپنے آپ کو آگرہ کے بجائے اکبرآباد سے منسوب کرتے ہیں۔یہ سلسلے نظیر اکبرآبادی سے لے کر میکش اکبرآبادی بلکہ اور آگے اسرار اکبرآبادی اور دیگر اکبرآبادی شعراء تک پھیلے ہوئے ہیں۔شاید اسی لیے حضرت سیماب اکبرآبادی نے رسالہ ''شاعر'' اور ''قصرالادب'' جیسے بڑے کارنامے انجام دیتے ہوئے یہ چاہا تھا اور کوشش بھی کی تھی کہ اکبرآباد کی ایک الگ دبستانی حیثیت قائم ہو۔دبستان دہلی اور لکھنؤ کی طرح۔وہ اپنے مقصد میں کتنے کامیاب ہوئے یہ الگ گفتگو کا موضوع ہے۔لیکن یہ تو ہے کہ اردو کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم اکبرآباد سے واقف ہوا۔کل نظیر اکبرآبادی کے حوالے سے آج میکش اکبرآبادی کے حوالے سے۔درمیان میں سیماب اکبرآبادی اور بعض دوسرے۔لیکن آج بالکل آج کے اردو کے طالب علموں سے پوچھیے کہ اکبرآباد کہاں ہے یا آگرہ کا پرانا نام کیا ہے تو بے خبری اور حسرت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔یہ مسئلہ اکبرآباد تک محدود نہیں عظیم آباد اور دوسرے آباد علاقوں کا بھی ہے کہ یہ آباد علاقے کل جتنے آباد تھے،ذہنوں میں آج اتنے ہی غیر آباد۔

بہر حال راقم نے جب پہلی بار اس علاقہ میں قدم رکھا تو ذہن میں آگرہ بھی تھا اور اکبرآباد بھی اس سے زیادہ نظیر کہ وہ ہمیشہ سے میرے محبوب شاعر رہے ہیں۔ ذہن کے ایک گوشہ میں تاج محل بھی تھا۔ کالج کے احاطہ میں داخل ہوا، پرنسپل سے ملاقات کی تو پہلی ہی گفتگو میں بجلی سی گر پڑی۔ فرمایا ''اس وقت صرف چار اردو کے طالب علم ہیں۔ آپ کو کم از کم پندرہ طالب علم جمع کرنے ہوں گے تبھی کلاس چل پائے گا، تنخواہ بن پائے گی۔''

اس دیارِ غیر میں طالب علموں کو جمع کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یہ ہفت خواں کیسے طے ہوا یہ الگ مشقتوں بھری کہانی ہے۔ بہت حال اس تگ و دو اور جد و جہد کے عمل میں آگرے میں جن چند معززین سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور جنھوں نے ہر اعتبار سے میری مدد فرمائی ان میں حضرت قبلہ میکش اکبرآبادی سرِ فہرست ہیں۔ اوّل تو ان کی شاعرانہ شخصیت، دوم شہر میں ان کی بطور صوفی پیر و بزرگ احترام و عزت، سوئم ان کے بیٹے حضرت معظم علی شاہ اسی کالج میں شعبۂ نفسیات کے سینیر استاد اور صدر شعبہ تھے اور انھیں کی کوششوں سے ہی عرصۂ طویل کے بعد شعبۂ اردو کا آغاز ہوا تھا ورنہ کئی دہائی قبل وہ بند ہو چکا تھا۔ آخری استاد ڈاکٹر مغیث الدین فریدی تھے اور اس سے کافی عرصہ قبل مولانا حامد حسن قادری تھے۔ جید ادیب اور ''تاریخ ادب اردو'' کے مؤلف و مصنف انھیں دنوں پتہ چلا کہ اس کالج کی شعبۂ اردو کی قدیم روایت سے اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، آل احمد سرور، غلام ربانی تاباں جیسے مشہور و معروف شعراء و ادباء اسی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ مضبوط شعبہ رہا ہے۔ پھر یہ شعبہ کمزور کیوں ہو گیا۔ بند کیوں ہو گیا۔ شاید مغیث الدین فریدی صاحب کے دہلی یونیورسٹی چلے جانے سے۔ اردو دوستوں کی بے اعتنائی سے یا بدلتے ہوئے حالات اور بدلتا ہوا شہر جو رفتہ رفتہ اکبرآباد سے آگرہ میں بدل رہا تھا اور مشترکہ تہذیب سے نکل کر ایک منفرد تہذیب کہ جسے تہذیب کہہ پانا مشکل ہے۔ بہر حال جہاں اکبرآباد تھا نہ برج۔ بس بن ہی بن تھا۔ چاہے برندابن یا چڑے کا بن۔

مجھے ممتاز ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی شفقتیں حاصل رہی ہیں۔ میرے آگرہ پہنچنے پر ایک ملاقات میں انھوں نے مجھے بتایا کہ آگرہ تقسیم ہند کا سب سے متاثر علاقہ ہے۔

''وہ کیسے؟'' میرا سوال تھا۔

وہ اس طرح کہ جب میں اور ستھیو کر ''گرم ہوا'' فلم بنا رہے تھے تو ہمیں ایسے علاقہ کی تلاش تھی جو تقسیم سے زیادہ ہی متاثر ہوا ہو، کیوں کہ ہم لوگوں کی فلم کا اصل موضوع تھا تقسیم ہند۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ وہ شہر آگرہ ہے۔ جہاں کھوکھراپار کے راستے سے بیشتر مسلم شرفاء پاکستان چلے گئے۔ اکبر آباد خالی سا ہو گیا صرف وہی لوگ رہ گئے جن کے کل کارخانے تھے، کاروبار تھے اور جسے چھوڑنے سے قاصر تھے۔ لیکن وہ لوگ زیادہ تھے جن میں ہجرت کی سکت ہی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں آگرہ پہنچا تو کارخانے آباد تھے، تعلیم گاہیں ویران۔ غربت کو یوں بھی ہاتھ چاہئے قلم نہیں اور میں اس شہر میں قلم اور سند لے کر داخل ہوا تھا۔ ان حالات میں بھی کیفی صاحب نے ہدایت کی تھی کہ دو بزرگوں سے ضرور ملوں۔ اوّل تو حضرت میکش اکبر آبادی اور دوسرے راجیندر رگھوونشی۔ رگھوونشی جی نے فلم بناتے وقت میری بڑی مدد کی تھی۔ اداکاری بھی کی۔ وہ تمھاری بھی مدد کریں گے۔ رگھوونشی جی IPTA سے متعلق تھے۔ پوری ٹیم تھی، بلکہ پورا خاندان اسی میں لگا رہتا۔ لیکن فلم میں مدد کرنا اور بات ہے اور اردو کے طالب علم...؟ بہر حال میں ان سے بھی ملا اور ملتا رہا کہ میں خود بھی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو چکا تھا اور اپٹا الہ آباد کا ممبر بھی تھا۔ بہر حال اس خاندان سے قریب آنا فطری تھا اور فکری بھی اور آج بھی رگھوونشی خاندان سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ لیکن میکش صاحب سے ابتدائی ملاقاتوں میں ایک فاصلہ رہا۔ اول تو عمر کا فاصلہ، دوئم بزرگی، تہذیب و علمیت کا فاصلہ۔ سوئم وہ ایک پاکیزہ آستانہ تھا جس کے وہ مرد پیر تھے۔ چہرے سے بزرگی، پاکیزگی ظاہر ہوتی تھی۔ ساتھ ہی ایک گہری شفقت و محبت بھی۔ پرانے آگرے کے گھنے محلّے میں آبادان کا آستانہ چھم چھم گلی کوچے میں ایک ایسا مرکز تھا جو اپنی گم ہوتی ہوئی تہذیب اور بدلتے ہوئے حالات کو حیرت سے تکتا۔ مسرت اور حسرت سے ان دنوں کو یاد بھی کرتا جب نہ صرف یہ آستانہ بلکہ پورا شہر علم و ادب، قصر الادب بنا ہوا تھا۔ ایک سے ایک شاعر، ادیب، فنکار آگرے آتے جاتے۔ آستانۂ میکش پر قیام کرتے۔ ادب و تصوف کی گنگا بہتی جس میں سب شرابور ہوتے۔ فانی بھی مانی بھی جوش و جگر بھی

سیماب اور اخضر بھی۔ لیکن ایک ایک کر کے یہ سبھی رخصت ہو گئے۔ ساتھ ہی تہذیب و تعلیم بھی لے گئے کہ اب آگرہ میں اردو پڑھنا اور پڑھانا عبرتناک اور اذیت ناک عمل تھا۔

میکش صاحب، معظم صاحب اور مرغوب الزماں صاحب نے یہ رائے دی کہ میں آگرہ کی ان تعلیم گاہوں میں جاؤں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے ان اداروں کے چکر لگائے لیکن ان کا حال اور بھی برا تھا۔ احمدیہ کالج کا کتب خانہ اور اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر تو رونا آ گیا کہ اسلاف کے کارناموں، اجداد کی کاوشوں پر وقت کی دھول جمی ہوئی ہے۔ ادارے ماتم کناں، کتابیں نوحہ خواں کہ ان سب پر چمڑے کی ایک دبیز چادر پڑی تھی اور یہ سب کہ سب جوتوں تلے روندے جا چکے تھے کہ ان سے زیادہ قیمتی اور ضروری تھے جوتے کے کارخانے۔ جواز یہ تھا کہ کتابوں سے علم تو ملتا ہے روٹی نہیں۔ چمڑے سے روٹی ملتی ہے علم نہیں۔ مسلم معاشرہ کا یہ کراس عجیب تھا۔ تہذیب کا یہ کراس تو کرسچین کالج میں بھی تھا لیکن ایک الگ انداز میں مختلف و منفرد اور مقدس بھی کہ دائرہ اقلیت جس قدر محدود ہوتا جاتا ہے اسی قدر مضبوط بھی ہوتا جاتا ہے۔

غیر معمولی محنت و مشقت کے بعد کچھ آگرہ، کچھ فیروز آباد، کچھ الہ آباد سے طلباء دستیاب ہوئے اور کسی طرح شعبہ چل پڑا اور میں رہنمائی و سرپرستی کے لیے گاہے بگاہے میکش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ چند ماہ میں میکش صاحب کے گھر کے پاس کرایے کا مکان لے کر رہا، لیکن جلد ہی پرنسپل صاحب نے ہوسٹل کا ایک کمرہ عنایت کر دیا۔ اُن دنوں حاضری کچھ زیادہ تھی۔ عزت، عقیدت میں ڈھلنے لگی تاہم زیادہ بات نہ کر پاتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ خود میکش صاحب بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ نہ سکا۔ زبان میں شاید ہلکی سی لکنت تھی۔ شاید یہ وجہ ہو لیکن وہ تو چہرے کی بزرگی و پاکیزگی کے آگے سر نہ اٹھا پاتی۔ وہ مزاجاً کم سخن تھے۔ بعد میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے بیٹے معظم شاہ بھی کم بولتے ہیں اور ان کے بھی بیٹے اجمل شاہ بھی کم سخن ہی ہیں۔ نسل در نسل چلی آ رہی اس خاموشی اور سنجیدگی کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوا کہ یہ خاموشی یا کم سخنی کوئی کمزوری نہیں بلکہ تہذیب آستانہ اور روایت صوفیانہ کے وہ مہذب ادب و آداب ہیں۔ جہاں اخلاق و

تہذیب معمولی مہمان کو بھی کمتر نہیں ہونے دیتی۔ حاضری دینے والوں کو کسی کشمکش میں مبتلا نہیں کرتی۔ یوں بھی صوفی درویش، سنجیدہ اندیش کم ہی بولتے ہیں۔ بھرے ذہن کے لوگ کم سخن ہی ہوتے ہیں۔ اس کا برعکس ''جو ظرف ہے خالی وہ صدا دیتا ہے۔''

شعبۂ اردو کو فعّال و متحرک کرنے کی غرض سے میں نے معظم شاہ صاحب سے مشورہ کر کے ایک منصوبہ بنایا کہ کُل ہند سطح پر ایک بڑا سیمینار اور مشاعرہ کیا جائے تاکہ شہر والوں کو علم ہو سکے کہ سینٹ جانس کالج میں شعبۂ اردو کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت میکش کی سرپرستی تو حاصل تھی ہی نیز باہر کے بزرگوں میں استاد محترم پروفیسر سید محمد عقیل، قمر رئیس، جناب رشید حسن خاں وغیرہ نے بھی تعاون دیا۔ رشید حسن خاں ان دنوں یو۔ پی۔ اردو اکادمی کے رُکن تھے۔ انھوں نے پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے کہہ کر مالی مدد بھی کروائی اور یہ سب کہ سب سیمینار میں تشریف بھی لائے۔ مشاعرے میں جذبی صاحب، تاباں صاحب، وامق جونپوری، اجمل اجملی وغیرہ کے علاوہ کثیر تعداد میں شعراء نے شرکت کی۔ ایک عرصہ کے بعد کالج میں مشاعرہ ہوا جو بیحد کامیاب تھا۔ مدتوں آگرے کے گلی کوچہ میں مشاعرے کے کیسٹ بجتے رہے۔ سیمینار میں رشید حسن خاں، سید محمد عقیل، قمر رئیس کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی، عنوان چشتی وغیرہ نے بھی شرکت کی اور خود ایک اجلاس میں حضرتِ میکش نے بھی شرکت فرمائی۔ یہ ہمارے لیے ایک بڑا اعزاز تھا اس لیے کہ انھوں نے آنا جانا تقریباً ترک کر رکھا تھا۔

دوسرے دن جذبی صاحب نے حضرت میکش صاحب کے یہاں حاضری دینی چاہی۔ ان کی عقیدتیں پرانی تھیں۔ ہم صاحب مہمانوں کو لے کر میکش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عجب منظر تھا۔ ایک طرف ان کا آستانہ، سامنے طوائفوں کا گھرانا۔ کھڑکی کھلی رہتی۔ گھنگھروؤں کی قہقہوں کی آوازیں بھی گونجتی رہتیں لیکن ان سب کی چھم چھم تصوف کی دمادم کے آگے گھٹ کے رہ جاتیں۔ یہ متضاد صورت دیکھ کر استاد محترم سید محمد عقیل نے برجستہ ایک مصرعہ پڑھا ''بے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی۔''

چند ماہ کے بعد میرے پاس ایک دعوت نامہ آیا۔ ''بزمِ نظیر'' کی طرف سے نظیر

میلہ کا اہتمام تھا۔

یہ نظیر میلہ کیا ہے......؟ میکش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ آگرے میں نظیر کی حیثیت محض ایک شاعر کی نہیں ہے بلکہ صوفی و بزرگ میاں نظیر کی ہے۔ ویسے بھی آگرہ میلوں ٹھیلوں کا شہر ہے۔ چنانچہ ہر سال بسنت کے دن شہر انتظامیہ کی طرف سے نظیر میلہ کا اہتمام ہوتا ہے، جس میں ہر طبقہ کے عوامی لوگ شرکت کرتے ہیں۔ نظیر کے مزار کا غسل ہوتا ہے۔ شامیانہ لگایا جاتا ہے۔ شام ڈھلے عقیدت مندانِ نظیر اس شامیانے اور میدان میں جمع ہوتے ہیں اور نظیر کی نظمیں گائی جاتی ہیں۔ بڑے لطف کی محفل ہوتی ہے ضرور جایئے گا۔ میرا شوق اور میکش صاحب کا حکم مجھے اس میلے میں لے گیا۔ آگرے کے محلّے تاج گنج جو تاج محل سے متصل ہے وہیں یہ جلسہ ہوتا ہے مرزا شیم بیگ جو پیشے سے وکیل ہیں لیکن شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں ''بزم نظیر'' کے سکریٹری تھے۔ شاید اب بھی ہوں۔ ان سے ملاقات ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ میلے کی غرض و غایت، روایت اور نوعیت کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس کے بعد ہم اس جلسہ میں گئے جہاں راجیندر رگھوونشی اپنی پوری ٹیم اور پورے جوش کے ساتھ موجود تھے۔ پہلے تو ان کے ساتھیوں نے ہارمونیم اور ڈھولک پر نظمیں گائیں۔ عجب سماں بندھا۔ مجمع بڑھا اور جب پورے شباب پر پہنچا تو پھر اسی مجمع میں سے پیلی پگڑی باندھے عام سا آدمی اُٹھ کر آتا اور فرّاٹے کے ساتھ نظیر کی نظمیں سناتا۔ صورت حال یہ تھی کہ جب ٹیپ کا بند آتا تو پورا مجمع جوش میں کھڑا ہو کر اس مصرعہ کو دہراتا اور پورا شامیانہ گونج اٹھتا۔ محلّے والے بھی دھڑک اٹھتے اور شاید صدیوں سے آرام کرتے نظیر اکبرآبادی بھی بیدار ہو جاتے۔ اس لیے کہ اس مجمع میں مجھے ہر آدمی نظیر اکبرآبادی ہی لگ رہا تھا۔ عجیب منظر، عجیب کیفیت جس سے میں پہلی بار دوچار ہوا۔ الٰہ آباد کے دائروں کی محفلِ سماع اور مشاعروں میں خوب شرکت کی۔ عوامی مشاعرے بھی منعقد کیے تھے لیکن یہاں تو کچھ بات ہی اور تھی۔ یہ عام لوگ تھے جو سال بھر کتاب کا ایک ورق نہ الٹتے ہوں انھیں نظیر کی لمبی لمبی نظمیں پوری کی پوری حفظ تھیں۔ عجب حافظہ، عجب جذبہ۔ مجھے احتشام حسین کا وہ جملہ یاد آ گیا جو انھوں نے نظیر کے بارے میں ہی لکھا تھا:

"نظیر نے اگر عام آدمیوں اور عام سے موضوعات پر
نظمیں کہیں تو عام آدمیوں نے ہی انھیں زندہ رکھا ورنہ
اردو کی معیار پرست تہذیب نے تو نظیر کو بھلا ہی دیا تھا۔"

میں میلہ میں شرکت کرکے اور نظیر کے تئیں عوام کی عقیدت دیکھ کر حیران تھا۔ دوسرے دن میکش صاحب سے ملا اور اپنا تاثر بیان کیا۔ نظیر میلہ پر مضمون لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے آپ نظیر کو تفصیل سے پڑھ ڈالیے۔ انھوں نے مجھے دو ایک کتابیں بھی عنایت کیں۔ کالج کی لائبریری میں عبدالباری آسی کا مرتب کردہ کلیات نظیر لے آیا۔ قطب الدین باطن کی کتاب "زندگانی بے نظیر" اور مخمور اکبرآبادی کا "انتخاب روح نظیر" غرض کہ میں مطالعہ نظیر میں ڈوب گیا اور ایک سال کے اندر تقریباً آٹھ مضامین نظیر سے متعلق لکھ ڈالے۔ کچھ میکش صاحب کو سنائے۔ کچھ استاد عقیل صاحب کو۔ کچھ شائع بھی ہوئے اور دو ایک سال کے بعد نظیر اکبرآبادی پر میری کتاب بھی شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے نظیر کی عوامی شاعری کام کر رہی تھی لیکن اس کی تحریک تو میکش صاحب سے ہی ملی تھی۔

اس درمیان میکش صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایک زمانہ میں جب آل احمد سرور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری تھے انھوں نے میکش صاحب سے فرمائش کی کہ وہ "فرہنگ نظیر" پر کچھ کام کردیں کہ یہ کام وہی کرسکتے ہیں۔ انجمن اسے اہتمام سے شائع کرے گی۔ میکش صاحب کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے یہ کام محنت سے کیا اور مسودہ سرور صاحب کو سونپا، لیکن انجمن نے شائع نہیں کیا۔ میکش صاحب نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں علی گڑھ جاتا رہتا ہوں سرور صاحب سے ملوں اور پوچھوں کہ اس مسودہ کا کیا ہوا، وہ کب شائع ہوگا۔ چنانچہ میں نے کئی بار سرور صاحب سے ملاقات کی اور میکش صاحب کی بات دہرائی۔ لیکن وہ ہر بار بے نیازی اور لاپروائی سے بات کرتے رہے اور یہ کہہ کر بات ٹال جاتے کہ تم خلیق انجم سے بات کرو اب تو وہ سکریٹری ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ مسودہ کہاں ہے۔ شاید انجمن کے ریکارڈ میں ہو۔ بعد میں میں نے خلیق انجم صاحب سے بھی بات کی، لیکن وہ لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ حیرت ہے کہ میکش صاحب کا یہ قیمتی مسودہ کہاں غائب ہو

گیا۔ اگر ہوتا اور شائع ہوتا تو خاصے کام کی کتاب ہوتی۔ بعد میں اسی نوعیت کے کچھ کچے پکے کام روہیل کھنڈ یونیورسٹی کی طرف سے ہوئے لیکن جو برج کی لسانی تہذیب سے واقف نہیں۔ اشارے اور محاورے پر نظر نہیں، وہ ''فرہنگ نظیر'' پر کیسے کام کر سکے گا۔ یہ سب ہنر و علم تو میکش صاحب کے ساتھ چلا گیا۔

باتوں باتوں میں میکش صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ فانی بدایونی پر بھی کام کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فانی کی شخصیت اور شاعری دونوں سے خاصے متاثر تھے۔ تقریباً اپنی ہر گفتگو میں فانی کا ذکر ضرور کرتے۔ مجاز اور جذبی کا بھی ذکر آتا کہ جب یہ لوگ سینٹ جانس کالج میں طالب علم تھے فانی آگرے میں مقیم تھے اور اکثر میکش صاحب کے آستانے پر آتے۔ اس زمانہ میں فانی کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا اور یہ نوجوان فانی سے بیحد متاثر تھے۔ میکش صاحب کا تو ذہنی رویہ اور فلسفہ بھی ملتا تھا۔ تھوڑا بہت جذبی کا بھی کہ ان دنوں وہ جذبی نہیں ملال تھے، لیکن مجاز کا نہیں ملتا حالانکہ وہ بھی شہید تھے۔ اسی لیے بس دو ایک غزلوں پر اصلاح لی اور الگ ہو گئے۔ فانی نے خود کہا کہ تمھاری شاعری میں نشاطیہ رنگ ہے اور میرا حزنیہ۔ میرا غم تمھاری خوشی کو کھا جائے گا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میکش صاحب کے ذہنی سلسلے ملتے تھے، چنانچہ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ فانی پر ایک تفصیلی اور لمبا مضمون بھی لکھا جو ان کی کتاب ''آگرے والے'' میں شامل ہے۔ اس کتاب میں صرف دو ہی شاعروں پر مضامین ملتے ہیں۔ اوّل طویل مضمون فانی پر، دوم مختصر مضمون جگر مرادآبادی پر۔

تقریباً ہر ملاقات میں فانی کا تذکرہ اتنی محبت و عقیدت سے کرتے کہ محض تذکرے اور گفتگو کی وجہ سے میری دلچسپی فانی سے ہوئی۔ انھیں دنوں میں نے نہ صرف ''فانی اور آگرہ'' کے عنوان سے مضمون لکھا بلکہ ''فانی کی باتیں میکش اکبرآبادی سے'' کے عنوان سے ایک انٹرویو نما مضمون بھی لکھا جو روزنامہ ''قومی آواز'' (۱۳/ستمبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا۔ میکش صاحب کا کہا ہوا ایک طویل جملہ جسے اخبار نے باکس کے اندر شائع کیا یہاں رقم کر دینے میں کوئی حرج نہیں:

''فانی بیحد ہنس مکھ قسم کے انسان تھے۔ ہر وقت لطیفہ کہتے

یا سنتے رہتے۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی جب ان کی
شاعری ہمارے سامنے آتی تھی تو اس میں اس قسم کے
عناصر دیکھنے کو نہ ملتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ پوری
غزل میں دو ایک شعر شگفتہ مزاج کے ہو جاتے تو وہ اسے
غزل سے خارج کر دیتے۔"

فانی سے میکش کی باضابطہ پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی یعنی محض ۲۴ سال کی عمر میں جب میکش مے کش تھے یعنی جوان۔ لیکن میکش پر یہ جوانی ان معنوں میں آئی ہی کہاں بقول میکش ہی:

"میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر کے باہر عزت و
توقیر، محبت و عقیدت کے انبار تھے جو نہ صرف یہ ہمارے
کسی مصرف کے نہ تھے بلکہ ہماری معیشت اور
اقتصادیات پر بار بھی تھے۔ دوسری طرف خاندانی دشمن
بندوق تانے کھڑے تھے اور ہمارا مختصر قافلہ جس کا قافلہ
سالار راستے میں بچھڑ گیا تھا بے مقصد و بے منزل
اندھیری رات میں رواں تھا۔ دشمن تھک گئے، عزت
کرنے والے منتشر ہوتے گئے اور ہمارا قافلہ چلتا رہا۔"
(غبار کارواں)

دشمن بندوق تانے کھڑے تھے شاید اسی لیے میکش صاحب کو بھی جوانی میں رائفل خریدنی پڑی۔ ٹھیک اسی وقت جب وہ رائفل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ملاحظہ کیجیے جنھوں نے میکش صاحب کو بزرگی اور پیری کے عالم میں دیکھا ہے جن میں میں خود بھی ہوں۔ وہ میکش اور رائفل میں کیا ربط اور تعلق محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن بزرگی اور جوانی، دوستی اور دشمنی میں بہر حال فرق تو ہوتا ہی ہے۔ بہر حال اسی ناپ تول کے عالم میں کسی نے آ کر اطلاع دی کہ فانی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ان سے قبل ایک

مشاعرے میں فانی صاحب سے سرسری ملاقات ہو چکی تھی اور میکش صاحب کی غزل کو فانی نے بطور خاص پسند کیا تھا۔ بقول میکش:

"مجھے یاد نہیں اس وقت فانی صاحب نے اپنی کون سی غزل سنائی تھی اور دوسرے شعراء نے کون کون سی۔ اپنی غزل ضرور یاد ہے اور اس کا وہ شعر بھی جس پر فانی صاحب نے بے قرار ہو کر داد دی تھی اور بار بار پڑھوایا تھا۔

میں مضطرب ہوں اور مرے جذبات حشر خیز
وہ چپ ہیں اور کیف کی دنیا لیے ہوئے

ملاحظہ کیجیے میکش صاحب کا عین عالمِ شباب کا یہ شعر۔ خاموشی میں کیف کی دنیا ان کی خاموش شخصیت کو کس قدر متاثر کر گئی اور فانی کو بھی کہ وہ ہمیشہ مضطرب رہے، غم زدہ رہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں رہے۔ یہ سوال ایک بار فراق گورکھپوری نے الہ آباد میں منعقد فانی سیمنار کے افتتاحی تقریر میں اٹھایا اور لوگ بھی اٹھاتے ہیں۔ جب کہ وہ خاصے ہنس مکھ اور بذلہ سنج انسان تھے۔ میکش صاحب نے فانی سے متعلق "پلان چٹ" کا واقعہ بھی سنایا جس کے ذریعہ مرحوم شعراء کی روح کو دعوت دی جاتی اور سیماب اکبر آبادی سے چھیڑ چھاڑ رہتی لیکن فانی، جگر کو پسند کرتے تھے، اس حد تک کہ ایک بار فانی نے یہاں تک کہہ دیا بقول میکش:

"کسی زمانے میں آپ لوگ فخر کریں گے کہ ہم جگر کے ساتھ یہاں اٹھے بیٹھے تھے۔ جگر صاحب کی شاعری کی مداحی کے علاوہ فانی صاحب کو جگر صاحب سے ایک دلی لگاؤ اور محبت تھی۔"

وہی لگاؤ اور عقیدت جو میکش صاحب کو فانی سے تھی، صرف اس لیے نہیں کہ فانی اس عہد کے بڑے شاعر تھے اور میکش کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کے آستانے پر آتے جاتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ فانی کی غزلیہ شاعری کے چند عناصر میکش صاحب کی رہنمائی کرتے تھے، غالباً ہمنوائی بھی۔ انھوں نے فانی کی شخصیت و مزاج سے بہت سی باتیں سیکھیں یا یوں کہیے

کہ ان کی طبیعت کا میلان و رجحان بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ انھیں فانی کی شخصیت و شاعری بیحد موافق آتی تھی، جس نے میکش کی شخصیت اور شاعری کو مہمیز کیا۔ خاص طور پر صوفیانہ خیالات، حیات و کائنات، فنا و بقا کے معاملات ''آپ میکدہ'' سے ''حرف تمنا'' اور بعد میں ''داستانِ شب'' کی شاعری کا ارتقائی اور زمانی مطالعہ کیجیے۔ آپ کو یہ فرق صاف نظر آئے گا۔ ابتدا اس نوع کا شعر کہنے والا شاعر

عشق سے اک جہان ہے ورنہ ۔۔۔ چند ذرّوں کی کائنات ہی کیا

☆

مکتبِ عاشقی میں اے میکش ۔۔۔ فلسفہ اور دینیات کہاں

پختگی کی عمر میں یہ کہہ رہا ہے۔

یہ کائناتِ زمان و مکاں سفر ہی سفر ۔۔۔ نہ عاشقی میری منزل نہ حُسن تیرا مقام

☆

وہم نے کر دیا آنکھوں میں کچھ ایسا جادو ۔۔۔ عین دریا میں بھی اپنی تو سرابوں میں کٹی

دریائے حیات اور سرابِ زندگی کے اور بھی بھنور ہیں جنھیں حیاتِ میکش اور نجاتِ کشمکش کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کے کارواں کے کچھ اپنے غبار ہوتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ''غبارِ کارواں'' کے عنوان سے باقاعدہ مضمون لکھا اور بتایا کہ محض دو سال کی عمر میں باپ کے سایے سے محروم ہو گئے۔ یہ جملہ دیکھیے:

> ''کھلے میدان کی دھوپ میں سارا سامان میسّر ہو تب بھی بغیر سایے کے تو کام نہیں چلتا۔''

اور یہ جملے بھی دیکھیے:

> ''ہر شخص ان کی (والد کی) جواں مرگی اور خوبصورتی کا بیان کر کے آنسو بہاتا......اماں ہم بھائیوں کو نہلا دُھلا کر کپڑے پہناتی جاتیں اور روتی جاتی تھیں......ہم ایک نامعلوم غم اور معلوم خوشی میں معلّق رہ جاتے۔''

سنجیدہ زندگی اور بالیدہ شاعری میں معلوم خوشی کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ نامعلوم غم

کی۔ ارسطو نے بھی اپنی کتاب ''بوطیقا'' میں جس قدر ٹریجڈی اوران کی اقسام پر فلسفیانہ باتیں کی ہیں کمیڈی پر نہیں۔ کوئی تو بات ہے کہ ناخدائے سخن حضرت میر تقی میر غم کو نشاطِ غم میں بدل دیتے ہیں اور غالب فلسفۂ غم میں اور جگر جیسا جذبہ کا شاعر بھی کہہ اٹھتا ہے۔

دل گیا رونقِ حیات گئی غم گیا ساری کائنات گئی

نقادانِ ادب فانی کے غم پر سوالات قائم کرتے ہیں، لیکن فانی نے ان غموں کے حوالے سے حیات و کائنات پر جو سوالات قائم کیے وہ کم سمجھے گئے۔ نامعلوم غم، اسرار حیات کے پردے چاک کرتا ہے تبھی شاعر ایسے شعر بھی کہتا ہے۔

یہ جہاں تجھ کو فقط وہم و گماں لگتا ہے
مجھ کو ہر ذرہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے

ذرہ میں جہاں اور قطرہ میں دجلہ دیکھنے والی ''چشم بینا'' دولتِ غم سے ہی مالا مال ہوتی ہے کہ شدتِ احساسِ غم چشمِ باطن کو وا کرتی ہے اور ایک جہانِ معنی سے دوچار کرتی ہے اور اگر اس چشم کو تصوّف کی کائنات مل جائے تو بقول اقبال۔

ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اچھی بات یہی ہوئی کہ میکش صاحب ابتدا ہی سے دولتِ غم اور چشمِ نم نے پہلے ''میکدہ'' پہنچایا کہ میکش کی منزلِ آخر میکدہ ہی ہوتی ہے۔ لیکن پھر نشۂ حقیقی انھیں ''حرفِ تمنا'' تک لے گیا اور پھر داستانِ شب تمام ہوئی۔ لیکن اس درمیان درسِ نظامیہ ہے۔ جامعہ الازہر ہے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ ہے اور پھر نوعمری میں ہی لکھی گئی جراٗت مندانہ تصنیف ''نغمہ اور اسلام'' ہے جس نے ہنگامہ برپا کر دیا اور تصوف کے گھرانے ترانے اور ٹھکانے قائم ہوئے لیکن میکش صاحب کی جرأت مندی یہ کہتی ہے:

''میری عمر کا بہترین حصہ علماء اور صوفیاء میں گذرا ہے۔
مجھے سب علماء اور صوفیوں سے حُسنِ ظن نہیں ہے......
صوفیوں کی اکثریت جاہل، غلط کار اور ریا کار ہے اور
علمائے ظاہر متعصب کوتاہ نظر اور کور باطن ہیں۔''

میکش صاحب نے حقیقی تصوف یا تصوف کے حقیقی و علمی تصورات و نظریات کو اپنایا اور ''مسائل تصوف'' جیسی اہم کتاب بھی لکھی۔ اقبال پر ان کی کتاب ''نقدِ اقبال'' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول پروفیسر عبدالحق:

> ''میکش صاحب نے اقبال کے صوفیانہ افکار کو ایک نئی
> تعبیر بخشی ہے جس سے اتفاق واختلاف کی گنجائش نکلتی
> ہے اس کے باوجود اس کتاب کی بیحد اہمیت ہے۔''

اس کتاب نے ایک نئے مفکر و صوفی اور فلسفی میکش کو پیش کیا۔ یہ کتاب ایک الگ گفتگو کا تقاضا رکھتی ہے، اس لیے آئندہ کسی مقالہ میں گفتگو کی جائے گی۔ پھر یہ بھی کہ میکش صاحب کی اصل شناخت تو ان کی شاعری ہے۔ صوفیانہ شاعری جہاں راز و نیاز کے جلوے اور پردے تو ہیں لیکن ان پردوں کے پیچھے عشق ہے، صرف عشق۔ عشق مجازی بھی اور حقیقی بھی۔ اپنی شاعری کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں شاعری کو محبت یا
> شاعری کو محبت سے علاحدہ کر کے بیان کرسکوں۔ ایسا
> نہیں ہے کہ میری شاعری میں محبت کے سوا کسی اور جذبہ
> کی نمائندگی نہیں ہے، لیکن حسن و محبت میری شاعری میں
> بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔''

اب میں یہاں ان کے چند عشقیہ لب و لہجہ اور محبت سے بھرے اشعار پیش کرتا ہوں۔

میں نہ دیکھوں تو ترے حسن کی قیمت کیا ہے
میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

☆

اور کون جانے گا تری بزم کے آداب
ہم نے دل دیا بھی ہے ہم نے دل لیا بھی ہے

☆

زباں پہ نامِ محبت بھی جرم تھا یعنی

ہم ان سے جرمِ محبت بھی بخشوا نہ سکے

☆

وہ گئے حشر جو اٹھاتے تھے

وہ نہیں ہیں تو کیوں قیامت ہے

☆

عجیب طرح محبت میں انقلاب ہوا

نگاہ شوق ہوئی اور شوق اضطراب ہوا

☆

برباد آرزو کو دیوانہ کہہ دیا ہے

اک لفظ کہہ کے تم نے افسانہ کہہ دیا ہے

اب میں ان کے چند متصوفانہ اشعار بھی پیش کرتا ہوں۔

یہ جہاں ایک نظر اور جہاں کچھ بھی نہیں

وہ جہاں صرف خبر اور خبر کچھ بھی نہیں

رنگ و بو کا یہ جہاں کارگہہ لالہ رخاں

دیکھنے میں تو بہت کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

☆

دل کی کچھ بات کریں تجھ سے یہاں آمیکش

تو مجھے واقفِ اسرارِ جہاں لگتا ہے

☆

زندگی میرے مسائل کے سوا اور بھی ہے

آج اس قلزمِ زخار کو دیکھا میں نے

☆

کوئی حق کہنے اب اس دور میں آئے شاید

نظر آتے ہیں خلاء میں کئی پتھر ٹھہرے

☆

ہم نے کر دیا آنکھوں پہ کچھ ایسا جادو

عین دریا میں بھی اپنی تو سرابوں میں کٹی

اور یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا۔

یہ جہاں تجھ کو فقط وہم و گماں لگتا ہے
مجھ کو ہر ذرّہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے

میکش زندگی بھر انھیں دونوں حقیقتوں کے درمیان رہے۔ ان کی شاعری انھیں غالب جذبات کا آئینہ بنی۔ ایک جگہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے:

''دو مختلف طاقتوں کی یہ کشمکش زندگی کی کسی منزل میں ختم نہ ہوگی۔ اسی کشمکش میں میری زندگی اور شاعری پھلتی پھولتی رہی۔ اسی میں مسائلِ حیات اور غمِ روزگار بھی شامل ہوتا گیا۔''

لیکن ایک عمدہ اور نازک بات میکش صاحب نے اور کہی:

''میرا خیال ہے کہ شاعر کو حقیقت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقت کو جس طرح سے محسوس کرتا ہے، جس طرح اثر پذیر ہوتا ہے اس کو بہترین الفاظ اور اندازِ بیان میں ظاہر کر دیتا ہے ورنہ صرف حقائق کا بیان شاعری نہیں ہے۔ غالباً شاعری اور فلسفے کا فرق اس طرح واضح ہو سکے۔''

یہی بات تصوّف کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ درد فانی، اصغر وغیرہ کی طرح محض فلسفہ اور تصوف کے شاعر نہ تھے۔ حسن کی معرفت، انسانوں سے محبت اور زندگی کی حقیقت، یہ سارے عناصر اندازِ میکش میں ڈھل گئے اور وارداتِ قلبی کا ناگزیر حصہ بن گئے۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ اگر ایک طرف خاندانی پس منظر تھا تو دوسری طرف عشق کا پاکیزہ و بالیدہ تصور بھی۔ ایک طرف فانی تھے تو دوسری طرف مانی (مانی جائسی)۔ ایک طرف جوش و جگر تھے تو دوسری طرف سیماب و اخضر بھی۔ ان شاعروں، شعری صحبتوں نے ایک صوفی جفاکش کو شاعر میکش بنانے میں بڑی مدد کی۔ خود اعتراف کیا ہے:

''ان بزرگوں نے اپنی صف میں شامل کر لیا۔ ان

صحبتوں کی داد اور بیداد میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی
تھی۔ مخصوص سخن فہمی اور مشاہیر شعراء کی ان بے تکلف
اور علمی صحبتوں میری انفرادیت کو ابھارا۔"

میکش صاحب کی شعری انفرادیت کیا ہے۔ اس تاثراتی اور یادگاری مضمون میں اس نوع کی تنقیدی بحث کی گنجائش نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میکش عالمِ باعمل تھے اور شاعر خوش فکر بھی۔ خوش نوائی، بذلہ سنجی اور عشق و عاشقی ان کی سرشت میں تھی۔ اگر ایک طرف ان کے صوفیانہ مزاج میں حیات و کائنات فنا و بقا کے گھیرے تھے تو دوسری طرف محبت کے دائرے بھی۔ ان سب کے حسین امتزاج سے ہی ان کی شخصیت اور شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ اسی لیے کہ میکش صاحب زاہدِ خشک نہ تھے اور نہ ہی شاعرِ بے لگام۔ شاعری بھی ان کے یہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور حسن پرستی عرفانِ کائنات۔ وہ میکش صرف محبوب کی ذات کے نہ تھے بلکہ نظارۂ کائنات کے اور اسرارِ حیات کے بھی۔ اسی لیے وہ دبستانِ اکبرآباد کے سب سے الگ قسم کے شاعر تھے۔ بلکہ ان کو کسی ایک دبستان یا عہد و زمانہ میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

اس انفرادیت و عظمت میں میکش کی اپنی عزلت پسندی اور حجاب انگیزی کا بھی دخل ہے، تھوڑی سی کم آمیزی کا۔ لیکن اس سے ان کی انسان دوستی، روشن خیالی اور عقل پرستی پر فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایک سچے انسان، اچھے شاعر اور عمدہ صوفی تھے۔ فیض نے غالباً ایسے ہی صوفیوں کو اصل کامریڈ کہا ہے۔ خود میکش کا یہ بیان بھی انھیں اشتراکیت کی حدوں میں لے آتا ہے:

"میں ہمیشہ ظلم و استحصال کے رہا ہوں اور ان تمام سیاسی
اور مذہبی نظریوں کا مخالف ہوں جو انسان کو انسان کے
آگے ذلیل ہونا سکھاتی ہیں اور جو انسانی خوف اور
ناانصافی پر اپنی بنیاد قائم کرتی ہیں۔" (غبارِ کارواں)

اس سے بڑی ترقی پسندی اور کیا ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ اصلاً و اوّلاً صوفیوں میں ہی پائی گئی، جہاں سے محبت یگانگت اور انسان دوستی کے سوتے پھوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے پورے

ملک و معاشرے کو شرابور کر گئے۔ اسی لیے کہا جا سکتا کہ میکش صرف ایک شخص یا شاعر نہ تھے بلکہ علم و فکر، شعر و سخن، اخلاق و تہذیب، تصوف اور تحمل کا ایک ایسا دبستان بلکہ چمنستان تھے جہاں سے صرف خوشبو ہی خوشبو پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہے اور میں اس ضعیفی اور کبر سنی میں بھی اس خیال اور خوشبو سے مسلسل معطر ہوتا رہا۔

تین سال رہ کر ۱۹۸۳ء میں اپنے وطن الہ آباد واپس آ گیا کہ مجھے میرے استاد پروفیسر سید محمد عقیل نے الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ کر دیا۔ میکش صاحب آٹھ سال اور زندہ رہے اور اپریل ۱۹۹۱ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس طرح ایک عالم کی موت سے ایک عالم کی موت ہو گئی۔

آج ان واقعات کو گذرے تیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، بہت کچھ بدل گیا۔ بے شمار سرد و گرم حالات آئے اور چلے گئے، لیکن میری زندگی کے وہ تین سال، آگرے کا قیام، جد و جہدِ ناتمام۔ میکش اکبر آبادی کی شفقت، شرافت اور ضیافت اور ایک نوجوان اجنبی کے تئیں غیر معمولی محبت و حمایت درسِ آمیت، شعر و ادب کی رمزیت نے آج بھی گھیرا ڈالا رکھا ہے اور یہ خیال کہ اکبر آباد اپنے آپ میں دبستان ہو یا نہ ہو لیکن حضرت میکش اکبر آبادی کی ذات صفات اپنے آپ میں ایک دبستان تھی۔ افسوس کہ اپریل ۹۱ء میں یہ چراغِ دبستان گُل ہو گیا اور اپنے ساتھ تاریخ و تہذیب شعر و سخن کی ایک طویل داستان بلکہ داستانِ شب چھوڑ گیا جو محض داستانِ شب نہ تھی بلکہ داستانِ حقیقت و معرفت بھی تھی۔ الوداعی ملاقات کر کے جب میں آگرہ سے الہ آباد چلا تو آل احمد سرور کے مصرعے گونج رہے تھے۔

آج میکش سے ملاقات میں معلوم ہوا
ہند میں صاحب عرفان ابھی باقی ہیں
لاکھ برباد سہی پھر بھی یہ ویراں تو نہیں
اس خرابے میں کچھ انسان ابھی باقی ہیں

□□□

قندیلِ محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم
(جگن ناتھ آزاد کی یاد میں)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں لکھنا تو کیا سوچتا بھی ہوں تو ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جن کی شخصیت کا رچاؤ اور ان کے کاموں کا پھیلاؤ اس قدر ہوتا ہے کہ اس کے دائرے میں سمٹ پانا مشکل کیا ناممکن سا ہوا کرتا ہے۔ ان کے بارے تاثرات بھی رقم کرتے ہوئے احترام اور ارتعاش باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کہ آزاد صاحب نہایت سادہ، شریف اور معصوم طبیعت کے مالک تھے اور بزرگوں، ہم عمروں اور خوردوں سے یکساں طور پر محبت کرتے کہ اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ اتنی بڑی شخصیت سے مل رہے ہیں۔ سادگی و شرافت کا اپنا ایک معیار و احترام ہوا کرتا ہے اس کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ان اوصاف کے لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح کے معنی کی معرفت رکھتے ہوں اور صرف معرفت ہی نہیں بلکہ کارزارِ حیات میں برملا دبے تکلف اس کا استعمال و اظہار کرنے پر بھی یقین رکھتے ہوں۔

جگن ناتھ آزاد کا ذکر ہم نے پہلی بار فراق صاحب کی زبانی سنا۔ فراق صاحب اقبال سے چڑھتے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ فراق صاحب ہر بڑی شخصیت سے چڑھتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ اقبال کا جب بھی ذکر نکلتا تو تلوک چند محروم کا بھی ذکر نکل آتا۔ وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں محروم کا ذکر کرتے۔ ہم اس وقت ایم۔اے۔ کے طالب علم تھے۔ نئے نئے فراق صاحب کی محفل میں ہی نہیں بلکہ ادب کی محفل میں بھی داخل ہوئے تھے۔ وہاں کی نزاکت و سیاست سے دور دور تک کی واقفیت نہ تھی۔ اس لئے بس سوچ کر ہی رہ گئے کہ جو شخص محروم ہے اور مرحوم بھی اسکا اس قدر مذاق کیوں؟ لیکن فراق کے مزاق و تمسخر کی بھی اپنی ایک ادا تھی اور اس کے دلچسپ و معنی خیز تذکرے ہم نے فراق صاحب کے گھر پر جگن ناتھ آزاد کے شعری مجموعے 'بیکراں' اور 'بوئے رمیدہ' کے نسخے دیکھے جس میں سے کسی ایک پر آزاد

صاحب کی دستخط تو تھی ہی فراق کے تئیں بے پناہ عقیدت کا اظہار بھی تھا۔ میں سوچتا تھا کہ شاعر نے اتنی عقیدت سے یہ مجموعے فراق صاحب کو پیش کیے ہیں اور فراق اسی شاعر کا مذاق اڑاتے پھر رہے ہیں۔ فراق صاحب کی یہ بات ہمیں پسند نہ آئی۔ لیکن اس کے باوجود فراق۔ فراق ہی تھے لیکن ہم نے یہ ضرور کیا کہ بیکراں کا نسخہ اٹھا لائے کہ فراق کو اس کی ضرورت نہیں۔ یہ نسخہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ حالانکہ یہ بھی ہوتا تھا کہ جب اصل فراق کھلتے تو یہ سب چیزیں بہت معمولی ہو جایا کرتیں۔ اسی لئے اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ہم محروم اور آزاد سے بددل نہ ہو سکے۔ محروم کے لئے یہی کیا کم قدر تھی کہ وہ اقبال کے ساتھیوں میں سے تھے اور آزاد اسی محروم کے بیٹے ہیں جنھوں اقبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کچی پکی عمر میں کچھ اس طرح کا کچا پکا احترام اپنے آپ جاگ چکا تھا۔

بیکراں کے پہلے ہی صفحہ پر میں نے بڑی حسرت سے جگن ناتھ آزاد کی دستخط کو دیکھا تھا۔ کس قدر اچھا لگا تھا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد آزاد صاحب جب یہ مجموعہ اپنی دستخط کے ساتھ مجھے عنایت کیا جس پر لکھا ہوا تھا ''عزیزم فاطمی کے لئے۔ یہ میرا پہلا مجموعہ کلام ہے میرے لئے اس کی محبوبیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ دعا گو جگن ناتھ آزاد.....''

تو بس ان جملوں کو پڑھتا ہی رہا۔ ماضی کے دریچے کھلتے ہی چلے گئے اور اس میں ایک نیک فرشتے کی دعاؤں کے ٹھنڈے جھونکے مشام جاں معطر کرتے ہی چلے گئے۔ کئی دہائیاں، اچانک ایک نقطہ پر آکر سمٹ گئیں اور آزاد صاحب دیو پیکر شخصیت ایک نورانی پیکر کی طرح دل و دماغ میں سماتی چلی گئی۔

جب ہم ریسرچ میں داخل ہوئے تو لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑی۔ ان دنوں الہ آباد میں بھی ایک اہم اور قدیم لائبریری تھی۔ قومی لائبریری جس کی ایک شاخ ادارہ انیس اردو بھی تھی جو کتابیں شائع کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے لئے میں اس کا منتظم بھی قرار پایا۔ تو میں نے دیکھا کہ اس ادارہ نے آزاد صاحب کی دو کتابیں شائع کی ہیں۔ پہلا ان کا شعری مجموعہ 'نوائے پریشاں' اور دوسری کتاب تھی 'اقبال اور اس کا عہد'' دوسری کتاب ۱۹۶۰ء میں پہلی بار چھپی۔ اس کتاب میں تین لکچر تھے۔ بظاہر پتلی معمولی سی کتاب جو صرف ۱۲۳ صفحات

مشتمل ہے۔ جس کی قیمت صرف تین روپے ہے۔ اور بقول فراق فی لکچر ایک روپیہ قیمت پڑتی ہے۔ تنقید کی کتاب ایک بار پڑھنی مشکل ہوتی ہے لیکن میں نے یہ کتاب کئی بار پڑھی، پورے ذوق وشوق سے پڑھی۔ میں ان مضامین کے بارے میں کبھی تفصیل سے عرض کروں گا۔ اس کتاب کے حرف اول میں آزاد صاحب کے یہ جملے دیکھئے:

''اسلام کی محبت اقبال کے رگ وریشے میں رچی ہوئی تھی۔ یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اول سے آخر تک نمایاں ہے لیکن یہ اقبال اور کلام اقبال سے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نہ ہی اس بناء پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر فرما سکتے ہیں۔ ملٹن، ڈانٹے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے اور تلسی داس اور ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عشق مذہب بنی نوع انساں تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے۔ ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جاسکتا ہے؟''

جہاں آزاد مذہبی فکر کی فراخدلی سے حمایت کرتے ہیں وہاں اس بات کے لئے بھی فکر مند ہیں کہ اقبال نے ہندوازم اور مغرب سے بہت کچھ لیا ہے اس پر بھی روشنی پڑنی چاہئے چنانچہ وہ بڑے اعتماد سے یہ بات کہتے ہیں:

''۱۸۵۷ء سے لے کر جبکہ ہماری شاعری میں پہلی بار سیاسی شعور کی جھلکیاں نظر آئیں آج تک شاید ہی کوئی اردو یا فارسی کا ہندوستانی شاعر ایسا نظر آئے جس نے قدیم بھارتی سنسکرت کو اس احترام کی نگاہ سے دیکھا ہو جیسے علامہ اقبال نے دیکھا ہے اور اس سے قدر فیض

حاصل کیا ہو جس قدر اقبال نے کیا ہے۔''

یہ آواز آزاد صاحب ہی اٹھا سکتے تھے اور غور سے دیکھا جائے تو اقبالیات سے متعلق ان کا سارا تنقیدی ادب اسی مرکز و محور پر زیادہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اتفاق و اختلاف، عقیدت و عداوت دونوں حوالوں سے اقبال کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف اقبال کے معتقدین و مفکرین اقبال کی شاعری کی فکری اساس اسلام کو قرار دیتے ہوئے انھیں شاعر اسلام یا مسلمانوں کا شاعر تسلیم کر رہے اور کروا رہے تھے تو دوسری طرف ترقی پسند نقاد و دانشور انھیں مذہبی شاعر سمجھ اور سمجھا کر ان کی فکر کو محدود و مشروط اور اپنے نظریہ کا مخالف سمجھ کر طرح طرح کے سوالات کھڑے کر رہے تھے۔ ابتدا میں ترقی پسند ادب میں سردار جعفری اور ممتاز حسین نے تو اقبال سے متعلق ایک اہم مضمون میں اس سوال کو ہی عنوان بنا دیا۔ ''کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں'' ایسے متصادم اور خطرناک ماحول ایک غیر مسلم شاعر اور دانشور کا یہ سوال بھی اٹھا دینا کہ کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں کس قدر جرأت مندانہ سوال اور خیال تھا۔ اور پھر تفصیل سے یہ بھی کہنا:

> ''اقبال کے بارے میں جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں اتنی باہر نہیں لکھی گئیں مختلف نقاد علم وفن نے اقبال کو اپنے اپنے انداز سے خراج تحسین بھی ادا کیا ہے اور ان کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ میں ان نقادوں کی تصانیف کے بارے میں یہاں کچھ زیادہ تفصیل سے کہنا مناسب نہیں خیال کرتا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور علامہ اقبال کی شاعری سے مجھے شغف ہوا ہے یہ کتابیں جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، میرے پیش نظر رہی ہیں۔ اور میں نے ان سے بقدر استطاعت فیض اٹھایا ہے لیکن یہاں اس خلش دل کو ظاہر نہ کرنا بھی اظہار حقیقت کے خلاف ہوگا کہ بعض

نقادان فن اقبال پر قلم اٹھا کر اقبال، اردو ادب اور برصغیر
ہندو پاکستان کے ساتھ بے انصافی کے مرتکب ہوئے
ہیں۔ اقبال کیا تھے اور ان کا پیغام کیا تھا یہ تو میں شاید چند
لفظوں میں یا ان مقالات میں جو میں آپ کے سامنے
پیش کر رہا ہوں بیان نہ کر سکوں لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ
اقبال کو جب چشم حقیقت سے ان کی نظم ونثر کے آئینے میں
دیکھتے ہیں تو اکثر و بیشتر غیر صحت مند نظریات سے جو ان
کے کلام کے ساتھ وابستہ کر دیے گئے ہیں ان کا قطعی کوئی
تعلق نظر نہیں آتا۔ اور ہمارے ادب کی بدقسمتی یہی ہے کہ
اقبال اپنے قدر دانوں کے ہاتھوں کچھ اس غلط انداز میں
پیش ہوئے ہیں کہ عامۃ الناس میں اقبال کے تعلق غلط
فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ہے۔"

(حرف اول)

پھر آگے چل کر آزاد صاحب نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اقبال کی شاعری میں ہندو اور ہندوستانی عناصر پیش کرنے نیز اقبال کا مغربی مفکرین سے رشتہ جوڑنے میں جو محنت کی بلکہ ساری عمر لگا اس نے میری تو کیا نہ جانے کتنوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ذہن ترقی پسندی کی طرف مائل تھا اس لئے فیض، فراق، جوش اور آزاد اردو یا ہندی اور ہندو یا مسلم کو الگ الگ کر کے دیکھنا سیکھا ہی نہیں، یہی ہمارا قصور ہے جس پر ہمیں ناز ہے اور اس ناز پروری میں آزاد صاحب کی شخصیت، شاعری کا بہت بڑا رول ہے۔ آج یہ اعتراف کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے۔

آپ غور کیجئے بیکراں کا مقدمہ وہ فراق لکھتے ہیں جو مذاق اڑاتے تھے وہ آخر میں یہ بھی کہتے ہیں:

"آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ

جاذب نظر اور سب سے زیادہ دلکش ہے وہ آزاد کی وہ
نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنع کا نام نہیں۔ زندگی کا
یہ خلوص ہی آزاد کی شاعری کا محرک اور خلاق ہے۔ آزاد
کے خیالات اور ان کے لہجے میں سچی انسانیت کوٹ
کوٹ کر بھری ہے اور ایں سعادت بہ زور بازو نیست۔"

فراق نے سچی بات لکھی ہے کہ آزاد کی فطرت میں شرافت اور انسانیت تھی۔ جو انھوں نے زور بازو سے حاصل نہیں کی تھی اور جسے فراق نے زور جادو سے حاصل کرنی چاہی تھی۔ لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ لیکن آزاد کا یہی وہ وصف ہے جو انھیں اچھا شاعر اور عمدہ مفکر اور دانشور بناتا ہے۔ محمد دین تاثیر لکھتے ہیں:

"جگن ناتھ آزاد کے مجموعہ کلام کا مطالعہ سے مجھ پر
ایک عجیب سی کیفیت گزری۔ میں نے یہ جانا یہ محسوس کیا
کہ جیسے تاریخ کا چکر الٹا گھوم رہا ہے۔ جیسے دنیا ارباب
سیاست کے ہاتھوں سے نکل کر اہل ادب کے
قبضۂ قدرت میں آ گئی ہے جیسے انسان ہیمت بھول گیا
ہے، انسان بن گیا ہے.... یہ ایک گداز طبیعت، دردمند
دل، حساس شخصیت کا کلام ہے ایک محبت کرنے والے
عالی ظرف دوست کی گفتار ہے جو بہت سی باتیں چشم سخن
اور جنبش ابرو سے کہہ جاتا ہے۔ وہ جسے بلاغت کہا جاتا
ہے۔ آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے۔ یعنی دل و دماغ
دونوں کا نور ہے۔ اس ہیجانی درو میں ادبی توازن کا
برقرار رکھنا بڑی عظمت کی نشانی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے
کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی۔"

قاضی عبدالغفار، علامہ سیماب اکبرآبادی، احتشام حسین وغیرہ سبھی نے آزاد کی

شرافت، انسانیت، شاعرانہ صداقت کی تعریف کی ہے۔ یہاں پر مجھے فرانس کے ایک بہت بڑے ناقد سین بیو کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ میں جب بھی کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو پہلے اس کتاب کی ادبی فنی وفکری محاسن پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مصنف کتنا اچھا آدمی ہے۔ اس قول پر یقین رکھنا میرے لیے مشکل ہے لیکن آزاد صاحب سے متعلق یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اقبالیات پر ان کے مضامین ایک خاص علمی وانسانی نظر سے شائع ہونے لگے اور وہ اقبال کی شاعری میں مسلمان سے زیادہ انسان کو تلاش کرنے لگے۔ (ملاحظہ کیجیے مضمون ''انسان اقبال کی نظر میں) تو سبھی سمجھدار اور روشن خیال لوگوں نے ان کی پذیرائی کی۔ عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری جو ایک خاص ذہن رکھتے تھے اور اتنی آسانی سے کسی کے نام اور کام کو قبولیت کا درجہ نہیں دیتے تھے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

> ''جگن ناتھ آزاد شاعر ہی اچھے نہیں ہیں بلکہ نثر کے بھی اچھے اور سلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں۔ اقبال پر ان کے لکچر، شعر، نقد ونظر اور اسلامیات کے طلباء کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ سلیس شگفتہ انداز میں باتیں خوب پتے کی کہہ گئے ہیں اور حقیقت تصوف وغیرہ کے سلسلے میں باتوں باتوں میں تو جابجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم کیا...... جگن ناتھ آزاد نہ صرف شاعر بلکہ نقد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اقبال ابتدا ہی سے ان کا محبوب شاعر رہا ہے۔ آزاد والہانہ حد تک اقبال کے مداح ہیں۔ لیکن ان کے مضامین میں ان کی شگفتگی نے کسی جگہ غیر منطقی شیفتگی کی صورت اختیار نہیں کی۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے جو کچھ ان مضامین میں لکھ دیا ہے وہ

اقبالیات میں اضافہ ہے، بڑا مستحسن اضافہ۔"

نیاز فتح پوری نے سچی بات لکھی ہے کہ آزاد اقبال سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اقبال پر ان کی تنقیدی تحریریں بعض تحریروں کا جواب ہو سکتی ہیں لیکن اس کا کیا کیجئے کہ بیکراں جب پہلی بار ۴۹ء میں شائع ہوتا ہے تو اس وقت تو آزاد نوجوان شاعر ہی تھے۔ وہ مجموعہ شروع ہوتا ہے اقبال کے چار فارسی مصرعوں سے۔

سحر در شاخسارِ بوستانے
چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالہ، آہے، فغانے

ماتم اقبال، نذر اقبال، آزاد اور اقبال جیسی نظموں کے علاوہ اس میں اقبال کی تضمین بھی ہیں۔ اقبال کی رحلت پر آزاد کا یہ درد بھی دیکھئے۔

اقبال اے جہان معنی کے تاجدار
اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار
معنی پہ تجھ کو فخر تخیل پہ تجھ کو ناز
نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار
آتش کا سوز، گل کی مہک، برق کی تڑپ
سو جاں سے ہو گئے تری تخئیل پہ نثار
تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا
تیرے نفس نے دل چمن شعر کو بہار
دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی
شہرت پہ تیری تنگ تھا دامان روزگار
گو زیر خاک کالبد خاک آ گیا
تو روح بن کے عالم جاں میں سما گیا

یہ وہ دور تھا جب آزاد پر اضمحلال طاری تھا۔ اقبال کی رحلت، ہندو مسلمان کے جھگڑے جو تقسیم ہند تک خونریز شکل اختیار کر گئے۔ ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ ہندو پاک کے حوالے سے بظاہر ہندو مسلم الگ الگ ہو گئے۔ اقبال شاعرِ پاکستان قرار دیے گئے تو آزاد کا کرب ان اشعار میں چھلک پڑا۔

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنائیں بھی تو کیا ہوگا
چمن بدلا، چمن کا رنگ بدلا، باغباں بدلے
یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا
جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں
وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا
خرد دشمن، جہالت آفریں ماحول میں اے دل
ترانے ہم تمدن کے جو گائیں بھی تو کیا ہوگا

یا غزل کے یہ اشعار

دنیا میں مجھ کو جنس وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاش گہر کر رہا ہوں میں
اب لطف صبح و شام گیا صبح و شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں

ایسے تکلیف دہ موقع پر بھی وہ اقبال کی شاعری سے الگ نہ ہو سکے۔ بلکہ اقبال کی حرارت انگیز اور انسانیت آموز شاعری نے ہی ان کو سہارا دیا۔ انھیں دنوں ایک شعری مجموعہ کا انتساب اقبال کے نام پر کرتے ہوئے انھوں نے یہ اشعار کہے۔

مجھے شکایت بے مائیگی نہیں ہرگز
کہ آشنا ہے ترے خم سے ذوقِ خام مرا

لٹائی تھی جو کبھی ساقیِ سخن تو نے
اسی شراب سے ہے مستفیض جام مرا
ترے کلام نے بخشا مجھے مذاقِ سخن
ہے تیری نذر یہ مجموعۂ کلام مرا

یہیں سے آزاد کی شاعری کا تیور اور آہنگ بدل جاتا ہے۔ ان کی غزلوں و نظموں میں سنجیدہ، معیاری اور امید و نشاط سے پُر اشعار نظر آنے لگتے ہیں مثلاً

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا
عشق کے حضور میں سرخرو تو ہو گئے
دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا
مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے
کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

آزاد کی شاعری کے زیر و بم اور کیف و کم تو بعد میں سمجھ میں آئے اور مزید سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن کچھ لوگوں کو تو وہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ آزاد کو ایک دردمند شاعر سمجھنے اور اقبال کی ایک نہایت بنیادی اور اہم تصویر پیش کرنے والے ماہر اقبال کے بجائے تلوک چند محروم کا بیٹا اور ایک ہندو شاعر ہی سمجھتے رہے۔ اس سے آگے انھوں نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی لیکن سمجھداروں اور ترقی پسندوں نے ایسا نہیں کیا اور انھیں ایک تابناک علامت سمجھ کر گلے سے لگا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صف میں آزاد کا نام سردار جعفری، مجروح، تاباں، کیفی وغیرہ کی صف میں لیا گیا اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جب کبھی انجمن کی کانفرنس ہوئی آزاد صاحب کو بلایا گیا اور اگلی صف میں بیٹھایا گیا کہ وہ ہماری فکر و نظر کے ہی نہیں ہماری پریم چند کی روایت کے امین تھے وارث اور امانت دار۔ پاسدار اور وضعدار۔

انھیں کانفرنسوں میں، جلسوں میں، سیمیناروں میں آزاد صاحب سے بے شمار

ملاقاتیں ہوئیں۔ جس کا تفصیلی ذکر اس مقالے میں ممکن نہیں۔ یہاں صرف دو ملاقاتوں کا ہی ذکر کروں گا۔ ۱۹۹۴ء میں ہم لوگوں نے الہ آباد میں اپنے محبوب ترقی پسند شاعر عالی سردار جعفری کی ۸۰ ویں سالگرہ جشن سردار جعفری کے طور پر منانے کا ارادہ کیا۔ جعفری صاحب سے مشورہ کیا تو انھوں نے نہایت محبت سے آزاد صاحب کا نام لیا کہ انھیں ضرور بلایا جائے۔ ہم نے آزاد صاحب کو بلایا اور آزاد صاحب بالکل ویسے ہی آئے جیسے پریم چند لکھنؤ کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ زیادہ سامان، نہ تزک واحتشام، ہم نے سامان اٹھایا تو وہی بزرگوں والا مشفقانہ لہجہ جیتے رہئے۔ نہ کسی طرح کا تکلف نہ کوئی فرمائش۔ سادگی، شرافت اور انسانیت نے آزاد صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب سا نور بھر دیا تھا۔ وہ نور جوان کی شاعری میں ان کی تحریر و تنقید میں تو تھا ہی ان کے اخلاق وآداب، رویوں اور طور طریقوں میں بھی بھرا ہوا تھا۔ ان سے ملتے وقت صاف ایسا لگتا تھا کہ آپ اپنے ہی خاندان کے کسی مشفق و مہربان بزرگ سے مل رہے ہوں۔ مسکراتا ہوا سادہ سا بے تکلف انداز ان کی شخصیت میں جاذبیت در چاؤ بھر دیتا اور جب وہ اسی رچاؤ و بہاؤ میں اقبال، جوش وغیرہ کا ذکر کرتے تو جی چاہتا کہ بس سنتے ہی چلے جائیں وہ ان سب کا اس طرح ذکر کرتے جیسے اپنے اجداد کا ذکر کر رہے ہیں۔ سردار جعفری سے بھی ان کی بیحد عقیدت د محبت تھی اور وہ اسی عقیدت کے تحت خرابی صحت کے باوجود جموں سے سفر طے کرتے ہوئے الہ آباد آئے تھے۔ اور جس طرح یہ دونوں فنکار یعنی سردار جعفری اور جگن ناتھ آزاد ایک دوسرے سے ملے بغل گیر ہوئے وہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ بغلگیری صرف دو افراد کی نہ تھی بلکہ دو تہذیبوں کی اور دو عظمتوں کی بغلگیری تھی اور دو اقبالیوں کی بھی۔ ایک ہی عہد کے دو بڑے فنکار جنھوں نے اپنے خون جگر سے کثرت کو وحدت میں اور وحدت کو کثرت میں بدل دیا تھا۔ اشتراک کا یہ جلوہ وہ دونوں پورے ملک میں ہی نہیں پوری دنیا میں دیکھنا چاہتے تھے اسی لئے یہ اشتراکی تھے۔ سردار زیادہ آزاد نسبتاً کم۔ سردار کی اشتراکیت مارکسیت کے حوالے سے تھی اور آزاد کی انسانیت کے حوالے سے۔ اور جب میں نے جشن سردار جعفری میں آزاد صاحب کو مائک پر مدعو کرتے ہوئے انھیں قومی و تہذیبی رشتوں کا ذکر کیا

تو وہ خوش ہوئے اور کہا:

> ''فاطمی صاحب نے درست فرمایا ہے کہ میرے اور جعفری صاحب کے مراسم دوستانہ اور برادرانہ ہیں اور وہ بھی بہت پرانے...... حضرات آج جو یہ جشن ہو رہا ہے یہ صحیح ہے کہ یہ جشن جعفری صاحب کا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ ہمارا جشن ہے۔ اردو ادب کا جشن، اردو تہذیب کا جشن ہے اردو ادب کے دولہا کا جشن ہے۔''

اخر میں انھوں نے غالب کا یہ شعر بھی پڑھا۔

ترے جواہر طرح کلاہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اردو ہندی کے ادیبوں، دانشوروں کے اس بڑے اجتماع میں ہم نے دوسرے دن ''ہندوستان کی مشترکہ تہذیب'' کے عنوان پر مذاکرہ بھی کیا جس میں علی سردار جعفری، بشمبھر ناتھ پانڈے۔ پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی، پروفیسر اگوانی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بیحد معیاری تقریر و تحریر پیش کیا۔ آزاد صاحب نے ہندو دھرم اور بودھ دھرم کی دھاراؤں کے بعد کہا:

> ''ان دو ملتے جلتے دھاراؤں میں تیسری عظیم دھارا جو آکر ملی وہ اسلامی تہذیب کی دھارا ہے۔ اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو بے پناہ شعور حسن دیا جو مختلف ثقافتوں اور فنون لطیفہ میں ظاہر ہوا۔''

پھر وہ اس کی تفصیل میں چلے گئے۔ مسلمانوں کی حکومت کا ذکر کیا اس کے بعد اس کے نظارے اردو شعر و ادب میں پیش کئے اور نظیر، اقبال، جوش کے نمونے بھی پیش کئے اور ایک طویل تہذیبی و ثقافتی وحدت کے بارے میں وہ یہ ایک بلیغ اشارے بھی کر گئے:

> ''نظیر نے اپنی نظموں میں جو کچھ کہا اسے مذہبی نہیں

خالص تہذیبی رخ کہہ سکتے ہیں۔ یہ نظیر کی روشن خیالی کی
ایک دلیل ہے۔ نظیر نے اٹھارہویں صدی میں جس
ارتقائی مہذب شعور کی بنیاد ڈالی وہی شعور مختلف پڑاؤ
طے کرتا ہوا دو سو سال کے بعد اقبال اور جواہر لعل نہرو
کے حصہ میں آیا۔ اقبال نے جاوید نامہ میں شیو جی
مہارج کو قدیم ہندوستانی تہذیب کے نمائندہ کی شکل میں
دیکھا یا مثنوی میں گنگا کے بارے میں ہمالہ کے منہ سے
کہلایا کہ گنگا شیو جی کی جٹاؤں سے نکلی ہے تو صرف وہ
ہندو دیو مالائی تصور کو ایک پہلو کو نظم نہیں کر رہے تھے بلکہ
اس کے مدنظر اس کثرت کی وحدت کو اجاگر کرنا تھا جس
نے مختلف عقائد کے ماننے والوں کے اختلاف کے
باوجود اندرونی یکرنگی ناگزیر ہے۔''

پھر انھوں نے اردو شاعری سے اتنی مثالیں دیں کہ ہم ان کے معلومات اور حافظہ پر حیران ہو گئے۔ اس دن بشمبھر ناتھ پانڈے اور جگن ناتھ آزاد کی تقریروں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اس کی زلفوں کے اسیر کچھ ہندو بھی ہیں جنھوں نے اپنی تپسیا، بھاؤنا اور اپاسنا سے اردو کا دامن کس قدر مالا مال کیا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو شاید جوش بھی یہ نہ کہتے۔

آب و گل ہند سے ہوں اردو ہندی ہوں
نسل آدم سے ہوں اور انسان ہوں میں

اور حسرت موہانی بھی یہ نہ کہتے۔

متھرا سے اہل دل کو وہ آتی ہے بوئے انس
دنیا جہاں میں شور ہے جس کے دوام کا

اب ذرا آزاد کی اس نظم کو بھی ملاحظہ کیجیے جس کا عنوان اردو ہے جو بے پناہ مقبول ہوئی جس کے نہ جانے کتنے ایڈیشن چھپ چکے ہیں، چند شعر دیکھیے۔

ریاض دہر میں اردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے
جسے خون جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے
مرے اہل وطن یہ آدمیت کا تقاضا ہے
محبت کا، حمیت کا، شرافت کا تقاضا ہے
کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو
خزاں کے دور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اس کو
وطن بھی ایک ہے اپنا زباں بھی ایک ہو اپنی
چمن جب ایک ہے طرزِ بیاں بھی ایک ہو اپنی

اقبال کو پڑھنے سمجھنے اور اتنے کام کرنے کا مزاج و مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کو صرف اردو کا مسلمان شاعر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے انھوں نے اپنی زندگی تلاشِ اقبال اور عرفانِ اقبال میں صرف کردی اور صاف طور پر کہا کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں، اقبال ایشیا کی بیداری کے شاعر ہیں اور اقبال عالم انسانیت کے شاعر ہیں۔

میں جب بھی اقبال سے متعلق ان کے کاموں کی فہرست اور مقدار دیکھتا ہوں تو حیرت و مسرت کا احساس تو ہوتا ہی ہے اور یہ خیال بھی ابھرتا ہے کہ آزادی کے بعد معروضی انداز سے اقبال پر اتنا کام مسلم مفکرین و دانشور کیوں نہیں کر سکے۔ آزاد کہتے ضرور رہے کہ آزادی کے بعد اقبال پر آل احمد سرور نے بہت کام کیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنا نام کس طرح لیتے لیکن سچ یہی ہے کہ اقبال پر آزاد کا کام سب سے زیادہ ہے۔ سرور اور سردار سے بھی زیادہ۔ وہ شعرِ اقبال اور جہانِ اقبال میں سانس لیتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے اقبال کا ذکر کرتے اور کوئی نہ کوئی نکتہ نکالتے رہتے۔ اس کا عجیب وغریب تجربہ مجھے لندن اور برمنگھم میں ہوا۔

۱۹۹۸ء میں جوش اکادمی لندن نے انٹرنیشنل جوش سیمینار کا انعقاد کیا۔ میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میرے لندن پہنچنے کے چند دنوں بعد آزاد صاحب، خلیق انجم اور

پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی آنے والے تھے۔ میں اقبال مرزا اور عاشور کاظمی ان لوگوں کو لینے ایرپورٹ گئے۔ آزاد صاحب کے پاس سامان کم تھا کتابیں زیادہ تھیں۔ جوش سیمینار میں آزاد صاحب کا جس طرح استقبال کیا گیا اور انھوں نے جوش پر جتنی محبت وعقیدت سے بھری تقریر کی وہ ایک الگ داستان ہے جسے پھر کبھی لکھوں گا۔ پھر ہم لندن سے برمنگھم گئے۔ عاشور صاحب کی گاڑی پر سوار ہم نے یہ سفر بذریعہ سڑک کیا۔ میں کار میں آزاد صاحب کے بالکل بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے قربت اور محبت کا ماحول پا کر اقبال کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اقبال ان کی کمزوری تھے۔ اقبال اکثر مسلمانوں کی کمزوری تو نظر آئے لیکن اقبال ایک ہندو کی کمزوری۔ یہ مثال تنہا جگن ناتھ آزاد کی ہی تھی۔ میرے سوال پر تو کچھ دیر انھوں نے اپنی دو ایک ملاقاتوں اور اس سے متعلق خوف واحترام کا ذکر کیا۔ اس کے بعد وہ اقبال کے اشعار گنگنانے لگے۔ غزل کے اشعار سنانے کی حد تک تو مجھے زیادہ حیرت نہ تھی لیکن جب انھوں نے خضر راہ نظم سنانی شروع کی تو بس سناتے ہی چلے گئے۔ میں حیران وششدر۔ آزاد صاحب کا یہ روپ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے تقریباً کانپتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ کو پوری نظم یاد ہے؟''

''پوری نظم۔ ایک زمانہ تھا جب اقبال کا پورا کلام حفظ تھا۔ جھوم جھوم کر پڑھتا تھا۔ لوگ مجھے حافظ اقبال کہتے تھے۔ وہ کیا آہنگ ہے، بس پڑھتے ہی چلے جایئے۔''

ان کے اس جواب میں سرشاری تھی۔ ایک عجیب سی وجدانی کیفیت۔ وہ پھر گنگنانے لگے۔ تقریباً جھومنے لگے۔ پھر وہ اپنے ماضی میں کھو گئے۔ اپنے والد کو یاد کیا اور پھر اقبال کو بھی یاد کیا اور اس طرح عقیدت سے علامہ کا نام لیا جیسے کوئی عقیدت مند مسلمان کسی بزرگ وصوفی کا نام لیتا ہے۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ بیحد جذباتی ہو گئے تھے۔ پھر کچھ باتیں انھوں نے اقبال کے خطبۂ الہ آباد سے متعلق کیں پھر جلد ہی برمنگھم آ گیا۔ ہم کئی روز ایک مکان میں ایک ساتھ رہے۔ یادگار

صحبتیں، یادگار لمحے۔ آزاد صاحب کی زبان پر ہمہ وقت اقبال کا نام ہوتا یا جوش کا۔ برمنگھم یونیورسٹی میں ان کا استقبالیہ بھی ہوا۔ یہاں بھی میں نے آزاد صاحب کی مقبولیت دیکھی تو رشک آیا۔ اسی استقبالیہ میں میں نے آزاد صاحب سے متعلق ایک چھوٹی سی تقریر کی جسے آزاد صاحب اور سامعین نے پسند کیا۔ آزاد صاحب کی اس بے پناہ مقبولیت کے پیچھے اقبال پر بے پناہ کام کرنے کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ہی ان کی شاعرانہ شخصیت شریفانہ طبیعت کا بھی دخل تھا جس کی وجہ سے پوری دنیا میں ان کی مقبولیت تھی۔ پاکستان میں بھی جہاں اردو کے غیر مسلم ادیب و شاعر ذرا کم کم ہی مقبول ہو پاتے ہیں لیکن آزاد صاحب کی بات اور تھی۔ اول تو ان کا اصل وطن ہی پاکستان تھا۔ دوئم ان کی خدمت اور مقبولیت نے ساری حدیں توڑ دی تھیں۔ مشفق خواجہ کے یہ جملے دیکھئے:

> ”جگن آزاد ہندوستان کے ان ڈیڑھ دو شاعروں میں سے ہیں جو پاکستان میں بیحد مقبول ہیں۔ وہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال پاکستان ضرور تشریف لاتے ہیں۔ کبھی مشاعرہ میں شرکت کے لئے اور کبھی علامہ اقبال کے حوالے سے کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنے کے لئے یہاں آتے ہی وہ تبرک کی طرح تقسیم ہونے لگتے ہیں.....وہ صرف شاعر نہیں پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں۔ اسی لئے ہر محفل میں گفتگو بھی خوب کرتے ہیں اور گفتگو بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کا تو انھیں پورا کلام حفظ ہے۔“

کم و بیش یہی صورت برمنگھم میں دیکھی۔ ایک عقیدت مند نے ان کی باقی ماندہ کتابوں کو منہ مانگے داموں سے خرید لیا۔ اور وہ ان داموں کو پرانے بزرگوں کی طرح ایک پوٹلی میں دبائے رکھتے کہ گھر جا کر انھی یہ رقم بیگم کے حوالے کرنی تھی۔ آزاد صاحب کی غیر معمولی مقبولیت میں ان کا علم تو کام کرتا ہی تھا، ان کا اخلاق، ان کا شریفانہ و مشفقانہ لہجہ بھی بہت اثر رکھتا تھا۔

میں نے جب نیا سفر نکالنا شروع کیا تو جن چند بزرگوں نے واقعی ہمت افزائی کی ان میں آزاد صاحب خاص تھے۔ اپنا کلام بھیجتے جو تقریباً ہر شمارہ میں شائع ہوتا۔ فراق، جوش پر مضامین بھی عنایت کئے۔ ایسے ایسے خط لکھتے کہ میں پڑھ کر شرمندہ ہو جاتا۔ ایک بار جب میں نے بھوپال میں اقبال کے خطبہ الٰہ آباد پر تفصیلی مقالہ پڑھا جو لوگوں کو پسند آیا اس کی خبر آزاد صاحب تک پہنچی تو انھوں نے فوراً خط لکھا:

"عزیزم
آپ کے مضمون بسلسلہ خطبۂ الٰہ آباد کے بڑے چرچے ہیں۔ مجھے بھی بھوپال آنا تھا لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔ مقالہ سے محرومی رہی اگر مناسب سمجھیں تو اس کی نقل بھیج دیں۔ پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔"

جگن ناتھ آزاد

میرے جیسے کم علم کم عمر کے لئے یہ خط ایک یادگار ہے۔ جو آج بھی میرے پاس تبرک کی طرح محفوظ ہے۔ اسی طرح انھوں نے میرا مضمون آل احمد سرور کی اقبال شناسی بھی پڑھ لیا اور خوش ہو کر خط لکھا۔ پھر شفقت بھرا ایک خط ایسا بھی لکھا جس میں یہ خاکسارانہ اظہار بھی تھا کہ انھوں نے بھی اقبال پر کچھ کام کیا ہے۔ یہ خط پا کر مجھے شرمندگی ہوئی کہ مجھے آزاد کی اقبال شناسی پر بھی مضمون لکھنا چاہئے اس لئے میں نے ذہن بنایا لیکن جب اقبال پر ان کی کتاب اور مضامین کی فہرست دیکھی تو دہل گیا اور ہمت چھوٹ گئی لیکن خواہش ضرور رہی کہ ان کی زندگی میں ایک مضمون ان پر ضرور لکھوں خواہ وہ اقبال شناسی کے بارے میں ہو یا قدر شناسی کے بارے میں لیکن افسوس کہ آزاد صاحب کے تعلق سے جہاں اتنی قربتیں اور سعادتیں نصیب آئیں، اس سعادت سے محروم رہا۔

آزاد صاحب کا جو آخری خط میرے پاس ہے اس علالت اور خرابی صحت کا ذکر زیادہ ہے لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی صحت کے بگڑنے کا ملال تھا۔ گجرات کے حادثے نے

ان کا دل توڑ دیا تھا۔ اس حادثہ پر انھوں نے ایک کربناک نظم کہی ہے جس میں ان کا مکمل دردسمٹ آیا ہے۔ وہ ملی جلی معاشرتی زندگی کے پروردہ تھے۔ توصب وفرقہ واریت سے کوسوں دور تھے اور ہندوستان ان سب کی چپیٹ میں ہے اس لئے وہ تقریباً چیخ پڑے تھے۔

اے مسافر دیکھنے آیا ہے کیا اس دیس میں
عورتوں کا قتل بچوں کا لہو بہتا ہوا

زندگی سے اب تو اے آزاد شرم آنے لگی
میں بھی آ کر عمر کے کس دور میں رسوا ہوا

اپنی پینسٹھ، ستر سالہ ادبی زندگی آزاد صاحب نے اردو زبان وادب کئی طرح سے مالا مل کیا۔ بے پناہ جواہر پارے دیے۔ تقریباً بارہ تیرہ شعری مجموعے۔ کم وبیش اتنا ہی اقبال پر بھی لکھا اس کے علاوہ بے پناہ مضامین لکھے جن میں سب سے زیادہ مضامین اقبال پر ہی ہیں اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر ہونے سے بچایا اسی لئے ان کو حافظِ اقبال کے علاوہ محافظ اقبال بھی کہا گیا۔ انھوں نے اقبال ہی نہیں اردو زبان کو بھی صرف مسلمانوں کی ہونے سے بچایا۔ انھوں نے عین ۴۷ء کے فسادات کے زمانہ میں اردو پر جو نظم کہی اس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کا خیال تھا کہ یہ نظم غیب کی آواز ہے۔ زندگی کی ایک نوید ہے۔ شاید اسی لئے شاعری کو پیغمبری کا جز کہا جاتا ہے۔

ایسی غیبی طاقت اور نوید ی پیغام دینے والا ہمارا یہ محبوب شاعر، فنکار ہمارے درمیان سے رخصت ہو گیا۔ موت تو سبھی کو آنی ہے لیکن جگن ناتھ آزاد کی موت صرف ایک شخص کی یا فرد کی موت نہیں ہے بلکہ ایک تاریخ اور تہذیب کی موت ہے۔ ہماری مشترکہ تہذیبی روایت کی موت ہے۔ بڑے خیالات، شرافت اور انسانیت کی موت ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے قدیمی کلاسیکی رنگ شاعری، سخن سنجی روٹھ گئی اور اقبال شناسی کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ آج آزاد صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے غیر معمولی کارنامے

محبت بھری دداستانیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ مجھے تو آج بھی ایسا لگ رہا ہے کہ وہ میرے سامنے بیٹھے اقبال اور جوش کا والہانہ ذکر کر رہے ہیں اور نم آنکھوں کے ساتھ اپنے یہ اشعار گنگنا رہے ہیں۔

یوں اک سبق مہر و وفا چھوڑ گئے ہم
ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گئے ہم
دنیا ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حسنِ بیاں حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم
ماحول کی ظلمات میں جس راہ سے گزرے
قندیلِ محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم

□□□

سب دیئے روشن تمھارے نام کے

(مجروح سلطان پوری)

مجروح سلطان پوری کی شاعری پر تو کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے لیکن شخصیت پر لکھا جانا معمولی بات نہیں۔ اس لئے کہ بقول ظ. انصاری ''میں نے انھیں دور سے دیکھا، نزدیک سے دیکھا، اینگل بدل بدل کر دیکھا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ذاتِ شریف آسانی سے گرفت میں آنے والی نہیں۔'' ظ. انصاری ہی کیا نجانے اور کتنے مردم شناس مجروح پر سوچتے سوچتے گھائل ہو گئے، نجانے کتنوں کو خود مجروح نے اپنی حق گوئی بے باکی سے گھائل کیا۔ لیکن وہ موافقت کیا، مخالفت میں بھی نہ لکھ سکے۔ کیا اس کی وجہ صرف یہ کہ ان کی شاعری کا سرمایہ کم ہے یا کہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف گو، کڑواہٹ کے قریب تیکھے، ٹیڑھے اور بانکے تھے۔ یہ سب کچھ طے کر پانا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ان کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت کی بھی اتنی تہیں، اتنی پرتیں یا شاید اس سے زیادہ ہیں کہ کم از کم مجھ جیسے غیر مردم شناس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی شخصیت کو مکمل طور پر سمیٹ سکے۔ بس کچھ اشارے ہی کئے جا سکتے ہیں، یا کچھ سوال اٹھائے جا سکتے ہیں۔

میری ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ میں ان کے قریب ہو کر بھی دور تھا۔ وہ بزرگ میں خورد، وہ اعلیٰ میں ادنیٰ، وہ بیحد مشہور میں گمنام، وہ ممبئی میں اور میں الہ آباد میں۔ اس لئے ملاقاتوں کے مواقع کم ملے لیکن جتنے ملے جیسے ملے کم از کم میری سطح پر یادگار اور لازوال ثابت ہوئے۔ گہرے نقوش ثبت ہوئے۔ خوش وہ بھی ہوتے تھے اس لئے کہ ہم میں ایک رشتہ تو تھا ہی ترقی پسندی کا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا یا اس کو یوں کہئے کہ فکر و نظر کا۔ ان کے ترقی پسند شاعر ہونے میں کس کو شبہ۔ میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، محمد حسن، سید محمد عقیل، قمر رئیس، اجمل اجملی وغیرہ کی صحبت و تربیت میں نیا نیا انجمن میں شامل ہوا تھا۔ جوشیلے وانقلابی خیالات تھے۔ تبدیلی و ترقی پر یقین رکھتا تھا اور اس ضمن میں زبان کی توڑ

چھوڑ کو بھی کسی حد تک جائز قرار دیتا تھا لیکن مجروح اگلے گروپ کے شاعر ہیں وہ اپنی تمام تر ترقی پسندی، روشن خیالی کے باوجود زبان کی قدامت، کلاسکیت اور طہارت کے قائل تھے۔ وہ ترقی پسند شاعروں کے اس گروہ میں شامل ہیں جو قدیم استعارہ، قدیم زبان اور کلاسیکی اظہار کو کافی سمجھتا ہے کہ یہی زبان قابل بھروسہ اور موثر ہے اور روایت سے گندھا ہوا ہونے کی وجہ سے آزمودہ بھی۔ حالانکہ ترقی پسندوں کا ایک گروپ اس سے اختلاف رکھتا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ قدیم شعری استعارے اب نئے اظہار کے لئے ناکافی ہیں اور اب جدید استعارے کا تراشنا از حد ضروری ہے۔ مجروح صاحب اکثر اپنے قبیل کے ایسے شاعروں کی بعن طعن کرتے اور احمد فراز، قتیل شفائی، ندا فاضلی وغیرہ سے اکثر اسی لئے ناراض رہتے کہ ان کو شاعری کی زبان نہیں آتی۔ ایک بار میں نے الہ آباد کے ایک شاعر دوست کے شعری مجموعہ کے سلسلہ میں لکھنے کی سفارش کی تو انھوں نے شاعری کی زبان اور الفاظ کے دروبست کے بارے میں بلیغ باتیں لکھیں اور معذرت کرلی۔ انھوں نے لکھا:

> ''میں نے آپ کے دوست کا کلام دیکھا ان کے اشعار کے مصرعے بیش از بیش مصرعے نہیں ہیں موزوں فقرے ہیں۔ یعنی حرف کے نیچے جو دبی دبی نغمگی لفظ کو شعریت کا رنگ عطا کرتی ہے اس کا فقدان ہے۔ یہ دو طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ یا تو بات سادگی سے کہی جائے تو اسلوب کچھ ایسا ہو کہ جی کو لگے اس کے لئے نشست الفاظ کا سلیقہ چاہئے۔ میر کے مصرعے ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا، کو ہمارے آگے ترا نام جب کسو نے لیا، لکھیں تو لفظ اگرچہ میر کے ہی ہیں مگر نشست الفاظ سیم ہونے کی وجہ سے مصرعہ غارت ہو گیا۔ دوسری صورت کنائے اور اشارے میں تازگی کی ہے۔ علامت جانی پہچانی سہی یعنی طرز بیان ایسا ہو کہ بات سنی

سنائی لگنے کے باوجود بھلی لگے۔ تیسری شکل ایک ایسی بھی ہے جس میں بات کچھ اتنی نئی ہو کہ آدمی سنے تو متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری شکل کی مثال دینی بھول گیا۔ دیکھئے میر کہتے ہیں دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا۔ تو یہ وہی بات ہے جو ان سے پہلے ہزاروں بار کہی گئی ہے پھر بھی مصرعہ دل کو بھلا لگتا ہے۔ مگر اسی طرح کی کہی ہوئی باتیں اگر دہراتے رہتے تو میر صاحب میر تقی میر نہ بن سکتے کہ انھیں جدت طرازیوں نے انھیں میر بنایا ہے۔ تیسری بات کی مثال اقبال کے مصرعہ سے لیجئے ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں'' مصرعہ دامن کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ مگر کہیں اور یہ ''چیریں'' کا لفظ ناگوار بھی گزرتا ہے۔ مثلاً آپ ہیں خنجر آزما مشہور، آپ کیوں نہ میرا دل چیریں۔ یہاں یہ لفظ بدمذاقی کی حد تک ناگوار ہے.......''

(خط سے اقتباس)

شمس الرحمن فاروقی سے بھی وہ اسی لئے ناراض رہتے تھے کہ ان کی امت زبان بگاڑ رہی ہے۔ جس کے جواب میں فاروقی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ جو غلط زبان لکھے وہ میری امت میں نہیں ہے۔ حالانکہ اکثر ذاتی گفتگو میں فاروقی صاحب نے زبان کے بدلنے اور بگڑنے کے معاملات کو فراخدلی سے لیا ہے اور کہا کہ کل یہ لہجہ عوام میں قابل قبول ہو جائے تو ہمیں بھی قبول کر لینا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے زبان کا معاملہ تنگ نظری سے لیا جائے یا فراخدلی سے اپنے آپ میں پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی پیچیدگی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس پر ''شرفاء'' کی زبان و تہذیب کا اثر کچھ زیادہ ہی رہا ہے اور جو ایک خاص معنوں میں شریف ہوتے ہیں وہ کسی طرح کی تبدیلی ہو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ سردار جعفری نے انٹرویو

میں اچھی بات کہی ہے:

''آپ اسے اردو کی خوش نصیبی کہئے یا بد نصیبی کہ
ہماری زبان اس طرح عوام کی زبان نہیں رہی جس طرح
دوسری زبانیں عوام سے قریب رہی ہیں۔ ہمارے
یہاں شاعری کی زبان کسانوں کی بول چال کی زبان
سے مختلف رہی ہے اس پر شرفاء اور کلچر کے اثرات کچھ
زیادہ ہی غالب رہے ہیں۔ لہٰذا شرفاء کا تہذیبی انجماد۔
ذہنی انجماد اور روحانی کلاسیکل شاعری میں اتر آیا ہے۔''
(گفتگو۔ کراچی، ص ۱۶)

ان کی فکر کا یہ کلاسیکل رویہ صرف زبان کی حد تک محدود نہ تھا۔ ان کی ترقی پسندی یا اور آگے بڑھ کر مارکسی رویے کے بارے میں، میں زیادہ تو کہہ نہیں سکتا لیکن بعض تحریروں کے ذریعہ جتنا کچھ سمجھ سکا اس سے یہی اندازہ ہوا کہ ان کی ترقی پسندی، روشن ضمیری میں مارکسزم سے زیادہ تصوف کا دخل تھا۔ ان کا یہ شعر اس کی بہترین مثال ہے۔

ہم سے کہا جبرئیل جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

بعض ایسے اشعار بھی ہیں جن پر مارکسزم کا عکس ملتا ہے لیکن وہ مجروح کے بہت اچھے اشعار نہیں سمجھے جاتے۔ ایسے کئی ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے صوفی ازم سے مارکسزم کا سفر طے کیا ہے۔ مجروح بھی ان میں سے ایک تھے اور وہ اگر چہ ایک طرف یہ تسلیم کرتے تھے کہ تصوف مساوات کی بات ضرور کرتا ہے لیکن جدید معاشرتی تصور کے تحت جو برابری کا تصور جدید علوم اور بالخصوص مارکسزم کے ذریعہ آیا وہ تو نہ تھا، لیکن مجروح صاحب بہ بانگ دہل یہ بھی کہتے تھے تصوف صرف محبت اور اخوت کا نام نہیں بلکہ ریاستی آمریت کے خلاف ایک دھار دار اسلحہ کے طور پر بھی سامنے آیا۔ اس کا جو باغیانہ کردار رہا ہے اس نے بڑے سے بڑے تاج و تخت کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ جو ہماری شاعری میں ناصح، شیخ..... وغیرہ

سے نوک جھونک رہی ہے طنز تمسخر رہا ہے وہ اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ صوفیوں نے صرف دھونی ہی نہیں رمائی بلکہ بروکریسی کے خلاف قدم بھی اٹھائے اور اذیتیں بھی برداشت کیں۔ تصوف مجروح صاحب کا محبوب موضوع تھا مدلل و موثر انداز میں اس کے ڈانڈے جدید ترقی پسند فکر سے ملاتے کہ وقتی طور پر دونوں فکریں باہم شیر و شکر ہو جاتیں اور ایسا لگتا کہ صوفی ازم اور ، رکسزایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں.....وہ یہ بھی کہتے کہ میری بلند آہنگی پر نکتہ چیں سر پکڑتے ہیں جب کہ میں غزل کا شاعر ہوں اور میں نے اپنی اس بلند آہنگی کو دھیمے پن اور نغمگی میں بدلنے کی ہر ہر قدم کوشش کی ہے تاہم ان کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن فارسی کی اس شاعری کو، رومی اور جامی کی شاعری کے اس حصہ کو آپ کہاں رکھیں گے جہاں ان کی بلند آہنگی ہی ان کا شاعرانہ جوہر بنے ہوئے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں واقعی ہمارے ترقی پسند شاعروں نے جس طرح برتا اور پیش کیا وہ ان کا مستحسن عمل ہے۔ گفتگو کرتے وقت مجروح صاحب کے لہجے میں غضب کا اعتماد ہوتا تھا ہی للکار بھی ہوتی تھی اور خال صاحبیت بھی اور شاید تھوڑی سے سلطان پوریت بھی۔ ایک سحر انگیز ساقائل کر دینے والا انداز بیان کہ جس میں علم کے ساتھ عمل بھی بولتا نظر آتا ہے۔ میں نے بارہا کیفی اور تاباں سے باتیں کیں۔ سردار جعفری کو تو خوب پڑھا اور باتیں کیں۔ سردار کی تحریر و تقریر کا خیر کوئی جواب ہی نہ تھا مجروح جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ گوشہ نشین، مردم بیزار اور فلمی دنیا میں غرق رہنے والے انسان تھے لیکن میں جب بھی ملا زیادہ تر وہ سیمینار یا کانفرنس ہوتی۔ الگ سے گھروں کی محفل میں بھی خوب باتیں ہوئیں اتنا ڈھلا ہوا لہجہ۔ اتنا بے باک اور پُر اعتماد کہ خدا کی پناہ۔ ان کا گفتگو کرنے کا انداز بھی کلاسیکل ہوا کرتا تھا کہ جس کے پس منظر میں آپ جھانک سکتے تھے کہ مجروح سے پہلے کے بزرگ کس طرح کے رہے ہوں گے اور ان کا علمی و ادبی وقار کیا رہا ہوگا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ ان کے چہرے کی شفاف رنگت، سر کے نرم و سپید بال جو اُڑ کر ان کے لہجہ کی استقامت میں مدد کرتے اور پوری شخصیت کو اقوال زریں میں تبدیل کر دیتے تھے۔ اس میں کیا کلام کہ مجروح انتہائی پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ سنا ہے کہ جوانی میں جب مشاعرے پڑھتے تھے تو ان کی مترنم آواز، غزل

میں ڈھلا ہوا لہجہ ان کی خوبرو شخصیت کے جادو سے بڑے بڑے نڈھال ہو جاتے۔ جگر مرادآبادی بھی خاصے نڈھال رہتے۔ وہ اس خوبصورت جوان کو اکثر اپنے ساتھ رکھتے، ہو سکتا ہے کہ مجروح اس لئے بھی کچھ زیادہ خوبصورت لگتے کہ جگر صاحب جی بھر کر بدصورت۔ میں نے تو مجروح صاحب کو کافی عمر میں دیکھا لیکن عمر کی اس منزل پر بھی وہ بہت خوبصورت لگتے۔ عمر کی اس منزل پر جب میری ایک درخواست پر وہ الہ آباد میں ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے آئے تو اس بڑے مشاعرہ کے بڑے سے اسٹیج کے بالکل بیچ دھلے دھلائے چنے ہوئے کرتے، پان کے ڈبے کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر شاہانہ انداز سے اس طرح بیٹھے کہ بالکل اردو شاعری کے شاہجہاں لگنے لگے۔ قدرت نے واقعی عجب پرکشش اور متاثر کن شخصیت سے مالا مال کیا تھا اور طرہ یہ کہ ان کی شاعری بھی کچھ اسی انداز کی نرالی، بیچلی اور بانکی تھی جوان کی شخصیت میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے دریا کے چاندی جیسے چمکتے ہوئے پانی میں مہتاب کی کرنیں گھل مل جاتی ہیں اور سیماب ابھرنے لگتا ہے۔

ایک بار ہم نے سوال کیا کہ مجروح صاحب آپ تو اپنی غزلوں کے ذریعہ تحریک میں شامل ہوئے اس وقت تحریک میں نظم گوئی کا زور و شور تھا تو پھر آپ کو اور آپ کی شاعری کو کس طرح لیا گیا۔ تو جواب ملا "شروع میں ضرور دقت ہوئی..... یہ ۴۹ء کے آس پاس کی بات ہے جب میں بمبئی پہنچا ہوں ہم سے کچھ سینیئر شعراء میں سے اکثر کے دیوان شائع ہو چکے تھے۔ فیض کا 'نقش فریادی' وغیرہ چھپ کر مقبول عام ہو چکے تھے۔ میں غزل کا شاعر تھا اور اس وقت زور تھا نظموں کا شاید اسی لئے میرے استقبال میں گرمجوشی نہ تھی لیکن اس عہد میں جو کشاکش تھی جو رستخیز تھی اور شعراء جس طرح کمندیں پھینک رہے تھے وہ سب مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بڑا رومان پرور سا لگا چنانچہ میں نے وہی باتیں جو لوگ نظموں میں کہہ رہے تھے اپنی غزلوں میں کہنی شروع کیں۔ ہماری اصناف ضرور الگ الگ تھیں لیکن جذبات و کیفیات الگ الگ تھوڑی تھے۔ لہٰذا ہماری غزلوں میں بھی ایک خاص رنگ سے ترقی پسند موضوعات آنے لگے اور ہم پسند کئے جانے لگے۔ لیکن یہ پسندیدگی ہمارے لئے چیلنج کا کام کرتی گئی اور میں اس چیلنج کو قبول کرتا گیا اور رفتہ رفتہ مجھے خود محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی اصل آواز کو

دریافت کر رہا ہوں یا یوں کہیے کہ میں نے اپنی ایک راہ بنالی ہے۔ ہمارے ہم عصر ہمارے پیش رو نہ صرف ہماری طرف متوجہ ہو رہے ہیں بلکہ ہم سے متاثر بھی ہو رہے ہیں.....''

''متاثر وہ کیسے!''

''جی متاثر بھی ہوئے۔ ایک واقعہ سنئے۔ ایک مرتبہ سردار جعفری نے ایک مصرعہ پڑھا

ع ''دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی''

اور مجھ سے پوچھا کہ کیسا مصرع ہے۔ میں نے کہا کہ زوردار مصرعہ ہے اس کے بعد انھوں نے دوسر مصرعہ پڑھا ''دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی'' میں نے صاف کہہ دیا کہ دوسرا مصرعہ پہلے کے مقابلے میں کم تر درجے کا ہے۔ سردار نے اعتراف کیا لیکن ساتھ ہی بولے دراصل یہ تمہاری غزل کی لعنت ہے غزل کی یہی مصیبت ہوتی ہے کہ بات ہزار پہلے مصرع میں مکمل ہو جائے لیکن دوسرا مصرع کہنا ضروری ہے۔ اسی دن میں نے سردار سے غزلگوئی کے معاملات کو لے کر بہت بہت باتیں کیں بلکہ بحثیں کیں لیکن سردار کا یہ بڑکپن تھا کہ وہ میری بہت سی باتوں کو مان لیتے تھے لیکن یہ بھی ہے کہ انھیں دلیلوں سے منوانا بھی آتا تھا۔ خیر سردار کا معاملہ تو ہم لوگوں سے بہت مختلف تھا۔''

مجروح سردار جعفری کے بہت قائل تھے اور سردار بھی مجروح کے۔ کئی جگہ تحریر و تقریر میں انھوں نے مجروح کے بارے میں واضح طور پر کہا:

''غزلوں کو از سر نو عصر حاضر میں لانے کا کام فیض اور مجروح نے انجام دیا۔ ہم اس سلسلے میں مجروح کا نام اکثر بھول جاتے ہیں حالانکہ ان کا Contribution کسی طرح کم نہیں رہا ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری خود مجروح پر بھی عائد ہوتی ہے۔ میں نے یہ بات مجروح سے بار بار کہی ہے۔ بات یوں ہے کہ جب ایک شعر فلمی دنیا سے نکل کر عوام تک پہنچتا ہے۔ مجروح نے دراصل خود کو فلمی دنیا میں بند رکھا ہے جس کا اثر اس کی شاعری، اس

کی مقبولیت اور خود اس کی خود اعتمادی پر ہوا ہے۔''

شاعر مجروح کے تعلق سے انسان مجروح کا ایک ایسا نزک، حساس اور بے رحم موضوع تھا جو اکثر و بیشتر مجروح کو پریشان کیے رہتا۔ خود انھیں اس کا احساس تھا لیکن اس سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں اور اپنی کمزوریوں کا احساس تھا۔ میں نے انھیں کئی سیمینار اور کانفرنس میں بلانا چاہا طرح طرح کے واسطے دیے لیکن تقریباً ہر بار معذرت اور اس قسم کا کوئی خط:

''عزیز گرامی فاطمی!

اچھا تو میں مجروح بھائی سے مجروح صاحب ہو گیا۔
بہت دن نہ ملے تو وقت کا فاصلہ الفاظ میں در آتا ہے، سو آ کے رہا، دراصل یہ نہ میرا علوئے مرتبت ہے نہ تمھاری کوتاہی، اس کا ذمہ دار وقت ہے جو خدا ہے اور خدا ہی اس سے سمجھے۔ ہماری تمہاری قسمت میں تو آنے سے رہا۔ جب سے میرا بیٹا دنیا سے اٹھا ہے تو بہت کچھ سیریل کے چکر میں اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ دو گاڑیاں، ایک تیس پینتس لاکھ کا مکان، ۱۵۔۱۶ لاکھ نقد۔ اب مداری کی جھولی میں کچھ بھی نہ رہا۔ ایک دس برس کا پوتا۔ سات مہینے کی پوتی، ان کی ماں، سر کی اوڑھنی، صبح کے پہلے لقمے سے لے کر آ کر شب تک آذوقہ۔ کپڑے لتے، کتابیں، فیس، ٹیوشن۔ سب میری ذمہ داری ہیں۔ اب ۸۲ سال کا ہو چکا ہوں جبکہ معیشت کی یہ مہم جوان کی توانائی چاہتی ہے۔ بس برادرم اللہ ہی اللہ ہے، اس لئے کوئی ضرورت آڑے آ گئی تب ضرور سدِ راہ ہو گی، جس کے امکانات بہت کم ہیں۔ اگر کوئی گیپ مل گیا تو ضرور آؤں گا ہر چند طبیعت مضمحل ہے۔

والسلام

مجروح

ایسے نہ جانے کتنے خطوط انھوں نے مجھے لکھے جن کو پڑھ کر دل لرز جاتا۔ ستر اسی سال کے اس بزرگ، اہم اور بڑے شاعر کی یہ خانگی ذمہ داریاں۔ ایک بار مجھ سے براہ راست کہا کہ میاں فاطمی! کم از کم پچاس ہزار روپئے ماہانہ خرچ ہے میرا۔ اگر شہر سے ہٹتا ہوں تو نقصان۔ خاموش بیٹھا رہتا ہوں تو نقصان۔ تھک جاتا ہوں یا رک جاتا ہوں تو نقصان۔ آخر ذمہ داریوں کو کون پورا کرے گا اور فلمی دنیا کو تم تو جانتے ہی ہو، ہماری تو چلتی کا نام گاڑی ہے اگر آپ رکے تو آپ کے کندھے پر سوار ہو کر آگے بڑھ جائیں گے۔ کون پوچھتا ہے کہ کون مجروح ہے، کون کیفی اعظمی یہ مجروح صاحب کا خیال تھا جو اگرچہ غلط نہ تھا لیکن شاید مجروح کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجروح کو فلمی دنیا نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ خواہ وہ شہرت کا معاملہ ہو، یا دولت و عزت کا، یا اعزاز و اکرام کا، عوامی شہرت ہو یا خواص کی۔ اگر ایک طرف ان کے ہلکے پھلکے و بے معنی گانوں پر شدید اعتراضات ہوئے تو دوسری طرف دو ایک نہیں تقریباً دو ڈھائی درجن ایسے فلمی گیت ہیں جو اپنے شاعرانہ فن و حسن کی وجہ سے فلمی نغمہ نگاری اور موسیقی کی ایک تاریخ بن گئے۔ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ انھیں خدمات کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجروح کو شعری و ادبی سطح پر اس کی قیمت بہر حال ادا کرنی پڑی جس کی طرف سردار نے اشارہ کیا ہے۔ ان کا وہ سرمایہ جس سے مجروح بنے اردو غزل میں بالعموم اور ترقی پسند غزل میں بالخصوص تاریخی و ناگزیر حصہ بنے، وہ سرمایہ تو کم سے کم ہے۔ ادبی تنقید کو اور خود ترقی پسندی کو مجروح سے یہ شکایت بہر حال رہی لیکن وہی تنقید اس پر حیرت بھی کرتی تھی کہ اتنی قلیل تعداد میں یہ مقام اتنی کم غزلیں اور اتنی زیادہ شہرت۔ ظاہر ہے کہ رقیب ہوئے اور حاسد بھی پیدا ہوئے۔ ان سب کی طرف سے مخالفت بھی ہوئی اور خوب خوب ہوئی، لیکن مجروح نے ان سب کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنے مخصوص پٹھانی کردار کا لبادہ اوڑھے بمبئی دروغ گو مصلحت آمیز شہر اور اس سے بھی زیادہ مکر و فریب سے پُر فلمی دنیا میں پوری آن بان سے رہے۔ ادب میں بھی ان کی کج کلہی، کج ادائی، ان کے بانکپن اور محبوبیت کا حصہ بن گئی اور وہ ہر طبقۂ فکر میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔

مجروح کی کم گوئی کا مسئلہ جتنا کہ میں سمجھ سکا ہوں ان کی غیر معمولی مصروفیت کا تو

تھا ہی لیکن مصروف تو اور شاعر بھی تھے خود سردار جعفری بھی بہت مصروف رہتے تھے شاید مجروح سے بھی زیادہ لیکن انھوں نے نظم و نثر کا اچھا سرمایہ چھوڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کا ایک نفسیاتی مسئلہ تھا جن پر وہ کھل کر گفتگو کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ ایک بار میں نے اصرار کر کے پوچھا تو بس اتنا ہی کہا ''شروع شروع میں گیت لکھے وہ مشہور تو ہوئے لیکن ان پر اعتراضات بھی خوب ہوئے بس معیار کی بات ذہن میں بیٹھ گئی ویسے بھی غزل معیار چاہتی ہے۔ نکھار اور جمالیاتی رچاؤ چاہتی ہے اور میں نے ہمیشہ اس کا خیال بھی رکھا اور شاید اسی لئے میرے اشعار پسند کیے گئے۔ بس اب معیار سے اترنے کو جی نہیں چاہتا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میں چوزی (Choosy) ہوں۔ کتنے مصرعے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں، لیکن جی نہیں بھرتا، پھر مصروفیات آڑے آتی ہیں، کچھ نفسیاتی الجھنیں بھی رہی ہیں۔

یہ نفسیاتی الجھنیں کیا رہی ہیں، اسے میں نے سمجھنے کی بار بار کوشش کی اور کئی بار مجروح صاحب کو ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ انتہائی مہذب و وضعدار انسان تھے۔ اپنی ذاتی الجھنوں کا اظہار یا اس میں جلدی سے دوسروں کو شریک کر لینا انھیں پسند نہ تھا۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ تم صرف ادیب ہی نہیں ہو بلکہ کلچرل ایکٹوسٹ (Cultural Activist) بھی ہو۔ مجھ سے محبت کرتے ہو اس لئے کچھ باتیں جان لو اور اس طرح وہ کبھی کبھی اپنے دکھوں میں شامل کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف شاعر و دانشور ہی نہ تھے بلکہ ایک انسان بھی تھے۔ شوہر اور باپ بھی۔ بیوی کی بیماری اور اولاد کا غم ان کو اندر ہی اندر کمزور کئے دے رہا تھا ان کیفیتوں کا اظہار کبھی کبھی وہ اپنے خطوط میں بھی کرتے جس میں اکثر معذرت ہی ہوتی حد یہ کہ جب ہم نے ان کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کا جشن منانے کا ارادہ کیا اور خوشی خوشی خط لکھا کہ وہ اس فیصلے سے خوش ہوں گے۔ لیکن ہم یہ بھول گئے کہ جشن کا لفظ ان دنوں 'چھٹ بھیوں' نے اس قدر بدنام کر دیا ہے اور دہلی سے لے کر دہلی اور بمبئی تک ہر دنیادار شاعر از خود اپنا جشن مناتا پھر رہا ہے یعنی اپنے ہاتھوں سے اپنی میت کا سامان کر رہا ہے۔ مجروح صاحب ان بدعتوں سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن وہ ہم سے محبت کرتے تھے اس لئے مروت میں ناراض تو نہیں ہو سکے لیکن یہ لکھا:

"آپ نے جس دل سوزی سے مجھے عزت دینے
کی تیاریاں کی ہیں کوئی بہت زیادہ یگانہ ہی کر سکتا ہے مگر
اسے میری کم نصیبی کہیے کہ صحت کی جس منزل میں ان
دنوں ہوں چار ساڑھے چار ماہ سے قبل کوئی حتمی توقیت
میرے لئے میرے لئے ممکن نہیں...... کیا توقیر زیدی
نے میرے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا کہ بہ اعتبار
صحت ان دنوں میرا کیا عالم ہے۔"
عبائی تن ہمہ داغ شد پنبہ کجا نہم کا عالم ہے

والسلام مجروح

اس کے بعد جب میں نے اصرار کیا تو پھر شرمندگی سے بھرا خط لیکن اس بار وہ رضامند اور ہم نے پروگرام طے کر لئے۔ لیکن ان خطوں میں ان کی فطری قلندری اور شہرت جاہ و منصب سے بے نیازی صاف جھلک رہی تھی۔ ہمیں بھی خود عجیب سا احساس ہونے لگا۔ ہمیں لفظ جشن کی جگہ مذاکرہ یا سیمینار وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں ویسا ہی سب کچھ تھا جیسا کہ ہم نے سردار جعفری کی اسی ویں سالگرہ کے موقع پر سوچا اور ۹۴ء میں ایک شاندار جشن اور سیمینار کا انعقاد کیا لیکن مجروح صاحب پر ایسا کچھ کر پانا نازک عمل تھا۔ ایک تو یہ کہ ان کو تیار کر پانا مشکل، اور اگر یہ مشکل حل ہو بھی جائے تو ان کو بمبئی سے نکال پانا اس سے زیادہ مشکل۔ اس کے باوجود ہم ضد کر کے جشن کا اعلان کر سکتے تھے۔ لیکن اس میں ہمہ وقت خطرہ بنا رہتا۔ مجروح صاحب نے انکار تو نہیں کیا لیکن اقرار بھی نہ کر سکے وہ خود گومگو کی عالم میں تھے اس لئے کہ وہ استاذی سید محمد عقیل صاحب اور مجھ سے واقعی محبت کرتے تھے اور یہ محبت نظریاتی حوالوں سے ہوتی ہوئی ذاتی نوعیت تک پہنچ چکی تھی۔ اور انھیں یہ بھی احساس تھا کہ اگر عقیل اور فاطمی ایسا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو یقیناً وہ کر بھی گزریں گے اس لئے وہ ہماری محبت میں سرشار تھے اور پریشان تھے۔

مجروح صاحب سے ہماری عقیدتیں تو تھیں ہی اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی

نہیں، مجروح جیسے شخص و شاعر سے کوئی بھی عقیدت و محبت رکھ سکتا تھا۔ حیرت تو یہ تھی کہ وہ بھی ہم سے محبت کرتے تھے جس کا ثبوت انھوں نے کئی بار دیا۔ کئی سال قبل ہم نے ایک دوست کے مشاعرہ میں بطور خاص الہ آباد بلوایا، بے انتہا مصروفیات کے باوجود انھوں نے ہماری بات رکھی اور بمبئی سے لکھنؤ بذریعہ ہوائی جہاز لکھنؤ سے الہ آباد بذریعہ کار۔ ہم انھیں لینے لکھنؤ گئے۔ راستے بھر انتہائی دلچسپ اور پرلطف باتیں کرتے رہے۔ اس دن وہ کچھ اتنے اچھے موڈ میں تھے کہ زبان سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ممبئی کی مصروف و مکروہ زندگی سے فرار حاصل کر کے وہ اپنے وطن کی طرف آ رہے ہوں اور پورے موڈ میں Relax کر رہے ہوں۔ درمیان میں ایک جگہ ایک ڈھابے میں رک کر ایک ٹوٹی پھوٹی بینچ پر بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور چائے بنوانے کو کہا۔ چائے والا ہماری گاڑی اور ہماری اور بالخصوص مجروح صاحب کی سفید پوشی (وہ اس وقت بھی صاف کرتے پائجامے میں تھے) اور پھر اپنی دوکان کی خستہ حالی کو دیکھ کر پہلے تو حیران اور پھر تھوڑا سا پشیمان ہوا۔ اس نے اپنے مخصوص دوکاندارانہ انداز سے بنچ پر کپڑا مارنے اور دھول صاف کرنے کی کوشش کی جیسے ہی وہ کپڑا لے کر آگے بڑھا، مجروح صاحب نے اسے منع کر دیا۔ ''میاں اسے یوں ہی رہنے دو یہ اودھ کی دھول ہے۔ ہم اسی میں رہ کر جوان ہوئے ہیں۔'' دوکاندار بیچارہ کیا سمجھتا مزید حیرانی سے دیکھتا ہوا چائے چڑھانے چلا گیا۔ ازراہ تواضع اس نے ٹرانسسٹر کے گانے کی آواز تھوڑی تیز کر دی۔ کوئی اچھل کود کا گانا بج رہا تھا جس کے خالق سمیر تھے۔ مجروح صاحب کا موڈ خراب ہوتا دکھائی دیا۔

''دیکھیے یہ ہیں گانے آج کے.... یہ کل کا لونڈا.... ہمارے گھر آتا تھا ہمت نہ پڑتی تھی برابر بیٹھنے کی.... پھر شاعری کا شوق ہوا ردیف قافیہ کی تمیز نہ تھی۔ میں نے کہا کہ پہلے شعراء کے قدموں میں بیٹھو ان کا کلام سنو اس کے بعد شاعری پڑھو اور سمجھو۔ وہ سب تو برخوردار کیا کرتے، بس شروع ہو گئے۔ انھیں لوگوں نے معیار گرا دیا ہے، عزتِ نفس کھو دی ہے اپنی پسند و شرط کے بجائے ڈائرکٹر و پروڈیوسر کی پسند اور شرط پر گیت لکھنے لگے۔''

''ایسا تو آپ کے ساتھ بھی ہوا ہوگا؟'' میں نے لطف لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں ہمارے سامنے بھی یہ صورت آجاتی لیکن ہم صرف گیت نہیں لکھتے ہیں بلکہ فلم کی پوری کہانی سمجھتے ہیں، ایک ایک عمل سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح پوری فلم کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اگر پھر بھی ہلکا پھلکا گیت لکھنا پڑا تو اس میں یوں کوئی بات، کوئی نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ہماری پسند ہی چلتی تھی۔ اکثر و بیشتر گانوں کی نہ صرف دھنیں ہم نے بنائیں بلکہ اس گیت اور کیفیت کے اعتبار سے سچویشن کو ڈھال دیا کرتے ہیں اور ہماری بات ڈائرکٹر بھی مانتا تھا اس لئے کہ ہماری عزّت ہے، تھوڑی بہت ہماری خدمت ہے اور یہ سب یونہی نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ ایک ایک گیت کے لئے راتوں کی نیند حرام کرنی پڑتی ہے۔ خونِ جگر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار کی بات ہے فلم آرتی بن رہی تھی۔ اس کے لئے مجھے ایک رومانی گیت لکھنا تھا۔ ڈائرکٹر نے بیحد پر اثر گیت لکھنے کی فرمائش کردی اور یہاں تک کہہ دیا کہ ''چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو....'' ٹائپ کا خوبصورت گیت ہونا چاہئے۔ یہ گیت واقعی بہت خوبصورت ہے سچویشن اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔ وحیدہ رحمان کے حسن نے فلم میں گیت کے جادو جگا دیے۔ مجھے اس فلم کے لئے یہ گیت مینا کماری کے لئے لکھنا تھا۔ مینا کماری رومانی چہرہ نہیں رکھتی تھی، اسے لوگ سنجیدہ ہی لیتے تھے۔ اب میں اس طرح کا گیت کیسے لکھتا۔ اور اس سے آگے کیسے جاتا، یہ سب کچھ میرے لئے چیلنج سا تھا لیکن میں نے لکھا۔ ''اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی۔ انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی'' چاند اور آفتاب کے بیچ سے میں نے مہتاب کا لفظ نکالا اور انتہائی عرق ریزی سے ایک خوبصورت گیت لکھ ڈالا۔ یہ گیت ہٹ ہوا، بلکہ میں اسے چند پسندیدہ نغموں میں سے ایک شمار کرتا ہوں۔ یہ گیت اُس گیت سے آگے نہیں گیا تو پیچھے بھی نہیں رہا۔ تو یہ سب تھا ہمارے ساتھ ہم اکثر امتحانوں میں گھر جاتے ہیں لیکن ہم محنت کرتے ہیں۔ اچھے نغمے ہی نہیں اچھی دھن زبان و بیان کا معیار عوامی مذاق سب پر نظر رکھتے ہیں اور معاف کیجئے گا آج کے گیت کاروں نے مذاق کی سطح بگاڑ دی ہے۔ انھیں صرف دولت چاہئے اور شہرت....''

ان کا لہجہ سخت ہونے لگا میں نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔ مجروح صاحب کو بھی

احساس ہوا کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی کم ہے۔

''کچھ بیتے دنوں کی باتیں بتائیے مجروح صاحب''

انھوں نے ایک خاص اوھی اسٹائل سے چائے کا سپ لیا اور پرانے بمبئی کو یاد کرنے لگے۔ اور بولے'' ۱۹۵۰ء کے آس پاس جب میں بمبئی آیا تو اس زمانے میں ترقی پسند شاعروں کا زور تھا۔ ایک سے ایک ہیرے جواہر جمع ہو گئے تھے، لیکن اتنا ہی افلاس۔ مفلسی ایسی کہ چائے پینے تک کے پیسے نہ ہوتے تھے۔ کہیں کسی طرح پیسے جمع کیے جاتے تو چائے پی جاتی۔ آدھی آدھی رات تک سڑکوں پر ٹہلتے رہتے.... پھر وہ کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے ،کچھ سنجیدہ اور پھر آہ بھرتے ہوئے بولے

''ہائے کیسے کیسے لوگ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ اب تو ان کے بارے میں سوچنے کی بھی ہمت نہیں۔ جگر صاحب ہمیں بمبئی لے کر آئے اور پھر ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کیا سوچا تھا کہ ہمارا آب و دانہ یہیں کا ہوگا۔ سلطان پور جیسے معمولی شہر کا انسان بمبئی جیسے بڑے شہر اور فلمی دنیا کا اٹوٹ حصہ بن جائے گا۔ انسان سوچتا کیا ہے کہ روزی کا چکر اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے.....''

مجروح صاحب بیحد جذباتی ہو رہے تھے انھوں نے کئی بار عقیدت سے جگر صاحب کا نام لیا اور کئی بار محبت سے سردار جعفری کا بھی نام لیا اور میں یہی سوچتا رہا اتنا بڑا شاعر، اتنا نام، مشہور شاعر، اس طرح ڈھابے کی میلی کچیلی بنچ پر بیٹھا یادوں کی کمزور سی ندی میں کس طرح ہچکولے کھا رہا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر بنچ پر نہ بیٹھے ہوتے تو شاید ایسا سوچ بھی نہ سکتے۔ ہم کار میں بیٹھے تھے تو گفتگو کا مزاج رواں دواں فرانے دار تھا بنچ پر بیٹھے تو گفتگو میں ٹھہراؤ آیا اور بہت کچھ یاد آیا۔ ہم جو زندگی گزارتے ہیں اس کی ماڈی صورتیں ہمارے کردار اور گفتگو کو بدل دیتی ہیں چال ڈھال بدل دیتی ہیں لیکن بڑا شخص وہی ہوتا ہے کہ ہر دور میں ہر سفر میں وہ سب کچھ یاد رکھے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ میسر آیا ہے۔ مجھے ان باتوں میں بیحد مزہ آیا اور اس لیے بھی کہ درمیان گفتگو وہ جس طرح سے بار بار فاطمی، میاں فاطمی اور برخوردار فاطمی سے مخاطب کر رہے تھے اس سے غیر معمولی

اپناپن جھلک رہا تھا اور میں۔ افتخار محسوس کر رہا تھا لیکن جب بات قدرے سنجیدہ یا علمی ہو جاتی تو وہ پروفیسر فاطمی سے مخاطب کرتے تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔

وہ الہ آباد آئے اور میرے ہی غریب خانے پر قیام کیا۔ مشاعرے میں شرکت کی۔ یہ سب میرے لئے تاریخی سا تھا اور مشاعرہ بھی تاریخی ہو گیا۔ دوسرے دن ہم نے ایک ثقافتی نوعیت کا پروگرام رکھا جس میں لوگ امنڈ پڑے۔ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی ظاہر ہے ان میں بیشتر شرکاء مجروح صاحب کو دیکھنے اور سننے آئے تھے اور مجروح صاحب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تقریبات میں شریک ہوتے رہے اور پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر فضل امام رضوی اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ پوری آزادی و بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ ہنستے بولتے رہے کہ وہ دن اور وہ تقریبات الہ آباد کی تاریخ کا یادگار حصہ بن گئے۔ انھیں ایام میں ہمارے شہر کے ایک صاحب عبدالکریم کہ جن کے والد سے مجروح صاحب سے تعلقات تھے وہ بار بار مجروح صاحب کے پاس آتے رہے اور اپنے گھر لے جانے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ جب ان کا بے تکا اصرار حد سے آگے بڑھا تو مجروح صاحب تقریباً جھنجھلا کر بولے:

''دیکھئے کریم صاحب، میرا یہاں بھانجہ بھی رہتا ہے اور تم بھی مجھے عزیز ہو لیکن میں یہاں فاطمی کی دعوت پر آیا ہوں اور فاطمی سے میرا نظریاتی رشتہ ہے۔ تم سے محض اخلاقی رشتہ ہے اور وجاہت سے خونی رشتہ لیکن میرے نزدیک سب سے اہم و مقدم فکری و نظریاتی رشتہ ہوتا ہے۔ اس لئے فاطمی کی تقریبات ختم ہو جائیں اس کے بعد ہی میں تمہارے پاس چل سکوں گا......''

کریم صاحب کو یہ بات ناگوار لگی اور وہ مجروح کے بجائے مدتوں مجھ سے ناراض رہے۔ مجروح صاحب سے ناراض ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے کہ مجروح صاحب کے اصول و مزاج سے واقف تھے حالانکہ کریم صاحب کھرے سید تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجروح صاحب اس سے بھی زیادہ کھرے پٹھان ہیں اور وہ بھی ایسے پٹھان کہ جس کی پٹھانیت ان کی شہرت و عزت کے آگے جھک نہیں گئی تھی بلکہ دوبالا ہو گئی

تھی اور وہ ادب میں کبھی کبھی اس کا استعمال کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کو کچھ نقصانات بھی اٹھانے پڑے۔ لیکن مجروح صاحب نقصان و فائدے کی پروا کم ہی کرتے تھے۔ اصول و آن کی بات آجائے تو نہرو جیسی شخصیت کہ جس کے آگے بڑے بڑے فنکار جھکتے تھے لیکن مجروح نے جیل کی اذیت برداشت کر لی لیکن جھکنا گوارا نہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے شیوسینا کے لیڈر کے ہاتھوں انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح کے کئی واقعات ان سے وابستہ ہیں۔ اپنے بارے میں کچھ نہ لکھوانے کے واقعات، انعام و اکرام سے دور رہنے کے واقعات (جس میں میرا پروگرام بھی شامل ہے) کوئی کچھ بھی کہے لیکن مجروح کی ان اداؤں نے وقتی طور پر جو بھی اثر ڈالا ہو لیکن ان کی شخصیت اور کردار کو استقامت بخشی اور دیر میں سہی لیکن ان کے کردار کے کھرے پن کو بہر حال سراہا ہی گیا۔ خاص طور پر ایسے ماحول میں جب کہ بڑے بڑے ترقی پسند شاعر و ادیب بھی ارباب حل و عقد، اداروں، انعاموں وغیرہ کے سلسلے میں کمزور، مصلحت پسند یا کم از کم خاموش ہو چکے ہیں۔ اور جو کبھی ان حقیر اشیاء کو ٹھوکروں میں رکھا کرتے تھے آج سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ ایسے میں مجروح کی بیباک، بے دھڑک اور حق گو شخصیت ایک روشن مینارے کی طرح تھی۔ کردار و عمل کی شفافیت، غور و فکر کی صداقت، باطن کی اجلی بے داغ شخصیت کے وہ مظاہر تھے جو ان کی ظاہری اور دلنواز شخصیت کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ وہ خوبصورت اور گورے چٹے انسان تھے اس پر ان کا مخصوص دھلا ہوا بلکہ چنا ہوا سفید کڑھا کرتہ، چوڑی مہری کا سفید براق سا پائجامہ۔ یہ سب تو میلے بھی ہو جاتے لیکن ان کے اندر کی شخصیت شاید ہی کبھی میلی ہوئی ہو۔ اور یہ اندر کی صفائی، یہ بے باکی، بے خوفی اسرار الحسن خاں کو مجروح سلطان پوری بنانے میں اور انھیں عالمی شہرت دلانے میں بہر حال معین و مددگار تھی۔

ایک بار میں اپنے دوست تنویر سید کے ساتھ بمبئی گیا۔ بمبئی پہنچتے ہی مجروح صاحب کو فون کیا۔ فوراً ملاقات کرنے کا حکم ہوا پھر یاد کر کے بولے آج شام عید ملن کا جلسہ ہے اس میں آجاؤ وہیں سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ یوسف ناظم سے بات کر لو۔ میں

نے فوراً یوسف ناظم صاحب سے رابطہ کیا اور شام کو پروگرام طے پا گیا۔ ہم جب جلسہ گاہ پہنچے تو اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ اسٹیج پر سردار جعفری، مجروح صاحب، کالی داس گپتا رضا، ندا فاضلی، قتیل شفائی وغیرہ موجود تھے۔ ہم لوگ نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ جلسہ شروع ہوا درمیان میں مجروح صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ اسٹیج پھلانگتے ہوئے مائک پر آئے اور مداخلت کے لئے معذرت کرتے ہوئے بولے:

''حضرات مجھے بیحد خوشی ہے کہ آج اس محفل میں ایک ایسا نوجوان آیا ہوا ہے جس پر ہم لوگ ناز کرتے ہیں اور وہ اردو کا سپاہی تو ہے ہی ہماری انجمن کا بھی سپاہی ہے۔ شمالی ہند میں اور بالخصوص اتر پردیش میں اردو کی کسی تقریب کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اردو کا استاد ہے، ادیب و ناقد بھی اور الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر بھی۔ میری مراد پروفیسر علی احمد فاطمی سے ہے۔ منتظمین سے بھول ہوگئی اسے اسٹیج پر ہونا چاہئے۔ بہر حال میں اسے دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آئے اور آپ تالیوں سے اس کا خیر مقدم کریں....''

مجروح صاحب کے یہ جملے، پھر تالیاں اور ان تالیوں میں سردار جعفری، یوسف ناظم اور ندا فاضلی کی بھی تالیاں۔ میرے پیر من من بھر ہو گئے۔ مجروح صاحب کے اس غیر متوقع حملے سے میں لہولہان ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کس کے لئے کہا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ سب میرے لئے تھا۔ عجیب سی ناقابل یقین سی حالت میں میں اسٹیج پر بیٹھا رہا۔ تقریب چلتی رہی، پھر مجھے بولنے کو بھی کہا گیا۔ تقریر کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے لیکن اس دن میں ٹھیک سے بول نہ سکا۔ مجروح صاحب کے جملے۔ سردار کی موجودگی۔ عروس البلاد کا جلسہ۔ دوستوں کی شرکت یہ سب پہلی بار ہوا تھا۔ اس لئے عجیب سا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب و غریب میری ذات سے متعلق ہر گز نہ تھا۔ مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے اور شاید یہی میرے اندر اکلوتی خوبی ہے کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں ہے۔ دراصل یہ سارا جادو مجروح کی شخصیت کا تھا جس میں ان کی انجمن سے وابستگی، خوردنوازی تو تھی ہی لیکن اس سے زیادہ ان کی شخصیت کی پاکیزگی، سادگی اور بے باکی کا دخل ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ شفقت بھرا رویہ صرف میرے ہی ساتھ تھا۔ اکثر

چھوٹوں کے ساتھ، نئی نسل کے ساتھ ان کا یہی رویہ ہوتا جو کبھی کبھی ان کی بے باکی وحق گوئی کی وجہ سے غلط طور پر لے لیا جاتا لیکن اگر کوئی ایک بار قریب سے ان کو دیکھ لے اور سمجھ لے تو ان کی سرپرستانہ بلکہ پدرانہ شفقت کے لازوال خزانے سے مالا مال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پتہ نہیں کیوں وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اس کا احساس مجھے کافی دنوں کے بعد ہوا۔ ایک بار ایک خط میں میں نے انھیں حضور اعلیٰ لکھ دیا جواب آیا:

> ''اچھا صاحب تو اب میں مجروح بھائی سے ''حضور اعلیٰ'' ہو گیا۔ بہت دن نہ ملے تو وقت کا فاصلہ الفاظ میں در آتا ہے سو آ کے رہا۔ دراصل نہ میرا علوئے مرتبت ہے، نہ تمہاری کوتاہی، اس کا ذمہ دار وقت ہے جو خدا ہے، خدا اس سے سمجھے ہماری تمہاری مٹھی میں تو آنے سے رہا....''

ذرا سوچئے مجروح سے کون فاصلہ بنانا چاہے گا۔ یہ فاصلہ تو خود مجروح نے بنا رکھا تھا۔ سیمینار، کانفرنس وغیرہ میں آنا جانا بند۔ رسالوں، اخباروں میں چھپنا بند۔ اس پر خاں صاحبیت، صاف گوئی اور بیباکی۔ کچھ عجیب سے لگتے تھے ان کے عادات واطوار۔ سارتر نے کہا تھا کہ غور کرو کہ آدمی دوسروں سے کن باتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے لیکن اصلاً وہی اس کی خوبیاں ہیں۔ ہمیشہ شاعری اور دانشوری کی دنیا میں جینے والا شخص عام سی دنیا میں غیر اخلاقی، سختی اور کبھی کبھی خود مرکزیت کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔ جو ہمیں ظاہری دنیا کے حوالے سے برا لگتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنی ذات میں ڈوبنے اور دنیا سے کسی حد تک کٹے ہونے کے بعد ہی تسیا ہو پاتی ہے اور نئی دنیا کی تعمیر ہوتی ہے۔ مجروح صاحب نے جس طرح سے اپنی زندگی اور شاعری کی شروعات کی۔ جگر کی محفلیں اور ان کے ساتھ مشاعرے، پھر اس کے بعد بمبئی اور دیگر شہروں میں ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی محفلیں، پھر خود ان کا محفل ساز اور محفل باز والا مزاج و مذاق لیکن پھر بھی مجروح تنہا ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو مجروح کے پرستاروں کو اکثر پریشان کرتا ہے اور اکثر یہ پریشانی اپنائیت بھری بیزاری کو بھی چھونے لگتی جس کا شکار میں بھی ہوا ہوں۔ لیکن اس وقت

تک جب تک میں نے ان کے گھر کے حالات، ان کی ضروریات کو قریب سے نہ دیکھا تھا۔ خود مجروح صاحب کو بھی قریب سے نہ دیکھ سکا تھا۔ حالات کا جبر، بنیادی ضرورتوں کا دباؤ بڑی بڑی چیزوں کی تقسیم کر دیتا ہے۔ مجروح صاحب تو پھر بھی ایک کمزور اور جذباتی انسان تھے اور ذمہ داری اور فرائض منصب کا شدید احساس تھا۔ وہ اکثر کہتے کہ میاں پہلے اپنے گھر کو روشن کرو اس کے بعد مسجد میں چراغاں کرو۔ اصل تہذیب تو گھر سے جنم لیتی ہے۔ میں تنہا ضرور ہوں لیکن یہ تنہائی جدیدیت والی ہرگز نہ تھی بلکہ ضرورت اور جبر کا حصہ تھی۔ فراق صاحب کہا کرتے تھے کہ کبھی کبھی انسان اندر سے اتنا تنہا ہوتا ہے کہ بھرے مجمع میں بھی وہ تنہا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تنہا رہتے ہوئے بھی بھیڑ میں گھرا رہتا ہے۔ مجروح صاحب بھی اسی کیفیت کے شکار تھے۔ وہ بمبئی سے کم نکل پاتے بلکہ اپنے گھر سے بھی کم نکل پاتے لیکن وہ ہمیشہ بھیڑ میں گھرے رہتے۔ اس بھیر میں کبھی کبھی وہ عجیب سے فیصلے بھی لے لیتے۔ ایک بار وہ نجانے کن چکروں میں پڑ کر الیکشن لڑنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بیقرار ہو کر انھیں خط لکھا تو جواب ملا:

> ''آپ نے خبر کی حد تک درست سنا ہے۔ علی صدیقی نے الیکشن کے سارے انتظامات کی ذمہ داری لی تو ہے مگر ابھی یہ بات گفتگو سے آگ نہیں بڑھی ہے۔ ظ. صاحب نے کہا کہ وہ الیکشن میں کھڑے ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن اگر میں کھڑا ہوا تو دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے میرے ساتھ ہوں گے۔ ندا فاضلی کی خبر بھی میری نزدیک طوطا مینا اڑانے سے زیادہ نہیں معلوم۔ خود اپنی شاعری میں بھی موصوف نے ساری زندگی یہی کیا ہے.....''

اس کے بعد کے حصے میں ندا فاضلی کی شاعری کی خبر لے لی اب یہ بات فی الوقت سیاسی مصلحت کے خلاف جاتی ہے لیکن مجروح صاحب کے یہاں مصلحت نام کی

کوئی چیز نہ تھی جو دل میں وہی زبان پر۔ انجام کچھ بھی ہو۔ ذرا سوچئے کہ کہاں مجروح اور کہاں سیاسی الیکشن۔ اچھا ہوا کہ بات آئی گئی ہوگئی ورنہ ان کا حشر بھی فراق صاحب کی طرح ہوتا جنھوں نے کبھی لانڈری کی دوکان کھولی، کبھی کتابوں کی اشاعت کا کام کیا۔ بری طرح فلاپ ہوئے اور لاکھوں گنوائے۔ فنکار کی شخصیت کا یہ عجیب گوشہ ہوا کرتا ہے کہ حیات وکائنات کی فلاح وبہبود کے بارے میں سوچنے والے بڑے فنکار شب وروز کے چھوٹے معاملات میں اکثر ناکام ہوتے اور نقصان اٹھائے جاتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ہوتا ہے کہ بڑے وژن اور بڑی نظر رکھنے والے شاعر اکثر اپنے گردوپیش کے ماحول اور اپنے ہم عصر ادب سے مستقل بے اطمینانی اور اداسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نئے شاعروں کے بارے میں مجروح کو یہ شکایت رہتی کہ ان میں وہ تڑپ اور للک نہیں ہے جو کہ کمیٹڈ قسم کے بڑے شاعروں میں ہوا کرتی ہے۔ مجروح کے اس خیال سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی مایوسی کو ایک سرے سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چند کہ اس مایوسی اور اداسی کے اسباب کچھ اور بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اداسی ادب وشاعری کو لے کر بڑی نوعیت کی تھی اور اپنی ذاتی الجھنوں کو لے کر بالکل نجی قسم کی بھی تھی لیکن یہ دونوں باہم اس قدر گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ انھیں الگ کر کے دیکھ پانا قدرے مشکل تھا۔ بس ہوا یہ کہ ان اداسیوں کے تحت عصری رشتوں سے ان کا رابطہ ٹوٹتا سا چلا گیا اور اس طرح معاصر ادب سے بھی ان کا رشتہ کٹا کٹا سا رہنے لگا۔ کچھ یہ بھی مشکل تھی کہ عصر حاضر کی تخلیقات کو وہ ماضی کے حوالے سے دیکھتے تھے حالانکہ فلمی گیتوں کے سلسلے میں انھوں نے ایسا رویہ نہیں اپنایا، نئے نئے طرز کے گانے لکھے جو نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئے، شاید اس لئے کہ وہ پیشہ تھا، صورت حال کے تقاضے جہاں انفرادی اخلاقیات کے مظاہر تقریباً مسدود ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ادبی معاملات کو وہ نہایت سنجیدگی اور پاکیزگی سے لیتے تھے۔ ایسا تو نہ تھا کہ ادبی تقریبات یا سیمینار، مشاعروں میں جانا بالکل بند ہو گیا تھا لیکن مشاعروں میں جانے اور آج کے مشاعروں کی چیختی ہوئی بے رس مکالماتی شاعری سنتے تو انھیں سخت کوفت ہوتی اور وہ مشاعرہ کے اسٹیج پر ہی اداس ہو جاتے۔ پریشان تو وہ ادبی رسائل کی شاعری سے بھی تھے

خاص طور پر اس کی بگڑتی ہوئی زبان سے۔ مجروح صاحب اکثر کہتے ''زبان کا گنجلک ہونا اور محض حرف ولفظ سے لگاؤ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ کے پاس خیالات کمزور ہوں یا الجھے ہوئے ہوں اگر تصور صاف اور نقطۂ نظر واضح ہو تو زبان کیسی بھی ہو اگر وہ معنوی نظام اور شعری در و بست کے ساتھ ہم آہنگ ہے تو پھر کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔''

ہم ان کی باتیں سنتے تو بس سنتے ہی رہتے غور کرنے کی منزل بعد میں آتی اس لئے کہ شخصیت اور گفتگو کا فوری تاثر ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا۔ مجروح صاحب کی شفاف اور دھلی ہوئی پاکیزہ شخصیت کے طلسم میں گرفتار ہوئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ گرفتاری مقدر والوں کو نصیب ہوتی جس کو وہ جان لیں اور مان لیں۔

میں نے ایک بار لکھنؤ میں انجمن کی کانفرنس میں بعض بزرگوں سے جن میں مجروح صاحب بھی شامل تھے شدید اختلاف کیا شاید زبان کا ہی مسئلہ تھا۔ مائک پر اپنے تئیں زوردار تقریر کر ڈالی۔ جب اسٹیج سے نیچے اترا تو مجروح اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے اپنے پاس بلایا اور پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ''جب تک تم جیسے جوشیلے لوگ انجمن میں ہیں یہ انجمن مر نہیں سکتی۔'' ذرا سوچئے کہ ایسا نوجوان کہ جس کی کوئی حیثیت نہیں کوئی شناخت نہیں مجروح کے یہ جملے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور لوگ بھی وہاں تھے لیکن ایسا کسی نے نہیں کیا۔ یہ کام مجروح صاحب جیسی صاف ستھری شخصیت ہی کر سکتی ہے۔ جس کے پاس کوئی مصلحت نہیں، جو لوگ ادب کو، انجمن کو تحریک کو صدیوں اور نسلوں کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں انھیں ہی نئی نسل کی فکر ہوتی ہے اور وہ اپنے علم وعمل سے انھیں پروان چڑھانے کا دم خم رکھتے ہیں جو ظرف نقادوں میں نہیں ہوا کرتے۔

میں نے ایک بار ان سے عرض کیا کہ آپ کا کارنامہ تو ہے کہ کلاسیکی زبان اور قدیم اصطلاحات میں نئے معنی جذب و پیوست کئے وہ معنوی نظام دیا جس کا تعلق براہ راست عصری سیاست اور آج کے کھردرے سماج سے ہے۔ آپ یہ بڑا کام کر گئے اس کے لئے آپ کی پذیرائی بھی ہوئی لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ لسانی نظام، استعارے، محاورے تخلیقی سطح پر وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں جیسے تذکیر و تانیث کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اگر

آپ ترقی پسند ہیں تو اس تبدیلی کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ یہ سوال پہلی بار تو ان کے سامنے نہ آیا ہوگا لیکن پھر بھی انھوں نے غور کیا اور پوری سنجیدگی سے فرمایا.....

''میں تمھاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کچھ تبدیلی تو فطری طور پر ہوتی ہے، کچھ فیشن میں، کچھ مخالفت میں اور کچھ ضد میں۔ میں فیشن اور ضد کے خلاف ہوں چونکہ یہ محاورے اور اصطلاحیں ترقی پسندوں نے استعمال کیے ہیں لہٰذا ہم اس میں توڑ پھوڑ کریں گے اور نئی بات کریں گے خواہ وہ کتنا ہی غیر تخلیقی شاعرانہ ہو، جدیدیوں نے یہی تو کیا..... خیر وہ تو اپنے انجام کو پہنچے۔ دیکھئے شعر کہنا الگ بات ہے لیکن شعری مزاج میں ڈھل جانا، غیر فصیح خیال اور اس سے زیادہ غیر فصیح الفاظ میں شعریت و نغمگی پیدا کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ہم ترقی پسندوں نے کیا۔ فیض اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ وہ مزاجاً دھیم اور نرم لہجے کے انسان تھے۔ میں تو تیز دماغ مشہور ہوں لیکن میں نے بھی کوشش کی، شاعری میں صرف الفاظ کا انتخاب ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انتہائی مناسب اور تخلیقی استعمال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میر دھلا ہوا مصرع دیکھئے ''دل ہوا ہے چراغ مفلس کا'' اب اس میں ایک لفظ بھی ہٹا دیجئے پورا مصرع غارت ہو جائے گا۔ میرا اعتراض نئے لوگوں سے یہ ہے کہ وہ لفظ کے دروبست سے واقف نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فکری اعتبار سے جو بھی ہو لیکن اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے ناقص ہے۔

مجروح صاحب کی کھری باتیں عموماً بری لگتی تھیں اور نئی نسل کے لوگ اکثر ان سے ناراض ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ نئی نسل سے بے انتہا پیار بھی کرتے تھے اور وہ یہ چاہتے کہ ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا رہے۔ شاعری میں نئی نسل جس طرح تجربے کر رہی ہے بلکہ ہیئت و اسلوب کے حوالے سے جو تجربات ہو رہے ہیں اس نے شاعری کا، غزل کا وہ رچاؤ چھین لیا ہے جس کے لیے اردو شاعری بالخصوص غزل صدیوں سے اپنا مقام بنائے چلی آرہی تھی۔ اب اس کے قدم لڑکھڑا گئے ہیں اور ایک خیال یہ ابھر کر آگیا ہے کہ موجودہ دور نثر کا دور ہے، فکشن کا دور ہے۔ اس بات میں حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن ایک کڑوی حقیقت یہ تو ہے ہی کہ آج ایک سے ایک شاعر دس دس مجموعے چھپوا کر انعام و اکرام شہرت کا حصار

باندھنے کی کوشش میں مبتلا و مصروف ہیں۔ ایک سے ایک منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ ادیبوں و ناقدوں کو خوش کرنے کی غیر اخلاقی کوششیں جاری ہیں۔ مجموعوں پر تبصرے کروائے جارہے ہیں۔ اپنی شاعری پر مضامین لکھوائے جارہے ہیں۔ اپنے ہی رسالے کے اوراق اپنی ہی تعریف سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف مجموعوں کی، منصوبوں کی یہ بھیڑ۔ دوسری طرف بے نیاز و بے فکر مجروح سلطان پوری، جس کے پاس کل ملا کر ڈیڑھ یا دو مجموعے یا ستر یا اسی غزلیں اور چند بے پناہ شہرت یافتہ اشعار۔ شائقین انھیں پڑھنا چاہ رہے ہیں، انھیں آنکھوں سے لگانا چاہ رہے ہیں۔ سامعین تازہ بہ تازہ غزلیں سننے کے لئے بے چین و بیقرار، لیکن ان کے پاس کلام نہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں۔ ان کی رسم وراہ نہیں۔ اتنی بے نیاز و تلخ شخصیت اور اتنا کم سرمایہ پھر بھی اتنا بڑا مقام کہ بیسویں صدی کی غزل کی کوئی تیاریخ مجروح کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ کون سا طلسم، یہ کون سا معمہ ہے، اسے نئی نسل کو ہم سب کو سوچنا ہوگا۔ کہ ادب میں وہ کون سی بات ہے جو مقام عطا کرتی ہے، دوام عطا کرتی ہے۔ کیا زود گوئی، کثرت نویسی، شہرت، دولت، مشاعرے میں شرکت، ہر رسالہ میں اشاعت وغیرہ یا کچھ اور...... یہ کچھ اور کیا ہے اسی کا درس دیتی ہے مجروح کی البیلی اور تیکھی شاعری اور مجروح کی تیکھی وحقیقت پسندانہ شخصیت۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم سارے ڈھب بلکہ سارے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ ساہتیہ اکادمی اور اردو اکادمی کے لاکھوں کے انعام بھی حاصل کر لیتے ہیں پھر بھی دور تک نہیں جا پاتے یا کوئی بڑی حیثیت نہیں بنا پاتے۔ اور مجروح کی تھوڑی سی شاعری نہایت قلیل سرمایہ جس پر کوئی اکادمی انعام دینے کی ہمت نہ کرسکی وہ ادبی تاریخ کا لازوال حصہ بن جاتا ہے۔ یہ سوال آج کے ادب میں ڈھلتے ہوئے صارفانہ ماحول میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تبھی تو آج کے ہی ایک شاعر نے اچھی بات کہی ہے:

ہم نے جو سورج جلائے بجھ گئے
سب دیئے روشن تمھارے نام کے

□□□

رشید حسن خاں : شجر سایہ دار

اپنی تیس برس کی طالب علمانہ اور مدرسانہ زندگی میں متعدد اکابرین ادب کی خدمت میں حاضر ہونے، ان سے گفتگو کرنے اور بہت کچھ سیکھنے کے مواقع ملے۔ ابتدا میں رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی ادیب، کلیم الدین احمد، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، میکش اکرآبادی جیسے بزرگ و عظیم شاعروں وادیبوں کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوا لیکن ان پر لکھنے کا حوصلہ کبھی نہ ہوسکا۔ اول تو ان سے ملاقاتیں بہت کم ہوئیں، پھر ان حضرات کی شخصیت کا غیر معمولی جلال اور رعب بھی لکھنے نہ دیتا۔ اس کے بعد کی نسل میں بھی کچھ ایسے بزرگ ہیں جن سے بہت بار ملاقاتیں رہیں قربتیں بھی تھیں، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی لیکن لکھنے کی ہمت پھر بھی نہ ہوئی۔ ایسی اہم و برگزیدہ شخصیتوں میں محترم رشید حسن خاں بھی ایک ہیں۔

خاں صاحب کے بارے میں میں نے کئی بار لکھنا چاہا۔ اس وقت جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے، اس وقت جب انھیں ایک نہیں کئے بعد دیگرے کئی بڑے انعامات و اعزازات ملے، اس وقت جب وہ دہلی چھوڑ کر اپنے وطن شاہجہاں پور چلے گئے۔ لیکن ہر بار کئی بار دل نے ہچکولے کھائے۔ دماغ نے گرم گرم سانسیں لیں، آنکھیں بھی نم ہوئیں اور قلم بھی سرنگوں ہوا لیکن ان سب پر احترام کی ایسی دبیز چادر چڑھی ہوئی تھی جو کم و بیش تیس سال سے میرے سر پر سایۂ عاطفت کا کام کر رہی تھی۔ خاں صاحب کی زندگی میں ہر ملاقات پر میں سوچتا تھا کہ اس عزت واحترام کی کوئی حد ہوگی لیکن ہر بار خاں صاحب اس حد میں اضافہ کر دیتے اور میرے لیے یہ مشکل ہوتی کہ اس حد کو میں کن سرحدوں میں سمیٹوں پھر تھک ہار اور غور فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا کہ علم میں اپنے آپ وہ طاقت نہیں ہوتی جو صداقت اور جرأت کے ساتھ اظہار میں ہوتی ہے۔ مصلحت آمیز نرمی میں بھی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو شفقت آمیز کھرے پن میں ہوتی ہے اور صداقت اور

حقیقت کی اپنی نفسیات اور جمالیات ہوتی ہے جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بذات خود سچے اور اچھے ہوتے ہیں۔ کسی فلسفی نے کہا ہے کہ حسن کی انتہا خوف پر ہوتی ہے اور حسن حقیقی صداقت میں ہوتا ہے اور اسی لیے صداقت میں بھی خوف ہوتا ہے اور صداقت اکثر حقیقت کے مختلف لبادے اوڑھ لیا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ رشید حسن خان زندگی بھر حقیقت کی تلاش میں رہے اس لیے ادبی اصطلاح میں محقق کہلائے۔ نہایت معتبر و محترم محقق۔ لیکن تلاش حقیقت اور اظہار حقیقت کا رویہ صرف ادب تک محدود نہ تھا بلکہ زندگی کے معاملات، معمولات اور تعلقات میں بھی تھا۔ بالکل سچا اور کھرا جیسے سورج کی شعاعیں جن میں حرارت بھی ہوتی ہے اور سخاوت بھی۔

۱۹۷۴ء میں ایم۔اے۔ کرنے کے بعد میں نے عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں پر تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل۔ لکھنے کا کام شروع کیا۔ وظیفہ ملتا تھا اس لیے مختلف شہروں اور لائبریریوں کو دیکھنے کے اتفاقات ہوئے۔ علی گڑھ، دہلی کچھ زیادہ ہی آنا جانا ہوا۔ دہلی میں قمر رئیس صاحب جو فکشن کے بڑے ناقد اور میرے استاد (پروفیسر سید محمد عقیل) کے دوست ہیں، ان سے ملاقاتوں کے سلسلے پہلے قائم ہوئے۔ محمد حسن، شارب ردولوی، ظہیر احمد صدیقی، خلیق انجم، شریف احمد، مغیث الدین فریدی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں اور خوب ہوئیں۔ انھیں دنوں انھیں لوگوں میں سے کسی کے یہاں خاں صاحب کی بھاری بھرکم کتاب 'اردو املا' دیکھی۔ بس دیکھی، چھونے تک کی ہمت نہ کر سکا۔ ان دنوں اس کتاب کے بڑے چرچے تھے اور املا کے نئے نئے زاویے اور رشتے پر تذکرے تھے۔ میں ان سب سے ناواقف تھا اس لیے کہ بچپن سے ہی میری ہر طرح کی گرامر غلط رہی ہے۔ اس کے باوجود خاں صاحب نے مجھے شفقت دی۔ یہ ان کی گرامر کا معاملہ تھا۔

کسی نے کہا کہ رشید حسن خاں سے ضرور ملو۔ انھوں نے شرر کی کتاب 'گزشتہ لکھنؤ' پر بہت معرکے کا مقدمہ لکھا ہے۔ پھر وہ تحقیق کے آداب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تحقیق سے وابستہ تھے اور گوائر ہال میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے ان کے کمرے پر گیا۔ تعارف ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ تحقیق کا موضوع سنا تو

گرم ہوئے لیکن جب نگراں کا نام سنا تو نرم ہوئے۔شفقت سے بولے:

''میاں آپ کو معلوم ہے کہ شرر نے کتنے ناول لکھے ہیں؟''

''غالباً پینتیس (۳۵)''

''یہ غالباً کیا ہوتا ہے..... تحقیق کا یہ مزاج نہیں.....''

''پھر کیا مزاج ہوتا ہے؟'' میں نے جسارت کی۔ کس طرح کی یہ خود مجھے نہیں معلوم۔

مسکرائے.... ''اچھا سوال لیکن طالب علمانہ... ٹھیک ہے اسی طرح طالب علم بنے رہیے کبھی استاد نہ بننا..... '' پھر مڑے اور فرمایا:

''تحقیق کا مزاج حقیقت کی تلاش ہے اور یہ بھی کہ حقیقت کو شک کی نگاہ سے دیکھو جب تک وہ ہر اعتبار سے مکمل و معتبر نہ ہو جائے.....''

بس، یہی جملہ یاد رہا حالاں کہ وہ خاصا زیادہ بولے تھے، کچھ اتنا زیادہ کہ میں خود انھیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا لیکن خاں صاحب ایک زندہ حقیقت تھے جس پر سیکڑوں شک پلک جھپکتے قربان ہو جاتے۔ پھر اچانک بولے:

''تم نے کھانا کھایا؟.....''

''جی نہیں!''

''چلیے میرے ساتھ ہاسٹل کے ڈائننگ ہال کی طرف شاید آپ کا بھی کھانا مل جائے۔''

پھر وہ مجھے لے کر گوائر ہال کی طرف چل پڑے۔ کھانا مل گیا۔ خالص شاکاہاری۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے کی طرف لے گئے.... اسے دکھایا اور پھر باہر ہی سے لوٹا دیا اور کہا:

''یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ آپ چار بجے آیئے گا.....''

میں بیرنگ واپس لوٹ آیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ خاں صاحب کس قسم کی شخصیت ہیں پھر بھی مسرت کا ایک بے نام جذبہ طاری تھا کہ آج ایک بڑے محقق سے ملاقات ہو گئی۔

اب میری تحقیق کی راہیں تو آسان ہوں گی شاید زندگی کی راہیں بھی۔

میں نے چار بجے حاضری دی، وہ تیار تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے لے کر یونیورسٹی کافی ہاؤس گئے جہاں انھوں نے نہایت کالی سی کافی پی اور میں نے نسبتاً گوری، لیکن جو گفتگو کی اس سے ان کی شخصیت کا اجلاپن مجھ پر ظاہر ہونے لگا اور میں گوری کافی پی کر بھی من کی سیاہی دور نہ کر سکا۔ کافی ہاؤس میں انھوں نے ادب و تحقیق کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ فٹ بال کے بارے میں بتاتے رہے کہ وہ فٹ بال کھیلتے تھے اور گول کیپر تھے۔ میں حیران تھا کہ ادب کا اتنا بڑا اسکالر فٹ بال کے میدان کا گول کیپر ۔ مجھے فٹ بال سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ یہ بات ان کو پسند نہ آئی اس لیے کافی ہاؤس سے نکلنے کے بعد وہ فٹ بال میچ دیکھنے چلے گئے اور مجھ سے رسماً بھی نہیں کہا۔ کیوں کہتے، مجھے فٹ بال پسند جو نہ تھا۔ وہ رسمیات کے قائل نہ تھے کوئی دوسرا رسمی باتیں کرے یہ بھی انہیں پسند نہ تھا فوراً ٹوک دیتے ۔ ذرا بھی مروت نہ کرتے۔ عجیب انسان تھے خاں صاحب۔ کم از کم، عام اردو والوں سے بالکل عجیب اور آج کے اردو والوں سے بالکل غریب۔ اس زمانے میں اردو دنیا میں خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام کا طوطی بول رہا تھا اور بڑے بڑوں پر (حالاں کہ وہ لوگ چھوٹے تھے) ان کا رعب طاری تھا لیکن خاں صاحب ان چیزوں سے بے نیاز تھے بلکہ یہ بزرگ حضرات خائف رہتے کہ کب شاہ جہانی پٹھان دہلی علی گڑھ کی طرف رخ کرلے۔ کبھی کبھی وہ کر بھی لیتے تھے جس کی اپنی کچھ نفسیاتی وجہیں بھی تھیں اسلیے کہ وہ ایک انسان بھی تھے۔ وہ پروفیسر نہ تھے۔ کسی ادارے کے ڈائرکٹر بھی نہ تھے وہ اسکالر تھے۔ بہت بڑے اسکالر جس کی گردن خم تھی اور ٹوپی ترچھی.... وہ جانتے تھے کہ علم و ادب کا رشتہ پروفیسر اور ڈائرکٹر سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ اکثر کہتے اور ایک بار انھوں نے مجھے ایک خط میں بھی لکھا تھا....

''میاں ! جو گھر کے اندر سر جھکا کر کام کرتا ہے وہ گھر کے باہر سر اٹھا کر چلتا ہے۔ ذرا اردو کے پروفیسروں کو دیکھو زیادہ تر کی نظریں جھکیں اور کمر خمیدہ رہتی ہے۔''
''یہ علم کا بوجھ بھی ہو سکتا ہے۔''

"نہیں یہ جہالت کا بوجھ ہے۔ جہالت کا بھی اپنا بوجھ ہوتا ہے جو علم کے مقابلے ازخود زیادہ اظہار کے راستے اختیار کر لیتا ہے.... کیوں کہ علم بردباری اور سنجیدگی لاتا ہے اور جہل شوخی اور بے حجابی....."

کچھ اور باتیں ہوئیں حق کے بندوں پر حق کا فضل نازل ہوتا رہا۔ شریفوں پر بھی بوچھار رہی۔ کچھ اس انداز سے کہ ہم سرور میں آ گئے۔ اب اس کی تفصیل کیا بیان کروں کیوں کہ ان میں بیشتر لوگ اب اس دنیا میں نہیں رہے اور اب تو خاں صاحب بھی نہیں رہے۔

انھیں ملاقاتوں میں ایک دن انھوں نے اپنی ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کا ذکر کیا اور پھر علاحدگی کا۔ وہ جو اسباب بتاتے تھے اس سے میں کبھی متفق نہ ہو سکا اور میں یہی نتیجہ نکالتا تھا کہ خدا نے خاں صاحب کو کچھ دوسرے کاموں کے لیے بنایا تھا اور وہ کام انھوں نے کیے اگرچہ کافی بعد میں کیے لیکن بلاشک وہ غیر معمولی اور یادگار کام ہیں۔ انھوں نے خاں صاحب سے کچھ اہم اور بڑے کام کروا لیے۔ وہ خود بہت اچھے ادیب محقق اور خاں صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف۔

شرر پر کام کرتے وقت خاں صاحب نے مجھے بھی تحقیق کے آداب سکھائے اور ساتھ ہی زندگی کے بھی (جو میں ٹھیک سے سیکھ نہ سکا) لیکن آدابِ تحقیق تو اس وقت بہت کام آئے۔ مسعود حسن رضوی ادیب سے ملنے کی ہدایت کی۔ لکھنؤ میں ناولوں کی تلاش کرنے کے مناسب مقامات بتائے پھر اچانک سوال کیا:

"آپ کو معلوم ہے کہ شرر کی جائے پیدائش کیا ہے؟"

"لکھنؤ ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ لکھنؤ کے جھوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔"

میں نے عرض کیا۔

"نہیں وہ لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے، وہ بارہ بنکی کے قصبہ کرسی میں پیدا ہوئے چوں کہ کرسی بیوقوفوں کے لیے مشہور تھا اس لیے انھوں نے یہ بات چھپائی..."

"لیکن آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟"

''پھر کی حماقت کی بات... تحقیق میں یہی سب تو معلوم کرنا پڑتا ہے۔آپ بھی کرسی جایئے ان کی نواسی کی اولادیں ہیں، ان سے ملیے کچھ اور تفصیل لے کر آیئے۔''

چنانچہ خاں صاحب نے ہی مجھے کرسی بھیجا اور میں گیا۔کرسی میں مجھ پر کیا گزری یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر پھر کبھی... وہاں مجھے کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے شرر کا ایک گھریلو قسم کا معمولی سا خط جو انھوں نے لندن سے اپنی نواسی کو لکھا تھا۔لیکن شرر کی تحریر دیکھ کر ضرور خوشی ہوئی۔میں نے اپنے مقالے میں شرر کی پیدائش کرسی ہی بتائی اور ثبوت کے طور پر رشید حسن خاں کا نام لکھ دیا، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے محقق کا کہہ دینا ہی میرے لیے کافی تھا۔پھر انھوں نے اس کی بھی ہدایت کی کہ لکھنؤ کے حکیموں کے محلے میں جا کر شرر کا مزار تلاش کروں۔مجھے فکر ہوئی کہ کہیں وہ بھی کرسی میں نہ ہو لیکن وہ مجھے اس محلے کے قبرستان میں ملا جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہو گئیں۔...کیسے کیسے بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کام کر کے اب زمین کے نیچے دفن ہیں۔سچ ہے کہ انسان کا کام زندہ رہتا ہے، اس کی نیکیاں زندہ رہتی ہیں۔اس مضمون کو لکھتے وقت کم وبیش یہی جذبہ خاں صاحب کے لیے امڈ رہا ہے کہ انھوں نے مجھے کیسے کیسے مشورے دیے، کیسی راہ دکھائی۔اگر وہ نہ ملے ہوتے تو میں تحقیق کی خاردار راہ کس طرح طے کر پاتا۔یہی نہیں وہ زندگی کے نرم و نازک باتیں بھی سکھاتے۔ایک بار ایک اور ایسی بات کہی جو میرے دل میں نقش ہو گئی۔استاد محترم سید محمد عقیل کے تئیں میری عقیدت دہلی کے سمیناروں میں ان ساتھ آمد و رفت اور تھوڑی خدمت کو دیکھ کر ایک بار بڑی محبت اور سنجیدگی سے بولے:

> ''آپ اپنے استاد کی اتنی عزت و خدمت کرتے ہیں، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی اس دور میں استاد شاگرد کے ایسے رشتے اب کہاں...آپ ان کی خوب عزت کیجیے۔عقیل صاحب لائق اور شریف انسان ہیں...لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اگر آپ کو اپنی پہچان بنانی ہے تو برگد کے سایے سے نکلنے کی بھی کوشش کیجیے.....''

اس سلسلے میں وہ اکثر مجھے سمجھاتے، ہدایتیں دیتے، اکثر ڈانٹتے بھی تھے۔
مضامین کی کمزوریوں اور بالخصوص زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے۔ آج مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری زبان کو درست کرنے اور نفسِ مضمون کو خاص ڈھنگ سے پیش کرنے کا ہنر جیسا مجھے خاں صاحب نے سکھایا کسی اور نے نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نالائق اتنا سیکھ نہ سکا جتنا کہ سیکھ لینا چاہیے تھا۔

ڈی فل. کی ڈگری ملنے کے بعد جب مجھے پہلی ملازمت سینٹ جانس کالج آگرہ میں ملی تو وہ بہت خوش ہوئے اور بتایا کہ یہ کالج اور اس کا اردو شعبہ بڑا تاریخی ہے۔ یہاں مولانا حامد حسن قادری اردو کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے اس شعبے کو زندہ کیا جسے بعد میں فریدی نے ڈبو دیا۔ اب تم اس زندہ کرو اور میکش صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔ شعبہ بہت کمزور تھا طلبہ ندارد اس لئے جوائن کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اسے متحرک کروں۔ میں نے پہلے ہی سال اکبر آباد کے شاعروں پر ایک سیمنار اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں بھی خاں صاحب نے میری بڑی مدد کی۔ وہ اس وقت یوپی اردو اردو اکادمی کے مجلس انتظامیہ کے اہم رکن تھے اور علی جواد زیدی صدر تھے جو خاں صاحب کو بہت مانتے تھے۔ دونوں حضرات نے اکادمی سے دس ہزار روپے دلوائے جو اس وقت اچھی رقم تھی اور دونوں حضرات تشریف بھی لائے، اس سیمنار میں کافی لوگ آئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، سید محمد عقیل، شبیہ الحسن، عنوان چشتی وغیرہ۔ شعرا میں جذبی، وامق، تاباں، اور میکش وغیرہ۔ بعد میں کسی اور تقریب میں آل احمد سرور بھی آئے وہ بھی اسی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ بہر حال وہ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔ جس سے شعبہ اردو کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس پروگرام میں جس قدر خاں صاحب نے دلچسپی لی میں نے اس کے بعد کہیں نہیں دیکھا۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے مجھے اکادمی کا ممبر بنوایا۔

پروگرام کے بعد عقیل صاحب اور خاں صاحب نے دو ایک دن اور قیام کیا۔ میرے کرایے کے مکان پر بھی تشریف لائے، دعوت قبول کی، بیوی اور بیٹی سے ملاقاتیں کیں۔ بیٹی کو گود میں لیے رہتے۔ چوں کہ میں وہاں اکیلا تھا اور کوئی بزرگ ساتھ نہ تھا،

چنانچہ میری بیٹی دونوں بزرگوں سے گھل مل گئی اور ہر وقت دادا کہتی رہتی ۔لگتا ہی نہ تھا کہ وہ ایک بڑے محقق اور دانشور ہیں بلکہ خاندان کے ہی ایک بزرگ چچا بابا کی طرح کچھ یہ بھی کہ کھرا انسان باہر سے جتنا سخت اور بے باک ہوتا ہے اندر سے اتنا ہی نرم وشفیق اور پیارا۔ اس کا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس میں دور دور تک غبار کا نام نہیں ۔شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

خاں صاحب نہ منہ دکھانے میں یقین رکھتے تھے اور نہ ہی پیری میں ....تاہم کدورت سے پاکیزگی ان کے ایمان وایقان کا بنیادی حصہ تھا۔ان معنوں میں وہ بالکل صوفی کی طرح تھے جہاں سے پاکیزگی کے سبق سیکھے جاسکتے تھے۔میں آگرہ میں تقریباً تین سال رہا،اس مدت میں میں نے دو بڑے مذاکرے اور مشاعرے کیے۔اس درمیان میں نہ جانے کتنی بار دہلی گیا اور ان سے ملا۔اسکا کوئی حساب کتاب نہیں ۔وہ ایک بار اور آگرہ آئے بالکل اکیلے۔وہ اکیلے آنا بھی چاہتے تھے۔مقصد آگرے کا تاج محل دیکھنا نہ تھا بلکہ ادب کے قطب مینار میکش اکبر آبادی سے ملاقات کرنا اور تنہائی اور سکون کے چند دن گزارنا۔جو دہلی میں الگ تھلگ زندگی گزارنے کے باوجود ممکن نہ تھا کچھ وہ حساس بھی زیادہ تھے اور بے باک تو تھے ہی لیکن بحیثیت مجموعی طبیعت اس قدر نفیس اور شفاف پائی تھی کہ علم وادب کی ذرا سی پراگندگی انھیں جلد کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔حالات بھی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ علمی واخلاقی معیار واقدار روز بہ روز گرتا ہی جا رہا تھا۔یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں سے تو وہ سخت نالاں رہتے جس انداز سے ان مقالات کے محققین اپنی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے یہ خاں صاحب کیا کسی بھی شریف النفس اور ذی علم انسان کے لیے اذیت ناک ہوسکتا ہے۔مجھے ہدایت کرتے کہ "تم اپنا مقالہ شائع ضرور کرو لیکن اس پر نظر ثانی ضرور کرنا اس کے بعد ہی شائع کرنا"۔افسوس کہ اس وقت آگرہ میں میرے پاس مقالہ نہ تھا ورنہ وہ چار دن جو انھوں نے میرے ساتھ یا میں نے ان کے

ساتھ آگرے میں گزارے اس پر مزید اصلاح لیتا، وہ کچھ اور معتبر ہو جاتا۔ اس قیام کے درمیان انھوں نے سیماب اکبرآبادی کا محلہ ومکان دیکھا جہاں وہ اور شاعر پیدا ہوئے۔ میکش صاحب کے آستانے پر کئی بار گئے جہاں فانی، جوش، وغیرہ کی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ حیرت انگیز انکشافات ہوئے مثلاً فانی کی دلچسپی رمل اور جوشؔ کی تصوف سے، ان سے متعلق واقعات۔ میکش صاحب نے بتائے انھوں نے اخضر اور سیماب کی رقابتیں جذبی اور مجاز کی شرارتیں، فانی اور مانی کے ادارے۔ صبا اکبرآبادی کے مرثیے۔ اخضر اکبرآبادی کے گھر والوں سے ملاقاتیں اور اس دور میں بھی اکبرآباد کے شعرا کی گھاتیں یہ سب کی سب میرے سامنے آئیں اور میں ان سب سے بے نیاز سلسلۂ قادریہ کو مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ اسی درمیان میں نے تحقیقی نوعیت کے کئی مضامین نظیر اکبرآبادی پر لکھے جو میں نے پہلے خاں صاحب کو دکھائے اور جو انھیں قدرے پسند آئے اور چھپوائے۔ اسی سلسلے میں نظیر پر میرے ایک مضمون میں میں نے قیاساً نظیر کو غالب کا استاد ثابت کیا تھا۔ خاں صاحب تحقیق میں قیاس کے قائل نہ تھے۔ ایک خط میں صاف طور پر لکھا:

> ''غالب کے تلمذ نظیر سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ غالباً یہ گپ باطن کی اڑائی ہوئی ہے۔ نظیر کا سال پیدائش بھی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ شہباز نے جو کچھ لکھا ہے محض قیاس آرائی ہے اور کچھ نہیں۔ بعض اور لوگوں کی طرح نظیر کا سال ولادت اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔''

ڈھائی تین سال آگرے میں گزارنے کے بعد امکانات ہوئے کہ میں علی گڑھ یا الہ آباد چلا جاؤں۔ خاں صاحب نے سختی سے علی گڑھ جانے کو روکا اور الہ آباد جانے کو کہا۔ علی گڑھ کی ڈھیر ساری برائیاں کیں۔ آل احمد سرور کی کچھ زیادہ پھر جب میرا تقرر الہ آباد یونیورسٹی میں ہو گیا تو مبارک باد کا پہلا خط خاں صاحب کا آیا:

> ''یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا انتخاب الہ آباد کے لیے ہو گیا۔ اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ عقیل

صاحب کو آپ جیسے مخلص کی واقعتاً شدید ضرورت محسوس
ہوگی.... لیکن اب اصل مسئلہ آپ کے جانشین کا ہے اسکے
لیے کچھ کیجیے ورنہ بڑا نقصان ہوگا۔"

جہاں ان کو یہ فکر تھی کہ سینٹ جانس کالج کے شعبہ اردو کا کیا ہوگا وہاں وہ اس بات پر خوش تھے کہ الہ آباد میں مجھے آسانیاں ہوں گی اور پڑھنے لکھنے کے مواقع زیادہ ملیں گے۔ اب ملاقاتیں کم ہوئیں، خط و کتابت زیادہ تھی۔ میں زیادہ لکھتا، ان کے جواب میں اکثر تاخیر ہو جاتی لیکن جب جواب آتا تو اس میں روکھی پھیکی تحقیق نہ ہوتی پیار بھرے دلچسپ جملے ہوتے، محبت و شفقت ہوتی جو بڑا مزہ دیتی۔ ایک خط کے یہ جملے دیکھیے:

"میاں! میں تمھارا گنہ گار ہوں کہ خط کا جواب اب لکھ
رہا ہوں حالاں کہ خط بہت پہلے ملا تھا۔ معذرت کیا
طلب کروں تاخیر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم اگر ناراض
ہو تو اس کا حق پہنچتا ہے۔ لیکن چوں کہ ہو بہت مہذب
اور وضع دار اس لیے دل یہ کہتا ہے کہ جلد ہی من جاؤ
گے۔ یہ دیکھ کر اس قدر اور اس طرح کا اعتماد ہر ایک پر
تو نہیں ہوتا.... توقع کرتا ہوں کہ بیگم اب بہ خیریت ہوں
گی۔ عقیل صاحب سے خیریت معلوم ہوگئی تھی۔ مقالے
کی کتابت غالباً شروع ہو چکی ہوگی اور توقع کرتا ہوں کہ
جلد ہی آنکھیں اس سے روشن ہو سکیں گی۔ بھائی! کبھی
کبھی خط ضرور لکھا کرو۔ میں ہر اک سے دل نہیں
لگاتا۔ نہ توقع قائم کرتا ہوں اور نہ فرمائش کرتا ہوں جب
خط ملتا ہے تو کچھ دیر کے لیے جی خوش ہو جاتا ہے اور اب
یہ نعمت کمیاب ہے۔

"بھائی وہ آگرے میں کتب خانہ محمد یہ قائم کب ہو

گا۔ میں نے کہا تھا کہ جب تم ادھر آؤ تو میں بھی
آجاؤں۔ اب تو سردی شباب پر ہے۔ اگر ممکن ہو تو اواخر
فروری میں اس کام کو کر ڈالو ثواب ملے گا اور کیا کہوں
ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تھوڑا سا پیٹھا خانے کو مل
جائے گا۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ
رشید حسن خان (دستخط)
29.12.1983

ایک اور خط کی زبان اور لہجہ ملاحظہ کیجئے۔ الہٰ آباد کے کسی سمینار میں میں نے
مدعو کیا تو جواب آیا:

''تم تو آرام جاں تھے، یہ دشمن عافیت کیسے ہو گئے؟ بوڑ
ھا بیمار شخص اس کو زمین کا گز بنانا چاہتے ہو اور اس عالم
میں جب کہ یہاں کوئی قاعدے کی ٹرین نہیں گزرتی۔
اب میں دہلی جاؤں، وہاں کسی کو لکھ کر رزرویشن
کرواؤں وہ صاحب بھی اس نار وازحمت کو گوارا
کرلیں۔ تب الہ آباد کی گاڑی میں بیٹھوں۔ کتنے اگر
مگر ہیں اس میں... اچھے بچے اچھی باتیں کیا کرتے ہیں
تم بھی ویسی ہی باتیں کیا کرو... وہاں مجھ سے کہیں بہتر
لوگ آئیں گے جو واقعی روشن خیال ہوں گے اور زمانہ
شناس (شاید زمانہ ساز بھی ہوں) ایسے میں میری
ضرورت نہ گنجائش اور پھر غالب خستہ کے بغیر کون سے
کام بند ہیں۔ میاں! میری معذرت قبول کرو۔ خدا
(جسکے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ ہے تو کہاں ہے) تک

کو جنت دے گا اور بہت سی حوریں۔ اگر اچھے دل سے
مان لو گے یہ بات، برے دل سے مانو گے تو وہاں
حوروں کی جگہ غلمان ملیں گے۔ یہ یاد رکھو۔

نئے شمارے کا منتظر ہوں
رشید حسن خاں
۲۳؍مارچ ۱۹۹۸ء

ان تحریروں کو ملاحظہ کیجئے۔ کیا یہ وہی خاں صاحب ہیں جو اپنی خاں صاحبیت کے لیے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ ان جملوں میں غیر معمولی شفقت و اپنائیت جھلکی پڑتی ہے۔ مجھے خیال آرہا ہے کہ سیمینار کا موضوع سماجی اور سیاسی نوعیت کا تھا جس سے ان کو اتنا لگاؤ نہ تھا۔ حالاں کہ خط کے آخری جملے میں مذہب سے بے نیازی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے مذہب کے موضوع پر گفتگو کی لیکن اتنا یقین تھا کہ وہ مذہب دل پر یقین رکھتے تھے ایک بار انھوں نے مجروح کی ایک غزل کی بہت تعریف کی اور شعر کی بطور خاص:

ہم سے کہا جبریلِ جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ بڑی دیر تک جبریل جنوں کی ترکیب کی تعریف کرتے رہے حالاں کہ وہ تعریف بہت کم کرتے تھے خاص طور پر ترقی پسندوں کی لیکن وہ تعریف سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے خاں صاحب کو اپنی تعریف کرتے کبھی نہیں سنا بلکہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو ٹال جاتے اور کوئی مذاق بھرا جملہ نکال کر بات کا رخ موڑ دیتے۔ میں نے کبھی انہیں غیر سنجیدہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی غیر سنجیدہ سے کوئی سنجیدہ گفتگو کرتے دیکھا۔ ان کے اپنے اصول تھے اور اصولوں سے بھرا ردیہ جس کی وجہ سے وہ بیحد 'چوزی' (Choosy) تھے جیسا کہ اس خط کی تحریر سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۸۶ء میں میرا تحقیقی مقالہ 'عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار' نصرت پبلیشرز لکھنؤ

سے عابد سہیل صاحب نے شائع کردیا۔ مقالہ اچھا نہ چھپا تھا اس لیے خاں صاحب نے جب دیکھا تو اس کی اشاعت پر تو خوش ہوئے لیکن خراب طباعت پر ناراض بھی ہوئے۔ پیچھے میری تصویر تھی اور عابد سہیل کا لکھا ہوا تعارف اور تھوڑی سی تعریف۔ یہ بھی خاں صاحب کو ناگوار گزرا۔ میں نے دہلی جا کر مقالے کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا بولے:

''یہ تصویر اور تعارف کیوں ہے؟''

اب میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ پھر فرمایا:

''یہ تعریف۔ یہ نمائش انسان کو بے ضمیر بناتی ہے۔ سنجیدہ لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ تمھارا کام خود تعارف کرائے گا اور شہرت بھی دے گا....''

اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ آئندہ کتابوں میں ان باتوں سے پرہیز کروں گا۔

اس درمیان ان سے کئی سیمناروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ اگر وہ سیمنار تحقیق لسانیات اسی قسم کے ملتے جلتے موضوع پر ہوتے تو خاں صاحب کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ ہو پاتا لیکن اگر خالص ادبی یا شعری موضوع پر ہوتا تو بات ذرا کچھ الگ سی ہو جاتی۔ کسی سیمنار میں فیض پر مقالہ پڑھا جو فیض کے خلاف چلا گیا۔ لوگوں نے خوب بحث کی۔ اسی طرح فانی، فراق، پر پڑھے گئے مقالات میں وہ بات نہ تھی جس کے لیے خاں صاحب شہرت رکھتے تھے۔ دراصل ان کا میدان ہی مختلف تھا۔ متن، زبان اور املا پر ان کی گہری نظر تھی، ان سب پر وہ غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ کلاسیکی ادب اور کلاسیکی زبان، اس کی نوک پلک لفظیات، محاورات اور لب و لہجے پر ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ جس شخص نے 'باغ و بہار' 'سحر البیان' گلزار نسیم' زہر عشق' وغیرہ کی تدوین کا کام کیا ہو اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہی الگ نوعیت کے ہیں اور شاعری کے رجحانات، میلانات، جمالیات و نفسیات کے معاملات کی دنیا الگ ہوا کرتی ہے۔

شرر والی کتاب کے اشاعت کے کئی سال بعد میں نے شرر پر ایک مونو گراف پڑھا جسے ساہتیہ اکادمی دہلی نے شائع کیا تھا جو ہمارے شہر الہ آباد کے ہی ایک ادیب کے

ذریعے لکھا گیا تھا۔ اسکو پڑھ کر حیران ہوگیا۔ اس مونوگراف میں جا بہ جا میری کتاب سے اقتباسات لئے گئے تھے اور اس کا کہیں کوئی حوالہ نہیں اور کتابیات میں بھی میری کتاب کا ذکر تک نہیں۔ میں نے یہ تکلیف دہ بات خاں صاحب کو لکھی ، فرمایا دونوں کتابیں لے کر دہلی آجاؤ میں بغیر دیکھے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میرا دہلی جانا ہوا تو میں نے خاں صاحب کو دونوں کتابیں دکھائیں۔ انھوں نے بغور دیکھا تو حیران رہ گئے ۔ چہرہ تمتمایا، کہا، آپ دونوں اقتباسات کا ایک خاکہ تیار کیجئے اور بتایئے کہ کس صفحے پر آپ کی کیا تحریر ہے اسی کے سامنے اس کی تحریر بھی پیش کیجئے۔ دہلی سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ ناپسندیدہ کام انجام دیا۔ ایسے نشانات کی تعداد تقریباً بیس تھی جہاں میری کتاب سے سرقہ کیا گیا تھا۔ مضمون خاصا طویل ہوگیا تھا تاہم میں نے اسے خاں صاحب کو بھیجا، انھوں نے پورے غور وخوص کے بعد اسے خلیق انجمن صاحب کو برائے اشاعت دے دیا۔ جلد ہی وہ تین قسطوں میں ہماری زبان میں شائع ہوا۔ لوگوں نے مجھے داد دی اور سرقہ بردار نے بیداد، جو ہونا ہی تھا۔ کچھ مقامی لوگوں نے یہ بات بھی کہی کہ یہ سراسر چوری ہے اور غیر دیانت داری۔ آپ مقدمہ دائر کیجئے۔ میں نے پھر خاں صاحب سے مشورہ کیا۔ ڈانٹا کہ بس ہوگیا مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ادبی معاملات عدالتوں میں طے نہیں ہوتے۔ بس خاموش ہو جایئے۔ اور میں خاموش ہوگیا۔

اس درمیان خاں صاحب ریٹائر ہوگئے تو کام کی بھیڑ اور زیادہ ہوگئی۔ ہمہ تن مصروف ان دنوں خاں صاحب کے نام کا طوطی بول رہا تھا۔ ہندو پاک میں ان کے نام کی غیر معمولی شہرت وعزت تھی۔ احترام وادب سے ذکر ہوتا۔ جا بجا بلائے بھی جاتے لیکن ہر جگہ کہاں جانے کو تیار ہوتے۔ یہی وہ مقام ہے جب خلیق انجم صاحب نے انھیں بڑا سہارا دیا اور انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ کر کے ان سے بہت اچھے اور بڑے کام کروائے۔ میں تحقیق کا آدمی نہ تھا اور نہ ہوں لیکن نظیر سے متعلق مضامین اور شر والی کتاب نے نہ جانے کیا تاثر دے رکھا تھا کہ وہ اکثر مجھے تحقیقی نوعیت کا کام سونپتے اور رائے مشورے بھی کرتے۔ زہر عشق سے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزم!

ایک ضروری بات اور:

میں نے نواب مرزا شوق لکھنوی کی تین مثنویوں (فریب عشق، زہر عشق، بہار عشق) کو مرتب کرنے کا خاکہ بنایا ہے۔کام بھی شروع کر دیا ہے۔ مجھے ان مثنویوں کے قدیم اڈیشن کی ضرورت ہے یعنی ۱۲۶۰ھ سے لے کر ۱۲۸۰ھ تک کے چھپے ہوئے۔ ذرا میرے کرم فرما عقیل صاحب سے پوچھوان کو کسی نہ کسی نسخے یا نسخوں کا احوال ضرور معلوم ہوگا اصل نسخے کی ضرورت نہیں، اس کا عکس بہ آسانی بن سکتا ہے اور وہاں لائبریری میں ضرور ہونا چاہئے۔ میری خاطر ایک دن خراب کر ڈالو اور لائبریری میں تلاش کرلو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔

'گلزار نسیم' چھپنے چلی گئی دس بارہ دن میں چھپ کر آجائے گی (۷۲۴) صفحے بنے ہیں۔ اس میں چکبست و شرر کے پورے معرکے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چوں کہ اس کے بعض مباحث کا تعلق شرر سے یعنی تم سے ہے اس لیے یہ ارادہ ہے کہ ایک جلد بھیج دوں گا تمھارے لیے اگر تم کو اس قدر ضخیم کتاب سے وحشت نہ ہو۔ انتساب کی بشارت سے خوش ہونا قدرتی بات ہے مجھے بھی مسرت ہوگی۔ شکریہ پیشگی۔

رشید حسن خاں

۱۲/مارچ ۱۹۹۵ء''

میرے پاس 'زہر عشق' کا ایک پرانا نسخہ تھا جو مصور تھا۔ میں نے آگرہ سے حاصل

کیا تھا وہ پورا بھیج دیا ظاہر ہے کہ اس بات پر وہ خوش ہی ہوئے لیکن اس سے زیادہ میں خوش تھا کہ خاں صاحب کی خدمت کرنا میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ خوب دعائیں ملتی تھیں، چند ماہ کے بعد ڈاک سے ایک موٹی کتاب ملی یہ 'گلزار نسیم' کا جدید ترین اڈیشن تھا جسے ترتیب دیا خاں صاحب نے اور شائع کیا انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے۔ اس کے پہلے ورق پر لکھا تھا عزیز فاطمی کے لیے... اسی طرح بعد میں انھوں نے مثنویات شوق، والی کتاب بھی بھیجی اس میں بھی یہی لکھا۔ یہی نہیں انھوں نے اپنی اس زمانے (۱۹۷۸ء) کی کتاب 'ادبی تحقیق' بھی اس شفقت اور جملوں کے ساتھ عنایت کی تھی، 'گزشتہ لکھنؤ' کا نسخہ بھی ان کی دستخط کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے۔ گاہے بگاہے ان کتابوں کو، اس مضمون کو لکھتے ہوئے بطور خاص جب میں ان کتابوں کو الٹا پلٹا، ان کے قلم سے اپنا نام لکھا دیکھا تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آج خاں صاحب ہم میں نہیں لیکن مجھے ہمیشہ یہ فخر رہے گا کہ اتنا بڑا محقق عظیم ادیب میرا محسن رہا ہے اور مجھے اس نے بے پناہ شفقتوں سے نوازا ہے۔ اولاد کی طرح چاہا مانا ہے۔ ۱۹۹۹ء کے کسی ماہ میں مجھے خاں صاحب کا ایک خط بمبئی سے ملا جس میں علالت و علاج کا تفصیلی ذکر تھا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ وہ بار بار بمبئی کیوں جا رہے ہیں۔ ایک بار جب وہ بمبئی میں تھے تو اتفاق سے میرا بمبئی جانا ہو گیا۔ فون پر بات کی۔ وہ اپنے کسی غیر مسلم دوست کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے جو سانتا کروز میں تھا۔ میں اپنے دوست الیاس شوقی کیساتھ ان سے ملنے گیا۔ وہ ہم لوگوں کو پا کر بہت خوش ہوئے لیکن میں ان کی صحت دیکھ کر بجھ سا گیا۔ وہ کمزور سے لگے، ان کے چہرے پر نقاہت تھی بہر حال ہم لوگوں کو پا کر جیسے ان میں جان آ گئی ہو۔ بمبئی میں کالی داس گپتا رضا، دلوی اور ان دونوں سے زیادہ ذہنی طور پر باقر مہدی سے بہت قریب تھے۔ دونوں کا قارورہ ملتا تھا کھرے پن کا قارورہ۔ خاں صاحب ذات کے پٹھان تھے تو باقر مہدی ادب کے پٹھان، کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے جب جس کو چاہیں علم کی قلابازی سے ادب کے دنگل میں چت کر دیتے۔ جھوٹ اور مکر و فریب کو دونوں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی لیے دونوں میں خوب پٹتی تھی۔ خاں صاحب نے اپنی کوئی کتاب باقر مہدی کے نام معنون کی تھی شاید باقر مہدی

نے بھی۔اب یاد نہیں۔بمبئی اور شاہ جہاں نپور کے کئی چکر لگے تو مجھے کچھ زیادہ ہی فکر ہوئی۔ہر بار بمبئی جانا ممکن نہ تھا اس لیے شاہجہانپور جانے اور ملنے کی خواہش ہوئی۔عقیل صاحب بھی تیار ہوئے۔فون کیا تو کمزور سی آواز آئی۔شاہجہانپور آنے کو منع کر دیا دہلی کے غالب سمینار میں ملاقات ہوگی اور دہلی کے غالب سمینار میں ملاقات ہوئی۔کچھ بہتر لگے شاید اسی لیے سمینار میں شرکت کر سکے۔ڈاکٹر اسلم پرویز کے یہاں پرانی دہلی میں ٹھہرے تھے۔اس زمانے میں پتہ نہیں کہاں سے مجھ پر یہ جنون سوار ہوا کہ میں کلیات نظیر اکبر آبادی ترتیب دوں۔جب یہ خواہش میں نے قومی اردو کونسل دہلی کے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے سامنے رکھی تو تیار ہو گئے۔میں نے جب اس کا ذکر خاں صاحب سے کیا تو وہ سوچتے رہے پھر بولے.... یہاں نہیں گھر آیئے وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔شام کو میں اسلم پرویز صاحب کے گھر گیا۔وہ میرے منتظر تھے۔جب اس منصوبے پر گفتگو ہوئی تو صاف طور پر کہا:

> ''یہ کام تم نہ کر سکو گے۔کسی دیوان یا کلیات کی ترتیب معمولی کام نہیں اگر آپ سیدھے طریقے سے ایک مقدمہ کے ساتھ کلیات شائع کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے لیکن یہ کام بڑا نہ ہوگا... لیکن اگر آپ پورے متن لفظیات اور حواشی کے ساتھ کریں گے تو یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔یہ کام کوئی آگرہ یا برج کا ہی کر سکتا ہے۔ایسے کام میں ہاتھ مت لگایئے جسے آپ کر ہی نہ سکیں....''

خاں صاحب کے اس سچائی سے بھرے مشورے سے وقتی طور پر میرے جوش و جذبے پر اوس ضرور پڑی لیکن سچ یہ ہے کہ انھوں نے بالکل سچ اور کھری رائے دی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا۔پھر میں نے اس کام سے توبہ کر لیا اور بھٹ صاحب سے معذرت کر لی۔وہ خوش ہوئے اور کہا کہ آپ میں اتنی جرأت تو ہے یہ سچ بات محسوس کر سکے ۔یہاں اردو کا ہر کام ہر ادیب کرنے کو تیار رہتا ہے۔کام بعد میں کرتا ہے معاوضے کا مطالبہ

پہلے کرتا ہے۔آپ کی ایمانداری مجھے پسند آئی اس لیے آپ میرے لیے ضرور کوئی کام کریں۔کونسل اردو کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتگان کا کلیات شائع کرنے کا منصوبہ بنارہی ہے ۔اس میں ایک نام علی سردار جعفری کا ہے۔آپ تو ترقی پسند ہیں۔جعفری کا کلیات آپ ہی ترتیب دیجیے نظم ونثر سب۔سلطانہ جعفری سے اجازت دلوانے کا کام بھی آپ کو کرنا ہوگا۔اجازت بھی مل گئی۔وہ جلدیں بھی چھپ گئیں باقی زیرطبع یا زیرترتیب ہیں...غور کیجیے کیاان کاموں کا سہراخاں صاحب کی صحیح مشوروں سے جا کرنہیں ملتا۔دوسرا کوئی ہوتا تو کچھ دوسرے ہی مشورے دیتا۔یہ تھے ہمارے خاں صاحب ۔جس کو چاہتے ٹوٹ کر چاہتے۔سچے مشوروں وہدایات سے نوازتے۔ان کے مشورے ان کی باتیں سونے میں تولی جانے والی ہوتیں ،ان کا صداقت بھرا اظہار،ان کا عاجزانہ اعتراف،ان کی عرق ریزی ،ان کی ایمانداری ،ان کی حق گوئی، زریں حروف میں لکھے جانے والے واقعات ہیں جو اس دور میں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں ۔اس دور میں سچی کھری اور ایماندارانہ باتیں اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

غالب صدی کے موقع پر میں نے 'نیا سفر' کا غالب گوشہ نکالنے کا ارداہ کیا خاں صاحب سے گزارش کی، جواب آیا:

> ''غالب پر مضمون ضرور لکھوں گا۔وعدہ کیا ہے تم سے۔
> مگر جب غالب پر نمبر نکالو گے یا وہاں کسی مذاکرے کا
> انتظام کرو گے۔اب کچھ لکھنے کے لیے کسی تقریب یا
> بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ساراوقت تو اصل کام یعنی
> 'سحر البیان' کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔بمبئی میں بھی
> اسی کام میں لگا رہا۔دو سال ہو گئے ہیں اور ابھی شاید
> ڈیڑھ سال اور لگے گا۔اس کے بعد کیا ہوگا اس کا احوال
> معلوم نہیں۔شاید پھر کچھ نہ ہو۔عقیل صاحب سے میرا
> سلام کہو۔ان کو کبھی کبھی ضرور یاد کرتا ہوں۔ بہت سی

دعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خان

۱۱؍مارچ ۱۹۹۸ء

ان کا مضمون نہیں مل سکا بہر حال گوشہ نکلا تو اس میں میرا مضمون تھا غالب اور سیکولرزم جس کے عنوان پر ہی چونکے پورا مضمون پڑھ کر دو تین جملوں کا ایک خط لکھا:

''اس عنوان کے تحت تم نے حیرانی میں ڈال دیا۔ یہ نیا گوشہ نکالا تم نے مضمون اچھا ہے۔ مبارک باد قبول کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

بلاشبہ خاں صاحب ایک بڑے محقق تھے۔ بڑے ادیب تھے۔ میں ان کے معیار تحقیق کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا یہ میرا میدان نہیں ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بار جانے کس رو میں ایک مضمون تحقیق کی محرومیاں' لکھ گیا مضمون 'نیا دور' لکھنو میں شائع ہوا۔ مضمون پڑھنے کے بعد خاصے ناراض ہوئے۔ ناراض تو خلیق انجم بھی ہوئے اور آئندہ اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کی تاکید کی۔ کوئی اور ہوتا تو ان حضرات کی ناراضگی سے ناراض ہو جاتا لیکن میرے ناراض ہونے کا سوال ہی نہ تھا وہ بھی خاں صاحب سے جن کی شفقتوں ،مہربانیوں تلے میں دبا ہوا ہوں اور تا زندگی دبا رہوں گا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں ایسے بزرگوں کی صحبتیں ہی نہیں دعائیں بھی ملی ہوں۔

میرے لکچرر سے ریڈر بننے میں دیر ہو رہی تھی۔ دیر کی وجہ 'ہماری زبان' میں تین قسطوں والا مضمون تھا۔ خاں صاحب کو میری ترقی کی بے حد فکر تھی وہ یہ کہتے تھے کہ حق بات کہنے میں خسارہ تو ہوگا اس کی پروا نہ کرو تم بہت جلد پروفیسر بھی ہو گے۔ جب فلاں فلاں ہو سکتا ہے تو تم کیوں نہیں۔ جب میں ریڈر ہو گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بات بھی میں نے دہلی میں بتائی تو گلے سے لگا لیا۔ لیکن جب پروفیسر ہوا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کاش کہ وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ میرا پروفیسر ہونا یا ان کسی کا پروفیسر ہونا کوئی ادبی واقعہ نہیں ہوتا لیکن ذاتی طور پر خاں صاحب کے حوالے سے میرے لیے ضرور تھا، کیوں کہ

وہ میرے لیے ایسے ہی تھے جیسے اپنے خاندان کا کوئی چچا بالکل اپنا، ترقی سے خوش ہونے والا، دعائیں دینے والا، بات بات پر جیتے رہیے کہنے والا۔ انھوں نے بعض معاملات میں میری بڑی تربیت کی، معاونت کی، جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان سے ہر بار ملنا ایک خوش گوار احساس اور تجربہ ہوتا تھا اور اپنائیت وتوانائی کا احساس ہوتا۔ ان کے چلے جانے سے ادبی دنیا سے ایک محقق، ادیب ودانشور کا جانا تو ہے ہی میرے لیے ایک مشفق، مہربان بزرگ اور رہنما کا چلا جانا ہے۔ میرا ذاتی نقصان ہے۔

انھوں نے داستانیں دیں، انھوں نے مثنویاں ترتیب دیں جہاں تکلف تصنع ، مبالغہ اور جھوٹ ہوا کرتا ہے لیکن خاں صاحب ان سب سے کوسوں دور تھے۔ وہ ایک زندہ حقیقت تھے ایک بڑی صداقت اور میرے لیے ایک بہت بڑی طاقت اور ایک شجر سایہ دار:

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

□□□

مشفق و مہربان۔ مشفق خواجہ

مشفق خواجہ پر کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ پاکستان میں رہے، میں ہندوستان میں۔ وہ غیر معمولی، میں معمولی۔ وہ محقق اور میرا تحقیق سے دور دور تک تعلق نہیں۔ اس لئے مجھے حق نہیں پہنچتا کہ میں ان کے بارے میں قلم اٹھاؤں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ محبت اور عقیدت کے انیک روپ ہوا کرتے ہیں اور اس کے جذب و پیوست ہونے کے بھی انداز نرالے اور عجیب و غریب۔

مجھے پڑھنے لکھنے سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں سے ملنے کا شوق رہا ہے۔ اسی لئے کم عمری میں ہی فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، عبدالماجد دریابادی، مسعود حسن رضوی ادیب، کلیم الدین احمد، میکش اکبرآبادی وغیرہ سے ملا اور بعض کے بہت قریب بھی ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی وغیرہ سے بطور خاص۔ محبت و مراسلت میرے محبوب مشغلے رہے ہیں جو آج بھی جاری ہیں۔ ان تمام عادتوں اور تجربوں میں مشفق خواجہ کو کیسے جانا اور پہلے کیا چیز ان کی پڑھی، یہ تو یاد نہیں البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ ایم۔اے۔ کرنے کے بعد عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل۔ لکھ رہا تھا اور اس سے متعلق بہت ساری چیزیں تلاش کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں محترم مسعود حسن رضوی ادیب سے بھی ملاقات ہوئی، وہیں ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے بتایا کہ پاکستان میں ممتاز منگلوری کی کتاب شرر پر آئی ہے تم اسے ضرور پڑھو۔ اب سوال یہ تھا کہ پاکستان سے یہ کتاب کیسے منگوائی جائے۔ اس درمیان شرر سے متعلق میرا ایک طویل مقالہ علی سردار جعفری نے گفتگو میں بڑے اہتمام سے شائع کر دیا تھا۔ جس سے مجھے کافی شہرت ملی اور تعریف کے متعدد خطوط آئے۔ بعد میں یہ مقالہ پاکستان کے کسی رسالہ غالباً مشفق خواجہ کے ہی رسالہ 'غالب' میں شائع ہوا۔ جس کی وجہ سے میرا نام پاکستان میں بھی چل پڑا۔ مشفق خواجہ بڑے باخبر قسم کے انسان تھے۔ کیا مجال

کہ کوئی معقول مقالہ یا رسالہ ان کی نظروں سے بچ جائے۔ شاید میرا مقالہ بھی ان کی نظروں سے گزرا تھا جسے بعد میں 'غالب' میں شائع کیا۔ اس لئے جب میں نے نیر مسعود صاب کی ہدایت پر انہیں سے پتہ لے کر خواجہ صاحب کو خط لکھا تو فوراً جواب بھی آیا اور کچھ دنوں کے بعد ممتاز منگلوری کی کتاب بھی مل گئی۔ ڈاکٹر فضل امام (استاد شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی) جو ان دنوں کراچی میں تھے، انھیں کے بدست نہ صرف یہ کتاب بلکہ فکشن سے متعلق اور کئی کتابیں بھی بھجوائیں۔ ان کتابوں اور بالخصوص ممتاز منگلوری کتاب پا کر دل باغ باغ ہو گیا۔ جہازی سائز کی پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب میرے لئے یادگار تحفہ تھی۔ اس سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ انھوں نے نہ صرف کتاب پر لکھا ''عزیزی ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی نذر'' بلکہ الگ سے ایک خط بھی لکھا۔ ایک معمولی سے طالب علم کے لئے ذرا یہ لہجہ ملاحظہ کیجیے:

عزیز مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا، ممنون ہوں۔ اتفاق سے آج کل ڈاکٹر فضل امام یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھ آپ کی مطلوبہ کتاب (شررمنگلوری) بھیج رہا ہوں۔ ڈاکٹر فضل امام کئی روز سے کراچی میں ہیں لیکن میر علاقے میں کرفیو کی وجہ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ آج میں نے کرفیو پاس منگوایا ہے، امید کہ رات کو ملاقات ہو گی۔ یہ خط اور کتاب ان کے حوالے کردوں گا۔

آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ ہاں آپ نے جو لندن کا سفرنامہ لکھا تھا وہ مجھے اب تک نہیں ملا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

بخدمت گرامی
ڈاکٹر علی احمد فاطمی، الہ آباد

خیراندیش
مشفق خواجہ

کتاب سے زیادہ خط پا کر میرا دماغ آسمان کو چھونے لگا۔ کس قدر مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے مہذب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ بہت پسند ہیں۔ مشفق خواجہ ہر اعتبار سے مہذب اور نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ ہر کام بڑے سلیقہ سے کرتے تھے۔ ملنے ملانے میں بھی وہ ادب و آداب کا بہت خیال رکھتے تھے خواہ وہ عمر میں ان سے بڑا ہو یا چھوٹا۔ مجھے یاد ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں نیر مسعود کے گھر پر ہوئی تھی۔ ان کے ہندوستان آنے کی خبر مجھے مل چکی تھی اور لکھنؤ کا پروگرام بھی انھوں نے مجھے بتا دیا تھا۔ چنانچہ میں پروگرام کے مطابق لکھنؤ گیا اور ان کی خدمت میں حاضری دی۔ کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی شخصیت کے بارے میں غائبانہ آپ کے ذہن میں جو امیج بنتی ہے وہ موجود میں بھی اس پر کھرے اتریں۔ مشفق خواجہ واحد شخصیت ہیں جن کے بارے میں جیسا سوچا، جیسا تصور قائم کیا وہ بالکل اسی طرح نکلے۔ خوبصورت وجیہ انسان، اتنا ہی مہذب طریقہ اور شفاف وشفقت آمیز گفتگو۔ چھوٹوں سے گفتگو کرتے وقت ایک مخصوص شیریں گفتاری، بڑوں سے بردباری اور رقیبوں سے چنگاری لیکن پھلجھڑی والی۔ جس کا تعلق شعلوں سے نہیں ہوتا۔ لکھنؤ میں وہ مجھ سے ایسے ملے جیسے کہ میں بڑی عمر کا بڑا ادیب ہوں۔ اس وقت نیر مسعود صاحب بھی مجھ سے محبت کرتے تھے اور نوازتے تھے انھوں نے بھی میری کافی تعریف کر رکھی تھی۔ شرر کے علاوہ سرشار اور رسوا پر، تحقیق کے ادب و آداب پر اچھی خاصی گفتگو ہوئی تھی۔ اب یہ یاد نہیں کہ اس کی پرتیں اور نزاکتیں کیا تھیں، شاید اس وقت اتنی سمجھ بھی نہ تھی۔ (سمجھ تو اب بھی نہیں ہے) بہر حال بہت اچھی بات اور گفتگو ہوئی۔ بعد میں دہلی بھی گیا اور وہاں بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے متعلق تقریبات میں شرکت کی۔

اس کے بعد ان سے خاصی خط و کتابت رہی۔ میں ان کو خط لکھوں یہ کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن وہ جواب دیتے اور کتابیں یا رسالے بھیجتے یہ بڑی بات تھی۔ کبھی کبھی گیپ ہو جاتا تو وہ خود سے خط لکھتے اور بڑی محبت سے لکھتے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ رضیہ فصیح احمد ہندوستان جا رہی ہیں۔ وہ الہ آباد بھی جائیں گی، آپ ان کے ٹھہرنے کا معقول انتظام کروا دیجئے گا۔ خواجہ صاحب کا حکم سر آنکھوں پر تھا۔ چنانچہ میں نے سارا انتظام کروا دیا

لیکن کسی وجہ سے رضیہ صاحبہ تشریف نہیں لا سکیں۔

خواجہ صاحب ہی نہیں ادیبوں کے بھی مزاج، مذاق اور شخصیت پر بڑی باریک نگاہ رکھتے تھے۔ اسی نوعیت کے رشتے بناتے اور تحفوں سے نوازتے تھے۔ کتابیں بھیجتے وقت دوست کی خواہش اور ذوق کا خاصا خیال رکھتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ میں فکشن سے متعلق چیزیں زیادہ پڑھتا ہوں اور اسی پر لکھتا بھی رہتا ہوں، اس لئے اب وہ بغیر کہے فکشن سے متعلق تازہ کتابیں جمع کرتے رہتے اور انتظار کرتے کہ کوئی آنے جانے والا مل جائے تو اس سے بھجوائیں تاکہ حفاظت سے کتابیں مجھ تک پہنچ جائیں۔ ذرا غور کیجیے بڑے ادیب بڑے ادیبوں اور ہم عصروں سے تعلقات اور دوستی کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے لیکن خوردوں سے یہ لگاؤ، یہ شفقت ایک مخلص و مشفق انسان اور سچا دوست ہی کر سکتا ہے اور وہ ان معنوں میں اسم بامسمیٰ تھے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''آپ سے متعلق کئی کتابیں حاصل کر لی ہیں۔
آپ کے شاگرد نہیں آئے اس لئے انتظار رہا کہ کوئی دوسرا وسیلہ ہو تو ارسال کروں۔ خوش قسمتی سے محترم ضیاء الحق آج کل یہاں ہیں ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام کی کتاب کے ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب بھی ارسال کر رہا ہوں، اس میں آپ کی دلچسپی کے مضامین ہیں۔ افسانہ اور ناول پر کوئی خاص کتاب شائع نہیں ہوئی ورنہ وہ بھی بھجوا دیتا۔ آپ ناول پر جو مقالہ لکھ رہے تھے وہ مکمل ہوا یا نہیں۔
امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ

اور ضیاء الحق کے ذریعہ ان کی کتابیں مجھے مل گئیں۔ میں نے شکریہ کا خط لکھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ میرا خط پا کر خوش ہوتے اور بے پناہ شفقتوں اور دعاؤں سے نوازتے۔ اس

میں میری خوبی کم تھی اور اگر تھی تو صرف اتنی کہ میں نے اپنے گھر کی مشرقی تعلیم و تہذیب کے ذریعہ بزرگوں کے ادب ولحاظ، عزت واحترام کے کچھ آداب سیکھ لئے تھے۔ چونکہ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے ہمہ وقت بزرگوں کا خیال اور لحاظ رکھنا ہی پڑتا تھا۔ اس لئے نفسیاتی طور پر کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اچھی عادت ہے۔ لیکن میرے کچھ سرکش اور باغی قسم کے دوست اسے کچھ اور ہی نام دیتے ہیں۔ تاہم مجھے ان کی اس سرکشی پر بھی اعتراض نہیں، بعض اوقات سرکشی میں نے بھی کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ سرکشی کے بھی اپنے ادب وآداب ہوا کرتے ہیں۔ اس میں بھی اگر تہذیب و تنظیم نہ ہو تو پھر بے مقصد اور گمراہ کن ہو جایا کرتی ہے۔ مشفق خواجہ ترقی پسند نہ تھے اور میں ترقی پسند لیکن انھوں نے کبھی ترقی پسندوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اختلاف بھی کرتے تو اس میں بھی بلا کی نفاست اور شرافت ہوتی تھی۔ ان کے کالم میں اکثر غالی قسم کے ترقی پسندوں اور مشاعرے باز شاعروں کا ذکر ہوتا لیکن اس قدر لطیف پیرائے میں کہ اس کی بھی ایک اشاریت اور معنویت ہوتی۔ وہ ہر ایک کی مناسب خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور کبھی کبھی باقاعدہ لکھتے بھی تھے۔ اوپیندر ناتھ اشک ترقی پسند افسانہ نگار تھے جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے ان کو ایک خط لکھا اور اشک کی ترقی پسندی کے بارے میں کچھ باتیں لکھیں، انھوں نے اس کا اعتراف کیا اور ایک خط میں لکھا:

> ''اشک صاحب کے انتقال کا افسوس ہوا۔ رسالہ
> ''غالب'' میں ان کا ایک گوشہ شامل کر رہا ہوں جو تقریباً
> ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ بھی اس کے لئے کچھ
> لکھئے۔ یہ رسالہ اگلے مہینے شائع ہوگا، آپ کو بھیجوں گا۔
> انجمن ترقی پسند کانفرنس سے متعلق آپ کے رپورتاژ
> کا انتظار رہے گا، آپ رپورتاژ خوب لکھتے ہیں۔
> خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔
> خیر اندیش مشفق خواجہ

ملاحظہ کیجئے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل گوشہ وہ بھی ایک ترقی پسند افسانہ نگار کے لئے۔ ایک تو ترقی پسندی، دوسرے افسانوی ادب سے ان کا زیادہ تعلق نہ تھا لیکن وہ سمجھتے سب کچھ تھے۔ واقفیت اور باخبری کے تعلق سے وہ ایک بیدار مغز اور ہوشمند انسان تھے۔

اسی خط میں انتظار حسین کے تازہ ناول ''آگے سمندر ہے'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انتظار حسین کا ناول 'آگے سمندر ہے' مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کر دیا ہے، امید ہے آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ یہاں تو اس ناول کے بارے میں ملا جلا ردعمل سامنے آیا ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے اسے پسند کیا ہے.........''

مشفق خواجہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور مرتب تو تھے ہی، اتنے ہی عمدہ کالم نویس اور ادبی صحافی بھی تھے۔ اور کالم نویس کو تو ہر اعتبار سے واقف اور بیدار رہنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن مشفق خواجہ کی بیداری پروفیشنل نوعیت کی نہ تھی۔ اس میں ان کا علمی و ادبی تجسس، فطری نوع کی تحیر اور تلاش و تحقیق کا جذبہ کارفرما رہتا۔ اسی لئے وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھتے۔ حتیٰ کہ معمولی سے معمولی شعری مجموعے بھی پڑھتے پڑتے اور خوب مزے سے ان پر تبصرہ بھی کرتے۔ احمد فراز، بشیر بدر اور بعض دوسرے شاعروں کے مجموعوں پر کئے گئے ان کے تبصرو کو جنھوں نے پڑھا ہے وہ ان کی اثریت، لطافت اور بلاغت کو آسانی سے بھول نہیں سکتے۔ ان کے جملوں میں بلا کی دھار اور کاٹ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس میں تلخی ہرگز نہ ہوتی۔ کڑواہٹ سے خواجہ صاحب کوسوں دور تھے۔ وہ پورے اردو ادب کو اپنا قبیلہ اور خاندان سمجھتے تھے خواہ وہ کسی فکر و خیال سے متعلق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اردو والوں کا ہر طبقہ، ہر فکر کے لوگ انھیں رزت دیتے تھے اور احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنی تمام تر مشرقیت اور کلاسکیت کے باوجود ایک مہذب قسم کی سرکشی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ اسی لئے انھیں وہ شاعر و ادیب زیادہ پسند آتے تھے جن کے اندر محنت اور لگن کا جذبہ ہوتا، جو منحرف ہوتے اور مختلف بھی۔ یگانہ چنگیزی پر ان کا یادگار کام صرف ایک تحقیقی نوعیت کا کام نہیں بلکہ اسی سرکشی اور باغیانہ جذبے کا بیحد سنجیدہ اعتراف ہے۔ ان

کے اس کام سے یگانہ از سر نو زندہ ہوئے اور مشفق خواجہ بھی اپنی ایک منفرد اور منحرف پہچان بنا گئے۔ غالب، تخلیقی ادب اور بعض دوسرے رسائل کا بغور مطالعہ کیجیے یہ روکھے پھیکے تحقیقی نوعیت کے رسالے نہیں ہیں، ان میں اکثر عصری ادب اور عصری مسائل کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ وہ ایک بھرپور تنقید کا ذہن اور وژن رکھتے تھے لیکن انھوں نے تنقید کا راستہ کیوں نہیں اپنایا، یہ ایک سوال ضرور ہے۔ ان کی تحقیق بھی کوری تحقیق نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تنقیدی شعور کے بغیر تحقیق اور تحقیق کے سائنسی تصور کے بغیر تنقید اپنے آپ میں نامکمل ہے۔ وہ محقق ضرور تھے لیکن ان کی تحقیق میں گہرا سماجی، تہذیبی اور تنقیدی شعور کارفرما تھا۔ ان کی باخبری کا ایک یہ بھی نمونہ دیکھیے۔ جب فراق پر میری کتاب آئی تو ایک نسخہ میں نے ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ جواب آیا:

> ''عزیز مکرم تسلیمات
>
> محترم ضیاء الحق نے آپ کی کتاب 'شاعر دانشور فراق گورکھپوری' عنایت کی۔ بیحد ممنون ہوں کہ آپ اپنی نیکیوں کی تقسیم میں مجھے یاد رکھتے ہیں۔
>
> آپ نے بہت اچھا کیا کہ فراق سے متعلق اپنے مضامین کو یکجا کر دیا۔ ان مقالوں سے فراق کی شاعری اور شخصیت کی بہت سی جہتیں سامنے آتی ہیں اور خود آپ کی یہ جہت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فکشن کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی آپ کا شغف خاصی ٹھوس بنیادوں پر ہے۔ میں نے اس مجموعے کے بعض مضامین رسائل میں پڑھے تھے، اب انھیں یکجا دیکھا ہے تو خیال آیا ہے کہ آپ فراق کی شاعری پر مفصل کتاب کیوں نہیں لکھتے؟ آپ پیشہ ور نقادوں اور مدرسوں سے بہتر طور پر فراق کی شاعری کی معنویت اجاگر کر سکتے ہیں۔

ادھر فراق پر دو ایک اچھے کام ہوئے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی کا انتخاب اور اس پر ان کا مقدمہ آپ کے یہاں شائع ہوا ہے اور ہمارے یہاں نوازش علی کا مقالہ جو غیر ضرور طوالت کے باوجود ایک اچھی کوشش ہے، معلوم نہیں کہ یہ مقالہ آپ کی نظروں سے گزرا ہے کہ نہیں۔ لاہور میں ایک خاتون شیما مجید نے فراق کے پچاس سے زیادہ مضامین جمع کیے ہیں جو عنقریب شائع ہوں گے۔ ایک موضوع فراق کے خطوط کی جمع آوری بھی ہے۔ آپ یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ خط جمع کرنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔ دو چار خط میں بھی فراہم کرسکوں۔ میرے پاس فراق کا ایک نادر خط ہے جو محمد حسن عسکری کے نام ہے۔ اس کے ساتھ اثر لکھنوی کی ایک غزل کی طویل پیروڈی ''ارے توبہ'' کے عنوان سے ہے۔ اٹھاون شعر میں اور متعدد حواشی اور نثری وضاحتیں۔ یہ چیزیں غیر مطبوعہ ہیں۔ عسکری صاحب نے یہ پیروڈی شاید اس لئے شائع نہیں کی کہ اس کے بعض شعر فحش ہیں۔ اگر آپ یہ دلچسپ خط اور پیروڈی شائع کرسکیں تو میں آپ کو بھیج دوں گا۔

کل ضیاء الحق صاحب سے ملاقات ہوگی یہ خط انھیں دوں گا۔ اس کے ساتھ دو کتابیں بھی۔ ایک ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی ''آزادی کے بعد اردو ناول'' اور دوسری ''مکالمہ'' یہ دراصل کتابی سلسلہ ہے جس کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب کا شمار یہاں کے اچھے رسائل میں ہوتا ہے (جب رسالوں کا ڈیکلریشن نہیں ملتا

وہ کتابی سلسلوں کی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔)

خیر اندیش مشفق خواجہ

۱۹۹۸ء میں جوش سیمینار میں شرکت کرنے میں کراچی گیا۔ مصمم ارادہ تھا خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضری دوں گا لیکن میرا قیام اس قدر فاصلے پر تھا کہ اکیلے ان تک پہنچ پانا ممکن نہ تھا۔ ٹیلی فون پر باتیں ہوئیں، وہ خود مجھ سے ملنے آئے۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں۔ لوگوں کو حیرت تھی بالخصوص صاحب خانہ کو کہ خواجہ صاحب جو بڑی مشکل سے کسی تقریب یا کسی کے گھر جاتے تھے مجھ سے ملنے میری قیام گاہ تک آئے۔ کراچی میں یا پاکستان میں خواجہ صاحب کے بارے میں جو بھی رائے ہو کہ حق پرست اور حق گفتار کے بارے میں عام طور پر رائے اچھی نہیں ہوتی۔ بالخصوص شاعروں کی کہ وہ تو صرف تعریف ہی سننا چاہتے ہیں اور خواجہ صاحب کی تعریف کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ طنز و مزاح کے جدید اور بے تکے طریقے نہیں اپناتے تھے۔ اگر چہ ان کا اسلوب رشید احمد صدیقی جیسا قدیمی و کلاسیکی تھا لیکن اس کے باوجود جملے کی تراش خراش کچھ اس قدر نفیس ہوتی شفاف لب و لہجے میں بات اس قدر نزاکت و لطافت سے نکلتی کہ ایک طرف اگر اشاریت مزہ دیتی تو دوسری طرف اسلوب کی نفاست اور نزاکت کا اپنا ایک الگ ذائقہ ہوتا اور اکثر یہ دونوں صفات شیر و شکر ہو جاتے۔ ایسی زبان بڑے سے بڑا مزاح نگار نہیں لکھ سکتا۔ اس کے لئے اردو تہذیب ہی نہیں لسانی تہذیب کے پیچ و خم اور کیف و کم سے صرف واقفیت ہی نہیں رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ محاوروں اور اصطلاحوں کا فکر انگیز اور معنی خیز استعمال کی معرفت ضروری ہے اور بھی بہت کچھ ضروری ہے جس کا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے مشفق خواجہ کی ادبیانہ شخصیت کا کوئی ایک نام دیا جانا مشکل ہے۔

وہ کس پائے کے محقق تھے اور کس درجے کے ادیب و کالم نویس اس تاثراتی مضمون میں اس کا احاطہ ممکن نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کی ہمہ جہت، پرت در پرت خلاقیت کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ بس اس کے کچھ اشارے دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کی مکمل شخصیت کو سمیٹ پانا ممکن نہ سہی تو ایک بیحد مشکل عمل ضرور ہے۔ کچھ کی نظر میں یہ شخصیت کا کمزور اور

منفی پہلو ہوسکتا ہے لیکن میری نظر میں وہ رنگا رنگ تہذیب اور اس دور کی پہلو دار شخصیت کا اشاریہ ہے۔ جب ادب صرف علم و اطلاع ہی نہیں تہذیب و ثقافت، علمیت و شرافت کا نمونہ ہوا کرتا تھا۔ حکماء، روسا، تجار اور عام انسان سب کا مہذب اور ادب دوست ہونا تقریباً لازمی ہوا کرتا تھا اور جس کا کاروبار سے یا سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کی شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں جن پر اتفاق ہوسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ میں بھی ان کے بعض نظریات سے متفق نہ ہوتا تھا لیکن اس کا کیا کروں کہ ان کی تہذیب، شرافت، شفقت اور احسانوں سے میرا سر ہمیشہ جھکا رہا اور جھکا رہے گا۔

فطری اور نفسیاتی طور پر انسان کی یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنے موافق اور پسندیدہ لوگوں کے درمیان رہے اور انہیں کے درمیان کام کرے اور نام کمائے۔ یہ اچھی بات تو ہوسکتی ہے لیکن وہ بات زیادہ بڑی ہے جو مخالف اور ناہموار ماحول میں کی جائے۔ رسولؐ کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے وحدانیت اور رسالت کا پیغام عین مخالف اور جہالت کے ماحول میں پہنچایا۔ وہ کامیاب ہوئے اسی لئے وہ عظیم ہیں۔ دکن میں بادشاہ سے کر عوام تک شیعی تہذیب میں رچے بسے تھے لیکن انیس لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں بڑے ہوئے۔ میر نے کہا تھا ع رنج و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

مشفق خواجہ اپنے حلقۂ دوستاں میں جس قدر مقبول اور پسندیدہ تھے، اسی قدر وہ حلقۂ رقیباں میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے معاملات و تعلقات ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے تھے۔ ان کے عصبیت و تنگ نظری ہرگز نہ تھی۔ وہ اپنے مخالفوں اور خوردوں سے بھی کھلے دل اور کھلے ذہن سے ملتے تھے اسی لئے بڑے تھے۔ بڑا انسان صرف نظریوں سے ہی بڑا نہیں ہوتا، رویوں سے بھی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب اگلے وقتوں کے ان لوگوں میں سے تھے جن کے یہاں شفقت، محبت اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اسی لئے وہ سب کے مشفق تھے اور خواجہ بھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

□□□

الوداع اے فکرِ جمیل! الوداع سید محمد عقیل!!

اپنے استاد اور اپنے محسن پروفیسر سید محمد عقیل پر کچھ لکھنا میرے لئے بیحد مشکل ہے جبکہ میں رسوائی کی حد تک کثرت نویس مشہور ہوں۔ پروفیسر سید محمد عقیل صاحب پر ہی تاثراتی مضمون لکھتے ہوئے ان کے قریب ترین دوست اور ممتاز ترقی پسند ناقد محمد حسن نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''قصہ یہ ہے کہ جس کو خود سے جتنا قریب محسوس کرتا ہوں اس کے بارے میں کچھ بھی لکھنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ وہی عالم ہوتا ہے جس کو اصغر گونڈوی نے ایک مصرع میں نظم کر دیا تھا ع ''کہا جو کچھ تو ترا حسن ہو گیا محدود'' عقیل صاحب میں بھی ایک بانکپن ہے، الفاظ میں اس کی تصویر کھینچنا مشکل ہے۔''
>
> (ایسا کہاں سے لاؤں)

یہ بانکپن کیا ہے اسے ذرا سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہیں سے میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ فلمی ہیرو والا بانکپن نہیں ہے۔ گلی کوچے کے کسی اوباش آوارہ گرد کا بھی بانکپن نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بانکپن کون سا ہے اور کس قسم کا ہے۔ اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اس کو سب سے پہلے عقیل صاحب کے ہر دل استاد اور معروف ادیب اعجاز حسین کی زبانی سنئے:

> ''میں نے اپنی زندگی میں جہاں بہت سی حماقتیں کی ہیں وہاں ایک قابل ذکر یہ بھی ہے کہ بعض طلباء کو ورغلا کر اردو میں ایم.اے. کرنے پر مائل کیا۔ ایسے بہکائے ہوئے مخصوص لوگوں میں احتشام حسین، حامد

بلگرامی، اجمل اجملی، مسیح الزماں وغیرہ ہیں۔ عقیل
صاحب کی مجموعی صفات کا اندازہ کر کے میں نے ان کو
بھی ترغیب دی کہ وہ اردو میں ایم۔اے۔ کرلیں۔ وہ مان
گئے۔ ایم۔اے۔ میں نام لکھالیا۔ یہ درجہ بھی انھوں نے ہر
امتحان سے زیادہ امتیازی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔
اپنے ہم چشموں میں اول آئے۔ اس کا ردعمل ان پر اچھا
ہوا۔ ادب کی لذت نے علمی ذوق کو ہوا دی اور بغیر کہے
سنے ریسرچ میں داخل ہو گئے۔ یہ فرض بھی بڑی محنت و
خوش دلی سے انجام دیتے رہے۔ خوش قسمتی یہ کہ کبھی
کبھار کا سلسلہ مستقل صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اور وہ
شعبہ اردو میں لکچرر ہو گئے۔" (میری دنیا)

لکچرر ہو جانے کے بعد عقیل صاحب نے اپنے چھوٹے قد کو کس قدر بڑا بنانا چاہا
طرح طرح سے سجانا چاہا اس کا بھی دلچسپ نقشہ اعجاز صاحب نے کھینچا ہے۔ پڑھنے لکھنے
کے ساتھ ساتھ سوٹ ٹائی جوتا وغیرہ پر عقیل صاحب نے ہمیشہ توجہ دی۔ جوتے وہ ہمیشہ
اچھے اور مہنگے پہنتے تھے۔ اسی لئے بقول اعجاز صاحب کچھ دنوں تک پروفیسر جوتا بھی کہے
گئے۔ راقم کو بھی ان چیزوں کا شوق ہے، استاد کی صحبت میں یہ شوق اور پروان چڑھا۔ پہلے
تو میں نے سوچا کہ یہ استاد کا ذاتی قسم کا شوق ہے لیکن کچھ دنوں بعد اندازہ ہوا کہ بی۔اے۔
میں انگریزی کے طالب علم ہونے، کچھ انگریز نما استاد کی تقلید، انگریزیت کا رعب، اس لئے
وہ انگریزی سے ایم۔اے۔ کرنے کی طرف راغب ہوئے، اعجاز صاحب ہی انھیں اردو کی
طرف لے آئے۔ شعبہ اردو میں بھی ایک استاد حفیظ سید انگریز نما تھے، جو بڑے ٹک سک
کے ساتھ انگریزی اسٹائل میں رہتے تھے۔ شعبہ اردو میں لکھنوی یا رام پوری ٹوپی کے
بجائے انگریزی گول ہیٹ لگا کر آتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ نکتہ بھی علم میں آیا جس کو
عقیل صاحب نے اپنی خودنوشت میں بھی رقم کیا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی تھا کہ وہ

کوتاہ قد تو تھے ہی، سانولے بھی تھے، چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ تھے جو گردش لیل و نہار سے مدھم تو ہو چلے تھے لیکن بچپن کی علالت کی چغلی کرتے ہی تھے۔ ان سب کو کور کرنے کے لئے وہ خوبصورت انگریزی لباس پہنتے تھے تاکہ یہ سب اس کی آڑ میں چھپ جائے۔ حالانکہ یہ سب کچھ جوانی تک زیادہ رہا۔ جیسے جیسے علم و شعور بڑھتا گیا رفتہ رفتہ یہ فروعی احساس از خود رخصت ہوتا گیا۔ اعجاز صاحب نے یہ بھی اعتراف کیا ہے:

> ''عقیل صاحب مستقل ہونے سے پہلے ہی اپنی کامیاب استادی کا ثبوت دے چکے تھے۔ اس معیار میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ پڑھاتے بھی محنت سے تھے اور خود پڑھ کر مضامین بھی اچھے لکھتے تھے۔''

اور پھر میری رائے اس وقت اور بدل گئی جب وہ مجھے سینٹ جانس کالج آگرہ سے الہ آباد یونیورسٹی لے کر آئے، جس دن مجھے جوائن کرنا تھا اس کے ایک دن قبل شام کو انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا اور پوری سنجیدگی سے چند نصیحتیں کیں جو بعد میں میری زندگی کا سرمایہ بن گئیں۔ انھوں نے کہا:

> ''اب تم طالب علم نہیں رہے۔ استاد ہو گئے ہو۔ ایک ایسے شعبے کے استاد جہاں بڑے بڑے اسکالر استاد رہے ہیں۔ روز داڑھی بنانا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر کلاس میں جانا اس لئے کہ ایک اچھا استاد ہر اعتبار سے شاگردوں کو آئیڈیل ہوتا ہے۔ وہ پورے سراپا پر نظر رکھتا ہے اور وہی بننا چاہتا ہے۔''

اور اس سے بڑی ہدایت و نصیحت یہ تھی:

> ''دیکھو اپنے طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھنا۔ ان کی تربیت کرنا۔ تنبیہ بھی کرنا لیکن ان سے خفا نہ ہونا اور نہ ہی کسی کا نقصان کرنا۔ انتقام کا لفظ تدریس و

تعلیم کی لغت میں ہے ہی نہیں۔ جو کلاس دیا جائے اسے
پوری تیاری کے ساتھ پڑھنا اور پڑھانا۔''

ملبوس بانکپن کی یہ بھی ایک ادا تھی جس میں انفرادی شوق کے پیچھے اجتماعی ذمہ داری اور وضعداری پوشیدہ تھی۔ اور پھر یہ دائرہ بانکپن پھیلتا ہی چلا گیا، جس نے ظاہری لباس کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اور آگہی و بصیرت اور علم و ادب کا ایسا پرچم لہرایا جہاں عقل ہی جمیل ہوگئی اور سانولی صورت شکیل ہوگئی۔ اور کل ملا کر وہ عقیل ہو گئے۔ فیشن کاری درویشی میں تبدیل ہوگئی تبھی تو محمد حسن نے لکھا:

''مجھے ہمیشہ ایسا لگا کہ میں کسی ایسے درویش سے ہم
کلام ہوں جس نے مدت العمر حبس دم کی مشق کی ہے۔
اور پھر اسی حبس دم میں زندگی گزارنے چلا جاتا ہے... سچ
مانئے تو سچے کھرے عقیل صاحب یہی ہیں۔''

یہ کچھ ابتدائی جھلکیاں تھیں جسے خود عقیل صاحب نے اپنی خودنوشت 'گؤدھول' میں دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ عقیل بھاگتے دوڑتے پیڑ پر چڑھتے ہوں گے۔ ندی میں چھلانگ لگائی ہوگی۔ خطرناک جانوروں کا شکار کیا ہوگا۔ لیکن ایسا انھوں نے کیا ہے۔ اس بے یقینی کی وجہ یہ تھی میں اس وقت ان کی معیت اور صحبت میں آیا جب وہ ۴۵ سال کے آس پاس تھے اور تعلیمی، تدریسی اور تنقیدی حوالوں سے سنجیدہ اور پختہ ہو چکے تھے۔ نوجوانی سے لے کر جوانی تک اعجاز حسین کی شفقت آمیز اور علم دوست سرپرستی رہی اور ۶۱ء سے لے کر ۷۲ء تک احتشام حسین کی فکری اور نظریاتی صحبت نے انھیں ایک بالیدہ تر نقاد کا روپ دیدیا تھا۔ میں ان کی صحبت میں ۱۹۷۲ء کے آس پاس آیا۔ میں احتشام حسین کا آخری شاگرد ہوں۔ بلکہ احتشام صاحب ہی مجھے تاریخ سے اردو کی طرف لے کر آئے۔ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔ یہ واقعہ جولائی ۷۲ کا ہے اور دسمبر ۷۲ میں احتشام صاحب حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اور میں بے سہارا سا محسوس کرنے لگا تھا تب عقیل صاحب نے مجھے سہارا دیا ایم۔اے۔ کرنے کے بعد اپنی نگرانی میں تحقیقی مقالہ

داخل کروایا اور مجھے تعلیم وتدریس کا بلکہ زندگی کا ایک راستہ ملا ساتھ ہی ایک نظریہ، ترقی پسند نظریہ، جو میرے گھر کے صوفیانہ ماحول سے ہم آہنگ ہو گیا۔

۱۹۷۴ء میں عقیل صاحب کی ایک ہنگامہ خیز کتاب 'نئی علامت نگاری' شائع ہوئی۔ جو جدید شاعری یا جدید علامت نگاری کے خلاف تھی۔ خیال رہے کہ یہ دور تھا جب جدیدیت، جدید شاعری اور جدید ادب کا زور وشور تھا اور تجریدیت بلکہ لایعنیت تخلیق ادب کا زیور بنی ہوئی تھی۔ ایک بے ہنگم شور تھا اور بے معنی علامتوں کا دور تھا۔ ایسے میں عقیل صاحب کی یہ کتاب ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ ہم شاگردوں نے اس کتاب کی اجرائی تقریب رکھی جس میں خصوصی مقرر کے طور پر عقیل صاحب کے استاد اور ممتاز شاعر و دانشور فراق گورکھپوری تشریف لائے تھے اور عمدہ تقریر کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تقریر میں عقیل صاحب کا نام کم تھا اور دیت نام زیادہ۔ پھر بھی انھوں نے اتنا ضرور کہا کہ جان بوجھ کر شرارتاً بے معنی شعر کہنا سراسر حماقت ہے۔ ایسی چیزیں کچھ دنوں کام کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔ شاعری میں حسن کا خواب دیکھنا چاہئے۔ حسن انسانیت اور حسن معاشرت۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی کہا عقیل صاحب نے ادب وشاعری کے الجھے ہوئے باریک پہلو پر لکھنے کی ہمت کی ہے۔ مجھے امید ہے ان کی یہ کتاب اب کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ (یہ جلسہ ۱۰ رمئی ۱۹۷۵ء کو ہندوستانی اکیڈمی ہال میں ہوا تھا۔ فراق صاحب کی تقریر ۸ جولائی ۱۹۷۵ء کو ہماری زبان کے شمارے میں شائع ہوئی۔ قارئین ملاحظہ کر سکتے ہیں۔)

اس جلسہ اور تقریر کی بڑی گونج رہی۔ اس لئے کہ یہ فراق صاحب کی تھی۔ اور اس وقت کے غالب رجحان کے خلاف تھی اور اس وقت مخالف لہر میں جانا ہمت کی بات تھی۔ لیکن عقیل صاحب دنیاوی معاملات میں ہمیشہ سے بے نیاز اور بے فکر رہے۔ انھیں جو کچھ کہنا یا لکھنا ہوتا ہے بے خوف وخطر لکھتے تھے۔ ہم نوجوان بھی انجمن ترقی پسند مصنفین میں داخل ہو چکے تھے اور ہمیں عقیل صاحب کے ساتھ ساتھ محمد حسن، قمر رئیس، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، اجمل اجملی وغیرہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور ہم جذبۂ جوانی میں شرابور ہوا میں اڑ رہے تھے۔ احتشام حسین کے انتقال (دسمبر ۷۲) کے بعد ہم

نے احتشام حسین میموریل سوسائٹی بنائی۔ انجمن تہذیب نو سے وابستہ ہوئے۔ اور پھر آخر میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی ہوئی جہاں ایک نظریہ تھا، نظریہ ادب و نظریہ حیات بھی۔ ان تمام انجمنوں کے صدر عقیل صاحب ہی تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن چھوٹی سی مشکل یہ تھی کہ عقیل صاحب ترقی پسند تو تھے اور عالم بھی لیکن عالم باعمل کم۔ کم آمیز، کم سخن اور گوشہ نشین زیادہ۔ ہم نوجوان اس کے برعکس، بحث بحثی، آوارگی اور چائے کافی۔ اس لئے تھوڑی سی مشکل ہوئی۔ خیر ہمارے وقت تک تو وہ کچھ عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ لیکن پتہ چلا کہ وہ عین جوانی میں کچھ ایسے ہی سے تھے یا شاید اس سے زیادہ۔ یہ شکایت تو ان کے استاد اعجاز حسین کو بھی تھی۔ غالباً اسی لئے وہ ایک جگہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

> ''عقیل صاحب کی ادبی صلاحیت و شہرت ان کی کم آمیزی کے غبار میں چھپ گئی۔ ادبی کانفرنسوں میں شرکت کرنا تو کجا وہ الہ آباد میں آنے جانے والے ادیبوں سے بھی بے تکلف ہونا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر ان میں وہ صلاحیت ولیاقت نہ ہوتی جو ان کو ادب کا اچھا خدمت گزار بنا سکتی مجھے اس کم آمیزی کی شکایت نہ ہوتی، افسوس تو یہ کہ ان میں یہ قابلیت موجود ہے۔ مطالعہ بھی وسیع ہے۔ سوجھ بوجھ بھی ہے ان کی طرز تحریر میں جان ہے مگر ان کی موجودہ گوشہ نشینی نے ان ساری خوبیوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ میں بحیثیت استاد ان کی طبیعت میں روانی پیدا کرنے میں ناکامیاب رہا۔ خدا کرے موجودہ صدر شعبہ اردو احتشام صاحب اپنی ادبی گفتار و رفتار سے عقیل صاحب کی صلاحیتوں کو ابھار کر موصوف کو بار دگر مرد میداں بنا سکیں۔''

جب تک احتشام حسین زندہ رہے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود علم کا چھتنار درخت

تھے۔ان کی موجودگی میں کسی دوسرے پودے کا پنپ پانا آسان نہ تھا۔لیکن یہ ضرور ہوا کہ احتشام صاحب کی علمی وادبی صحبت نے ان کو وہ پختہ شاہراہ دکھائی جواب تک کراری کی پگڈنڈیوں میں یا دریا آباد کی گلیوں میں بھٹک رہی تھی۔انگریزی ادب، مارکسی ادب اور سب سے بڑھ کر سائنسی فکر پروان چڑھی احتشام حسین کی معیت میں۔یہ اعتراف بعد کے دنوں میں عقیل صاحب بار بار کرتے رہے۔ان کے بعض مقالوں میں بھی یہ اعتراف ملتا ہے۔عقیل صاحب نے مثنوی پر ڈی فل کا مقالہ لکھا۔داغ پر کتاب ایڈٹ کی۔اکبرالہ آبادی، مرثیہ، چہار درویش جیسے موضوعات پر مضامین لکھے۔ہرچند کہ ان کا تجسس آمیز ذہن اس وقت بھی فن کیا ہے؟فن اور مواد کا رشتہ کیا ہے؟وغیرہ پر سوچتا ضرور ہے لیکن ان مضامین پر اعجاز حسین کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔۶۱ء میں احتشام حسین کے آجانے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔اور وہ دو نہیں بلکہ چار چھ قدم آگے بڑھ کر 'تنقید اور عصری آگہی' (۱۹۷۶ء) جیسی کتاب لکھ گئے۔جس میں تنقید کا تاریخی شعور، عملی تنقید، ترقی پسند تنقید اور نظریات کے آئینہ میں جیسے نظریاتی نوعیت کے مضامین لکھے اور ترقی پسند فنکاروں میں مخدوم اور کرشن چندر جیسے کمٹڈ اشترا کی شاعر وافسانہ نگار پر فکری ونظریاتی مضامین لکھے۔اس وقت ان دونوں فنکاروں سے بڑھ کر کون ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار تھا۔عقیل صاحب کا شعورِ نقد پورے طور پر بیدار ہو چکا تھا اور وہ اپنے ہمعصروں محمد حسن، قمر رئیس وغیرہ کے شانہ بشانہ میدان علم وادب اور شعبہ تنقید وتحقیق میں قدم جما چکے تھے۔تنقید اور عصری آگہی کا دلچسپ انتساب بدلتے ہوئے عقیل صاحب کی معنی خیز نشاندہی کرتا ہے۔یہ کہہ پانا تو مشکل ہے کہ عقیل صاحب کو ترقی پسندی کی طرف اصلاً کس نے مائل کیا۔اعجاز صاحب نے یا احتشام صاحب نے؟ایسی وسیع اور منضبط فکر کی تشکیل میں صرف کسی ایک واقعہ یا فرد کا دخل نہیں ہوتا۔دیکھا جائے تو عقیل صاحب کا جدوجہد سے بھرا بچپن، عسرت کی جوانی اور اس میں پڑھنے لکھنے روانی یہ سب بنیاد میں کام کر رہے تھے۔ایسے میں فراق صاحب اور اعجاز صاب جیسے اساتذہ کی سرپرستی اور رہنمائی (یہ دونوں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنیاد گزاروں میں تھے اور دسمبر ۳۵ء کی پہلی میٹنگ میں

شریک تھے) نے ایک راہ ضرور دکھائی لیکن اس راہ کو شاہراہ بنایا احتشام حسین نے۔ عقیل صاحب کا اپنا یہ بڑا کارنامہ تو ہے ہی کہ ان اساتذہ کی علمی صحبتوں کا بھرپور فیض اٹھایا اور کسب فکر ونظر کیا اور یہ بھی کہ انھوں نے ترقی فکر کا دامن اس وقت تھاما جب تحریک و تنظیم مائل بہ زوال تھی۔ انحطاط پذیر تھی اور جدیدیت کا عروج تھا۔ لیکن عقیل صاحب نے شکار اور تیراکی کے شوق اور جذبے سے یہ سیکھا تھا کہ لہر کے خلاف چلنے اور بہنے میں جو مزہ ہے وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے اور تنکے کی طرح بہنے میں کہاں۔ کچھ یہ بھی تھا فراق، اعجاز، احتشام جیسے اساتذہ کے علاوہ محمد حسن اور قمر رئیس جیسے احباب وہم عصر ملے اور سردار جعفری وکیفی اعظمی جیسے ترقی پسند شعراء جن کا ان دنوں بڑا رتبہ و دبدبہ تھا۔ کچھ کارنامے ہم شاگردوں کے بھی تھے۔ خاص طور پر میرے کہ ہم نے ان کو مزید گھیرا۔ گھر اور گھیرے سے نکالا۔ ہم تو گھر سے نکلے یا نکالے ہوئے ہی تھے۔ بیت بازی، تقریری مقابلہ، مذاکرہ، ڈرامہ وغیرہ کے شوق نے کچھ ایسی بنیاد ڈال دی تھی کہ ایک قدم گھر میں ہوتا تو دوسرا گھر سے باہر۔ اکثر دونوں ہی قدم باہر ہوتے۔ انجمن تہذیب نو ہو یا ذوالفقار صدیقی جنھوں نے عقیل صاحب کی کئی کتابیں شائع کیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین تو گویا ان کے اور ہمارے لئے مرکز ومحور بن گئی۔ عقیل صاحب ہر جگہ صدارت کرتے۔ فراق صاحب، اعجاز صاحب، احتشام صاحب مسیح الزماں صاحب کے انتقال کے بعد اب اکیلے عقیل صاحب ہی تھے جن کی شخصیت میں ان سب کا عکس تھا۔ اکثر کہتے کہ بھائی ہمارے اساتذہ نہیں رہے، ہم اکیلے بچے ہیں جو چاہو سلوک کرلو۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اب ان میں ایک خاص قسم کا اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ وہ تحریر وتنقید کے ساتھ تقریر بھی خوب کرنے لگے اور ہمیں فخر ہے کہ ہم نے ان کو یہ مواقع خوب دیئے اور ان کے ساتھ بڑے بڑے مذاکروں میں شرکت کی۔ دور دراز کے سفر کئے۔ دہلی سے لے کر تاشقند تک۔ تاشقند سے لے کر لندن تک اور لندن سے پیرس کا سفر تو قمر رئیس اور باقر نقوی (عقیل صاحب کے بھانجے) کے ساتھ کیا۔ ایک یادگار اور تاریخی سفر تھا جس کی ایک لاگ کہانی ہے۔ جو پھر کبھی لکھی جائے گی۔

۱۹۷۵ء میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں باقاعدہ ریسرچ کا طالب

علم ہو چکا تھا کہ انھیں دنوں ہندو ڈگری کالج مراد آباد میں اردو کی ایک جگہ مشتہر ہوئی، میں نے اپنے بڑے بھائیوں کے کہنے پر فارم بھر دیا۔ انٹرویو کے لئے بلاوا آیا تو عقیل صاحب کو بتائے بغیر خاموشی سے مراد آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں اکسپرٹ پروفیسر قمر رئیس تھے جن سے انجمن اور عقیل صاحب کے حوالے سے اچھی ملاقاتیں، محبتیں پیدا ہو چلی تھیں۔ یوں بھی وہ اچھے انسان تھے اور اس سے بھی اچھے ترقی پسند، نوجون دوست چنانچہ میرے تئیں شفقت بھرے رویے تھے چنانچہ مراد آباد میں میرا انتخاب ہو گیا۔ میں میرے بھائی اور والدین بہت خوش ہوئے لیکن اچانک عقیل صاحب نے رعب دار آواز میں حکم دیا تم مراد آباد نہیں جاؤ گے خاموش بیٹھو اور سنجیدگی سے تحقیقی مقالہ مکمل کرو۔ میں گھبرا بلکہ چکرا سا گیا کہ استاد کیوں روک رہے ہیں۔ ڈگری کالج کی لکچررشپ قیمتی اور بڑی نوکری ہوتی ہے میں خوشامد کرتا رہا لیکن وہ اڑے رہے اور منع کرتے رہے۔ چار و ناچار مجھے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف مراد آباد نہ جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جس کا اس وقت مجھے بہت قلق ہوا۔ پھر میں یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہو گیا اور جب ایک دن مقالہ کا پہلا باب مکمل کر کے استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگے کہ میرا طریقہ یہ ہے مقالہ میں طالب علم کی زبان سے سنتا ہوں۔ تا کہ املا، جملہ، تلفظ وغیرہ اسی وقت درست ہوتا چلے۔ ڈرتے ڈرتے جب میں نے اپنا پہلا باب سنانا شروع کیا تو زبان و بیان ،جملوں کی غلط ساخت غرضکہ ٹوکا ٹوکی کے انبار لگ گئے۔ پورا باب اٹھا کر فرش پر پھینک دیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا ''یہ تحقیقی مقالالہ لکھا ہے یا افسانہ'' (ان دنوں مجھ پر افسانہ لکھنے کا خبط تھا) پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تحقیق کی زبان کچھ اور ہوتی ہے، تنقید کی کچھ اور تخلیق کی کچھ اور تحقیق کی زبان سادہ حقائق سے پر اور قائل کرنے والی۔'' میری اصلاح ہوتی گئی اور میں سمجھتا گیا کہ عمدہ سلیس اور علمی نثر لکھنا آسان کام نہیں اور عقیل صاحب کوئی آسان کام کرنے والے انسان نہ تھے۔ یہی درس انھوں نے مجھے بھی دیا۔ اور میں نے افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، رپورٹ نگاری وغیرہ چھوڑ کر باقاعدہ تحقیق و تنقید میں مصروف ہو گیا۔ (بعد میں کچھ سفرنامے، رپورتاژ لکھے وہ ابتدائی دور کے اثرات کے تحت لکھے گئے اور پسند کئے

گئے) میرا تحقیقی مقالہ برائے ڈی فل. کتنی مشقتوں کے ساتھ مکمل ہوا اس کی بھی ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر میں اپنی خودنوشت میں ضرور کروں گا (اگر وہ لکھی جا سکی) یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ استاد محترم مجھے آدابِ نثر نویسی سکھائے۔ زبان کی منطقی سجاوٹ سکھائی، معیاری و علمی زبان کیا ہوتی ہے اس سے واقف کرایا۔ اس واقفیت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب مں تلاش و تحقیق کے دوران مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، رشید حسن خاں جیسے اکابر محققین سے ملا۔ خاں صاحب سے تو میرے رشتے دوستانہ سے ہو گئے۔ انھوں نے قدم قدم پر مجھے سمجھایا کہ تحقیق کیسے کی جاتی ہے اور سچ کس طرح سامنے لایا جاتا ہے۔ ان کی ہدایت پر ہی میں قصبہ کرسی گیا اور شرر کے گھر والوں س ملا جہاں مجھے پتہ چلا کہ شرر کی پیدائش کرسی میں ہی ہوئی تھی ورنہ انھوں نے تو جائے پیدائش لکھنؤ لکھا تھا اور بہت سے حقائق سامنے آئے۔ بہر حال تلاش حق اور اس کی ادبی و تحقیقی پیش کش کے اصول و آداب مجھے خاں صاحب نے ہی سکھائے۔ جسے کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا اس لئے کہ میرا ذہن پورے طور پر تحقیق کی طرف تھا ہی نہیں۔ پہلے تحقیق اس کے بعد تنقید شاید یہ اثر بھی میں نے عقیل صاحب سے لیا کہ وہ پورے طور پر نقاد تھے۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'اردو مثنوی کا ارتقاء' کو بغور ملاحظہ کیجئے تنقیدی زیادہ ہے تحقیقی کم، خیر یہ الگ بحث ہے۔

اس درمیا میں نے استاد محترم کے ساتھ سیمناروں میں شرکت کی غرض سے کئی سفر کئے۔ سفر در سفر میرے رابطے بڑھے اور عقیل صاحب کے دائرے۔ دائرۂ علم و ادب، حقیقت و بصیرت، ایسے ایسے گراں قدر علمی و تنقیدی مقالے لکھے کہ ہم محو حیرت، عنوان ہی ملاحظہ کیجئے "سماجی تنقید کی کچھ صورتیں"، "مارکسی ادب اور ادیب"، "مارکسی جمالیات کے کچھ پہلو" وغیرہ جوان کی کتاب سماجی تنقید اور تنقیدی عمل (۱۹۷۰) میں شامل ہیں۔ مغربی تنقید اور مارکسی ادب کے مطالعہ کا شوق کچھ اس قدر بڑھا کہ پوری کتاب مغربی نقاد بالزاک کے نام معنون کر دی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ عمل کچھ ردعمل کے طور پر بھی تھا کہ شب خون میں پہلے ہی ورق پر اداریہ کی جگہ پر کسی مغربی ادیب و ناقد کا قول لکھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کی جدید تنقید بغیر کسی مغربی حوالے کے ایک قدم آگے نہ بڑھتی اور نہ ہی کوئی

لقمہ انگریزیت میں ڈبوئے بغیر حلق میں اتاری خواہ وہ دوسروں کے حلق میں اترے یا نہ اترے۔ ضد اور چیلنج میں عقیل صاحب نے انگریزی الفاظ اور خیالات کا استعمال کرنے لگے۔ نتیجتاً عقیل صاحب فکری اور فطری زبان کا کنیڈا بدلنے لگا۔ ایک بار میں ان سے شکایت بھی کی تھی اور عرض کیا تھا کہ احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری وغیرہ تو ایسا نہیں کرتے حتیٰ کے کلیم الدین احمد بھی ایسا نہیں کرتے جبکہ وہ انگریزی کے استاد ہیں تو اس پر اکثر وہ خاموش ہی رہ جاتے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ''انگریزی الفاظ کے بعض معنی و مطلب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا متبادل اردو میں نہیں ہوتا اس لئے مجبوری ہو جاتی ہے۔'' تب بڑی جسارت کے ساتھ میں نے عرض کیا ''آپ انگریزی پڑھیے ضرور لیکن سوچیے اردو میں تو اردو کی فطری زبان خود بخود داخل تنقید ہوتی چلی جائے گی۔'' پھر میں فراق اور فیض کی مثال دیتا جو انگریزی ادب کے پروفیسر تھے جنھوں نے تنقید بھی لکھی لیکن ان کی تحریروں میں ابھی انگریزی الفاظ کم سے کم نظر آتے ہیں۔ تو وہ چپ ہو جاتے لیکن ایک دن اصل غصہ ظاہر ہو ہی گیا جب کسی سلسلۂ گفتگو میں وہ یہ کہہ بیٹھے۔ ''یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو خالی یہ ہی انگریزی جانتے ہیں، فاروقی تو خیر پڑھے لکھے انسان ہیں اور انگریزی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں لیکن ان کے مقلدین کا مبلغ علم کیا ہے یہ میں سب جانتا ہوں۔'' میں نے پھر عرض کی کہ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ان لوگوں کے چکر میں پڑ کر اپنی اصل حقیقت اور تنقیدی بصیرت کو اصل راہ سے بھٹکا دیں پھر میں نے بڑی ہمت کر کے یہ شعر پڑھا۔

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں چلا جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

(یہ شعر میں نے استاد کے سامنے پڑھنے کی ہمت نہیں کی تھی)

عقیل صاحب کے اندر ایک ضد تھی جو اکثر چیلنج میں بدل جاتی۔ وہ چیلنج قبول کرنے کی غیر معمولی ہمت اور صلاحیت رکھتے تھے لیکن مجھے یہ ڈر لگتا تھا کہ جوش و جذبہ میں وہ اپنے اصل مقصد سے بھٹک نہ جائیں۔ ایسا قمر رئیس کو بھی لگتا تھا جس کا اظہار وہ مجھ سے کیا کرتے تھے، عقیل صاحب سے نہیں کہہ پاتے اس لئے کہ وہ ان کا بہت لحاظ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ احتشام حسین اور ممتاز حسین کے بعد محمد حسن اور سید محمد عقیل ہی ایسے بڑے

نقاد ہیں جو ترقی پسند تنقید کے ستون ہیں جن سے ہماری تنقید کی آبرو ہے۔ اس کا اعتراف تو ترقی پسند مخالف بھی کرتے تھے اور جدید نقاد بھی۔ شمس الرحمن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"۱۹۶۳ء کا سال تھا اس وقت عقیل صاحب کا ستارہ خوب چمک رہا تھا۔ لوگ انھیں ابھرتے ہوئے نقاد اور اپنی راہوں پر سختی سے قائم رہنے والے اردو استاد کی حیثیت سے جان چکے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب مرحوم کے جمعراتی کلب (Thursday Club) کی نشستوں میں میری حاضری ہونے لگی اور عقیل صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ انھیں انگریزی ادب اور زبان سے تقریباً اتنا ہی شغف تھا جتنا اردو زبان وادب سے تھا۔ احتشام صاحب مرحوم بھی اس وقت الہ آباد آچکے تھے..... میں احتشام صاحب کے یہاں بھی اٹھنے بیٹھنے لگا۔ عقیل صاحب سے وہاں بھی ملنا ہوتا تھا۔ ان کا گھر بہت دور تھا لیکن ایک آدھ بار میں ان کے یہاں حاضر بھی ہوا۔ ہر طرف کتابوں کا انبار دیکھ کر دل بہت متاثر ہوا کہ یہ شخص واقعی بہت پڑھنے والا ہے۔"

('دیرینہ کرم فرما اور استاد وقت' ایوان غالب کے کتابچہ میں شامل مضمون کا اقتباس)

عقیل صاحب کے غیر ضروری چیلنجیز سے ہم شاگردان تھوڑے بہت شاکی رہتے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ اسی چیلنج نے ان سے 'نئی علامت نگاری'، 'مرثیے کی سماجیات' اور 'جدید ناول کا فن' جیسی عمدہ کتابیں لکھوالیں، جس پر آگے باتیں ہوسکتی ہیں۔

جب میرا تحقیقی مقالہ مکمل ہو گیا اور مجھے ڈی۔فل۔ کی ڈگری مل گئی تو انھیں دنوں سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے فارم بھر دیا انٹرویو کی تاریخ ٹھیک اسی دن پڑ گئی جس دن میری شادی تھی۔ گھر پر ولیمہ کی تقریب تھی۔ ظاہر ہے اس پر

مسرت موقع کو چھوڑ کر انٹرویو میں کیا جاتا پھر یہ بھی ہندو کالج کی طرح ایک کالج ہی تھا۔ لیکن استاد کا حکم ہوا اس انٹرویو میں تمھیں جانا ہے۔ میں حیران ہوا کہ بھرے پرے شادی کے گھر نئی دلہن کو چھوڑ کر جانے کو کہہ رہے ہیں لیکن حکم عدولی کی ہمت نہ تھی۔ سب کچھ چھوڑ کر آگرہ گیا انٹرویو دیا اور اُلٹے پاؤں واپس آیا۔ پندرہ دن کے بعد اطلاع ملی کہ میرا انتخاب ہو گیا اول نمبر پر میں تھا اور دوم درجہ پر میرے دوست اور فکشن نگار غضنفر کہ وہ بھی ان دنوں بے روزگار تھے۔ عقیل صاحب خوش ہوئے اور میں خوش ہو کر بھی ناخوش اس لئے کہ سبھی یہ کہہ رہے تھے کہ یہ نوکری بہو کی تقدیر سے ملی ہے گویا کہ اس میں میری محنت کا کوئی دخل نہیں۔ پھر یہ بھی کہ جب کالج میں ہی نوکری کرنی تھی تو ہندو کالج مراد آباد کیا برا تھا اب تک تو چار سال پرانی نوکری ہوتی لیکن عقیل صاحب کو کون سمجھے یا سمجھائے۔ اس لئے کہ وہ بہت کم کھلتے تھے اور زبان پر کم اور ذہن میں زیادہ رکھتے تھے۔ میرے تئیں یہ فیصلہ بھی ایک منصوبہ کے تحت تھا۔ اس لئے انھیں یقین تھا کہ بغیر پی. ایچ. ڈی. کئے میں کسی کالج میں لگ گیا تو پھر نہ پی. ایچ. ڈی. کر پاؤں گا اور نہ کالج سے باہر نکل سکوں گا اور وہ مجھے اندر ہی اندر الہ آباد یونیورسٹی لانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ آگرہ میں تین سال کی محنت و مشقت کی الگ کہانی ہے۔ پھر کبھی لکھوں گا اس وقت صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آگرہ نہ گیا ہوتا تو میکش کی صحبت نصیب نہ ہوتی اور ان کے توسط سے نظیر اکبرآبادی کی معرفت حاصل نہ ہو پاتی۔ انھوں نے ہی مجھے نظیر کی طرف راغب کیا۔ مجھ سے مضامین لکھوائے جس سے میری پہلی کتاب بنی۔ میں ہر سال انھیں کسی نہ کسی بہانے آگرہ بلاتا رہتا اور وہ خوشی خوشی آتے رہتے میرے گھر پر ہی قیام کرتے۔ میری بڑی بیٹی نائلہ اس وقت سال ڈیڑھ سال کی تھی۔ اس سے بیحد پیار کرتے اسے پیار سے نیلو کہتے پھر ہم سبھی اسے نیلو کہنے لگے اور جب تین سال کے بعد میری دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو ہم نے اس کا نام انجیلا رکھا اور گھر میں انجو کہہ کر پکارنے لگے۔ لیکن استاد اسے بیلو کہتے اور ہمیشہ پوچھتے نیلو بیلو کیسی ہیں۔ عید میں پچاس پچاس روپے دیتے۔ پھر تو دونوں بیٹیوں نے انھیں بیلو دادا کہنا شروع کر دیا۔ اور جب وقت آخر اسپتال میں یہ دونوں بیٹیاں ان کو دیکھنے گئیں

تو یہی کہہ کر گئیں کہ ہم پیلو دادا کو دیکھنے جا رہے ہیں اور اسپتال میں انھوں نے پیلو دادا کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ بیٹی نے بتایا کہ ان کی آنکھیں جاگ اٹھیں اور پوچھا کہ رعنا (میری بیوی) کیسی ہیں۔

اس درمیان علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کی جگہ نکلی۔ مرحوم اطہر پرویز اور نورالحسن نقوی علی گڑھ بلانے میں دلچسپی رکھتے تھے اس سے زیادہ دلچسپی میری تھی لیکن جیسے ہی عقیل صاحب کو پتہ چلا، فوراً گھر پر بلایا اور میرے ارادے کو پوچھا، ہلکی سی ڈانٹ لگائی اور کہا تمھیں کہیں نہیں جانا ہے تھوڑا سا انتظار کرو، تمھیں الہ آباد یونیورسٹی آنا ہے۔ پہلی بار اتنے کھلے انداز سے بات سن کر حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ مسرت کہ استاد میرے بارے میں ایسا سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے الہ آباد میں ہی اطہر پرویز صاحب سے بات کی اور میں نے علی گڑھ کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد میں اسی پوسٹ پر قاضی جمال حسین کا تقرر ہوا۔ جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا جب الہ آباد میں جگہ نکلی اور سچ پوچھیے یہ محاورہ نہیں حقیقت ہے کہ شعبۂ اردو الہ آباد یونیوسٹی کی ملازمت جس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں استاد محرم نہایت آسانی سے اور خاموشی کے ساتھ پلیٹ میں سجا کر دے دی۔ میں نے جب دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا تو صرف اتنا کہا ''یہ تمھارا حق تھا جو تمھیں ملا۔'' حالانکہ اس کے لئے انھیں خاصا سننا بھی پڑا۔ میرے ایک دوست اور ہم جماعت جو عقیل صاحب کے شاگرد تو تھے ہی ان کے ہم وطن اور بظاہر ہم مسلک بھی ہیں وہ اس یقین اور اعتماد میں تھے کہ ان رشتوں کی بنیاد پر ان کا ہی انتخاب ہوگا لیکن جب نہیں ہوا تو ان کے سینے میں ایک کانٹا سا پیوست ہو گیا جو آج تک نہیں نکلا۔ اس کی چبھن گزشتہ دنوں اس وقت بھی ظاہر ہوئی جب عرصۂ طویل کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے تاریخی سنیٹ ہال میں ایوان غالب دہلی کی جانب سے عقیل صاحب کے تعلق سے تہنیتی جشن منایا گیا (۲۰۱۷) خیر زندگی میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ آج بھی عقیل صاحب کے شاگرد ہیں اور ہمارے دوست۔ بعد میں وہ دہلی میں استاد ہوئے اور میرے ساتھ ہی پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

۱۹۸۳ء میں جب میں الہ آباد یونیورسٹی آ گیا تو اپنے وطن، اپنے گھر، بوڑھے

والدین اور استاد کے قدموں میں بیٹھ کر قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ استاد نے پڑھنے پڑھانے کے لئے جو ہدایتیں و نصیحتیں کیں ان کا ذکر تو ابتدا میں کر چکا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو چکا تھا اور اس کی الہ آباد شاخ کا جنرل سکریٹری تھا اور عقیل صاحب صدر۔ میں نے انجمن کی طرف سے خوب جلسے، مذاکرے کئے۔ عقیل صاحب نے ہمیشہ صدارت اور حمایت کی۔ کبھی اپنی مرضی اور فیصلہ نہیں لادا۔ بڑی بڑی کانفرنسیں کیں ۱۹۸۶ء میں انجمن کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ ان سب کے توسط سے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، وامق جونپوری، تاباں، نازش پرتاپگڑھی، کمال احمد صدیقی، اجمل اجملی جیسے بڑے شعراء اور محمد حسن، قمر رئیس، شارب رودولوی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ش۔ اختر، وہاب اشرفی جیسے ادباء اپیندر ناتھ اشک، رام لعل، جوگیندر پال، اقبال مجید، عابد سہیل، رتن سنگھ، سہیل عظیم آبادی، قاضی عبدالستار، احمد جمال پاشا جیسے بڑے افسانہ نگاروں سے قربتیں ہوئیں پھر ہوتی چلی گئیں۔ عقیل صاحب ہمیشہ ان سب مذاکروں، ملاقاتوں، شہرتوں کو بڑی فراخدلی لیتے اور سب سے ملنے کی تاکید کرتے۔ اس لئے بھی کہ ان میں سے بیشتر عقیل صاحب کے دوست اور ہم عصر تھے۔ کچھ یہ بھی ہوتا کہ پڑھے لکھے ادیبوں کا ذہن اور وژن بڑا ہوتا ہے انھیں اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔ طلباء کے ساتھ سختی و پابندی کمزور علم و اعتماد والے اساتذہ کرتے ہیں جن کی آج کثرت ہے اور جب کوئی خاتون استاد ایسا کرے تو سخت حیرت ہوتی ہے اس لئے کہ فطرت نے خاتون کو سوز و گداز اور جذبۂ محبت سے مالا مال کیا۔ لیکن کچھ عورتیں فطرت کو بھی پامال کر دیتی ہیں۔ مردوں میں ایسی سنگ دل مثالیں تو بھری پڑی ہیں لیکن کوئی عورت ایسا کرے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔

۱۹۸۵ء میں جب لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات منائے جانے کے منصوبہ کا علم ہوا۔ منتظم خاص سید عاشور کاظمی لندن سے دہلی آئے تو سردار جعفری اور قمر رئیس نے عاشور صاحب سے تاکید کی کہ وہ الہ آباد ضرور جائیں۔ الہ آباد شاخ بیحد سرگرم ہے وہاں ایک نوجوان ہے علی احمد فاطمی وہ عقیل صاحب کی سرپرستی میں بیحد

فعال ہے۔ کاظمی صاحب الہ آباد آئے۔ ان کے ساتھ غلام ربانی تاباں، قمر رئیس اور اجمل اجملی بھی تھے۔ ہم نے ان سب کے اعزاز میں تقریبات منعقد کیں۔ عقیل صاحب کی دعوت پر یہ حضرات شعبۂ اردو میں بھی گئے اور مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرہ میں بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد اسی سال ہم لوگ کانفرنس میں شرکت کرنے لندن گئے۔ میرا اور عقیل صاحب کا یہ پہلا بیرونی سفر تھا۔ اس سفر کی روداد تفصیلات کا ذکر میں اپنے سفرنامہ 'سفر ہے شرط' میں کیا ہے عقیل صاحب نے بھی سفرنامہ لکھا 'لندن اولندن' میرا سفرنامہ طفلانہ ہے محض اطلاعاتی یا انشائیہ نگاری لیکن عقیل صاحب کا سفرنامہ تاریخی وتہذیبی عناصر سے پُر ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عقیل صاحب انگریزی زبان وادب، تاریخ وتہذیب سے کس قدر واقفیت رکھتے تھے۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ اردو سے زیادہ دلچسپی انھیں انگریزی زبان وادب سے تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس وقت تک اور شاید آج بھی شرفاء ورؤسا میں انگریزی پڑھنا ایک معیار سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال وہ انگریزی سے ایم.اے. کی طرف گئے۔ لیکن اردو میں طلباء کی کمی کی وجہ سے ان دنوں اعجاز صاحب کے اصرار پر اردو کی طرف آگئے۔ یہ معاملہ کچھ احتشام صاحب کے ساتھ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں اساتذہ کی نظر اردو زبان وادب پر تھی کم وبیش اتنی ہی انگریزی ادب پر بھی تھی۔ لیکن انکساری اور خاکساری کے تحت وہ اپنی طرف سے انگریزی کم بولتے تھے اور کہتے تھے کہ اپنی طرف کبھی انگریزی دانی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ہماری مشرقی تہذیب کے خلاف ہے۔ لیکن جب جدیدیت کے بعض نادان ونا سمجھ ادیبوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی دانی کا بے تکا اظہار کرنا شروع کیا تو ردعمل میں کبھی کبھی تحریر کی حد تک عقیل صاحب بھی کر جاتے ورنہ عقیل صاحب کی مشرقی تہذیب لائق تقلید تھی۔ عقیل صاحب نے بی.اے. میں ہمیں مرثیہ پڑھایا جس میں انگریزی دانی کے اظہار کے واقعے کم کم تھے لیکن ایم.اے. میں جب وہ ترقی پسند نظم (اقبال سے سردار جعفری تک) پڑھاتے تو قدم قدم پر انگریزی کی رومانی شاعری، رومانیت اور رومانی حقیقت New Romanticism اور New Reahism یا مارکسی جمالیات وغیرہ پر گفتگو کرتے تو اس وقت ان کی انگریزی دانی کا اندازہ ہوتا۔ اس

وقت اتنی گہری علمی باتیں اور مغربی تصورات ادب کیا اور کتنے سمجھ میں آتے لیکن انھیں بنیادوں پر انھوں نے ہماری ذہن سازی کی جو آگے بڑھ کر کرشن چندر کے افسانوں کی رومانی حقیقت اور مجاز وفیض وغیرہ کی مزاحمتی رومانیت کے وجدان اور پورے ترقی پسند ادب کے گیان ودھیان کا سبب بنی۔ یہی نہیں جب میں ریسرچ میں آیا اور عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں کا جائزہ لینا پڑا تو اس وقت بھی وہ تاریخ کی حقیقت اور رومان کے دھندلی صداقت کے نرم ونازک رشتوں پر ایسی عالمانہ اور بصیرت افروز باتیں کرتے اور انگریزی ادب کی ایسی ایسی کتابوں کے نام کہ ہم حیران سے زیادہ پریشان ہو جاتے لیکن انھیں پریشانیوں نے پشیمانی سے بچایا اور مقالات کو بہتر بنایا۔ میرے ممتحن پروفیسر محمود الٰہی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔ جنھوں نے مقالہ کو پسند کیا اور مفید مشورے دیے لیکن مجھے یہ فکر تھی کہ میری استاد اور نگراں کو یہ مقالہ پسند آیا کہ نہیں اس لئے بہت مشکل سے کوئی شے ان کے معیار پر اترتی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا عقیل صاحب میں زیادہ کھلنے، بے تکلف ہونے کی عادت نہ تھی اور بے جا تعریف تو ان کی زبان سے نکلتی ہی نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ ابتدا میں ان کی دلچسپی شاعری کے مقابلے فکشن سے کم تھی لیکن جب مجھے کام کروایا اور ساتھ ہی میرے دو دوستوں (ڈاکٹر فخر الکریم اور ڈاکٹر محمد اشتیاق) کو بھی فکشن پر ڈی فل. کروائی اس کے علاوہ میری ایک شاگردہ ڈاکٹر نگینہ جبیں جو بعد کو میری نگرانی میں ڈی فل. کر رہی تھی اس کا موضوع بھی اردو ناول تھا وہ عقیل صاحب کے محلے میں ہی رہتی تھی اور ان کے گھر والوں کے بیحد قریب تھی ایک طرح سے عقیل صاحب نے ہی اس کی رہنمائی کی۔ غرضکہ ان سب کاموں کی وجہ سے استاد کی دلچسپی فکشن کی طرف بڑھی پھر کچھ ایسی بڑھی کہ کچھ ہی دنوں کے بعد انھوں نے جدید ناول پر ایک مکمل کتاب ہی لکھ ڈالی۔ (جدید ناول کا فن ۹۷ء) یہ کتاب میں نے ہی الہ آباد سے شائع کی اور اسے شائع کرتے وقت مجھے بیحد خوشی کا احساس ہو رہا تھا اس لئے کہ ابھی تک میں استاد محترم کو شاعری کا استاد اور نقاد سمجھتا تھا اور اس وقت تک ادب کا مطلب شاعری ہی سمجھا جاتا تھا۔ شاید مغرب میں بھی کچھ ایسا ہی تصور تھا۔ لیکن استاد کا فکشن کی طرف آنا میرے لئے باعث مسرت اور ذیل جملوں کو پڑھا

تو باعثِ افتخار بھی:

> ''میرے شاگردوں میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی نے ناول اور اس کے مختلف مسائل پر اچھے کام کیے ہیں اور فکشن پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ فاطمی کا کام عبدالحلیم شرر پر پہلا مکمل اور اہم کام ہے جو ناول کی تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے او پہلا کام ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ اولیت حاصل رہے گی، فخر الکریم نے ناول میں خاندانی زندگی پر ایک نئے ڈھنگ کا کام کیا ہے۔''

یہ جملے میری اب تک کی زندگی کا حاصل تھے۔ میں فرط مسرت سے تقریباً اچھلنے لگا۔ اس لئے عقیل صاحب ادب میں رسمی اور جھوٹی باتیں لکھنے کے ہرگز قائل نہ تھے۔ جب میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے ''نہیں بھائی تم نے اچھا کام کیا ہے۔ تعریف تو ہوگی لیکن اس تعریف سے بہت خوش نہ ہو کام کرتے رہو ورنہ کبھی کبھی تعریف قلم اور قدم دونوں کو روک دیتی ہے سفر ختم کر دیتی ہے۔'' میں نے ان کی یہ نصیحت بھی گرہ میں باندھ لی اور آج جبکہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور استاد بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ قلم کے ایک ایک قدم اور حرف ولفظ کے ایک ایک سفر میں وہ میرے ساتھ ہیں۔ ان کی نصیحت آج بھی میرے لئے مشعلِ راہ ہے۔

جدید ناول کے فن کے بعد انھوں نے جدید افسانوں پر خوب سے خوب تر مضامین لکھے۔ جو ان کی کتاب افسانہ کی نئی تنقید (۲۰۰۶) میں شامل ہیں۔ اسی طرح انھوں نے نئی غزل پر عمدہ مضامین لکھے۔ جو ان کی کتاب غزل کے نئے جہات (۸۸ء) میں شامل ہیں۔ اگر یہ کہوں کہ نئے ادب کی طرف متوجہ کرنے میں ہم طالب علموں کا ایک رول رہا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے تھے۔ اکثر ہم لوگوں سے نئے ناولوں، افسانوں سے تبادلۂ خیال بھی کرتے۔ اور از راہ انکساری کہتے بھئی تم لوگ نیا ادب

زیادہ پڑھتے اور سمجھتے ہو ہم لوگ تو پرانے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ صدفی صدان کا انکسار ہی تھا ورنہ نئے ادب پر جس طرح وہ کام کر گئے ہم لوگ کیا کر پائے۔ ان کاموں کی وجہ سے ہماری نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں کے درمیان عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ عقیل صاحب کی یوں بھی بڑی عزت تھی اور یہ عزت واحترام ان کی علمیت کی وجہ سے تو تھی ہی ان کی سنجیدگی، بردباری اور متانت کے لئے بھی تھی۔ وہ کبھی ہلکی بات نہ کرتے۔ وہ لطف و مذاق کی باتیں ضرور کرتے لیکن اس کا بھی ایک معیار ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی سیاست کرتے نہیں دیکھا۔ شعبۂ اردو کے بعض اساتذہ کو پسند نہ کرتے تھے لیکن پھر بھی کوئی غیر معیاری باتیں نہ کرتے۔ مجھ سے وہ ہر طرح کی باتیں کرتے گھریلو، ذاتی اور سماجی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے کام کرنے والوں کی ہی مخالفت ہوتی ہے، پھر بھی کام کرتے رہئے اس لئے کہ کام ہی سب باتوں کا جواب ہوتا ہے۔ وہ اعجاز حسین کا محبت سے اور احتشام حسین کا عزت سے ذکر کرتے۔ رفیق حسین اور مسیح الزماں کا بھی ذکر کرتے۔ کبھی کبھی درد بھرے لہجہ میں کہتے ''افسوس کہ مسیح صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی ورنہ وہ پڑھے لکھے اور باصلاحیت تھے۔ طبیعت کے بھولے تھے اس لئے کچھ لوگ انھیں بہ آسانی گمراہ کر دیتے۔ گمراہ کرنے والوں میں شعبہ کے ہی اساتذہ تھے جو عقیل صاحب کے بھی شاگرد تھے۔ بعد میں ان کو بھی ملازمت تو ملی لیکن وہ عزت وشہرت نہیں ملی جو عقیل صاحب کے حصہ میں آئی۔ علم تو وہ مشک ہے جس کو جتنا دبایئے اتنا ہی پھیلتا ہے۔ پھر مشام جاں میں اتر جاتا ہے۔ پھیلتی تو بدبو بھی ہے لیکن قریب آتے ہی لوگ ناک بھوں سکوڑ لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانے میں عقیل صاحب کو شاعری کی گرامر یعنی فاعلاتن، فعلن سمجھنے کا جنون ہو گیا۔ ضرور ہوا ہوگا اس لئے کہ ہم واقف ہو چکے تھے کہ وہ علم کو، تحقیق وتنقید کو جنوں کی حد تک لیتے تھے۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ ہم تک پہنچتے پہنچتے یہ جنون کروٹ لے کر زبان و بیان، حرف ولفظ کی سمجھ اور تلاش میں لگ گیا۔ یہاں بھی معاملہ جنوں کی حد تک تھا۔ ہمہ وقت وہ املا، جملہ، تذکیر وتانیث واحد جمع کے ساتھ ساتھ یہ لفظ کس زبان کا ہے، کہاں سے نکلا ہے اور کس طرح سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ ہم

لوگ اسی میں پریشان ہو جاتے کسی بھی ادبی موضوع پر گفتگو کرتے وقت یا مقالہ سناتے وقت وہ درمیان میں ہی روک کر حرف ولفظ کی لسانی وتہذیبی صورتوں پر باتیں کرتے اور ہماری گفتگو طویل ہو جاتی یا پھر اِدھر اُدھر بہک جاتی۔ آخر کار میں نے ایک دن کہا کہ آپ اس پر کچھ لکھتے کیوں نہیں بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ میرے تئیں یہ ایک غیر دلچسپ موضوع ہے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک غیر معمولی مضمون لکھ ڈالا۔ 'الفاظ کی خارجی اور داخلی دنیا' جوش نے اشارات کے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ الفاظ کے خاندان ہوتے ہیں لیکن عقیل صاحب نے کچھ اس طرح سے کہا:

> "ہمارے خیال میں الفاظ کی خود اپنی ہستی بہت سی صورتوں کا مجموعہ ہے۔ لفظ اپنی مکمل تشکیل کے لئے سب سے پہلے معنوی تعبیر کا محتاج ہے جس کے لئے اسے بنایا یا استعمال کیا گیا ہے۔ جب سے انسان نے گفتگو کرنا سیکھا ہے اور جب تک وہ بولتا رہے گا لفظ کا بنیادی مقصد یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے استعمال کرنے والے کا مافی الضمیر ہے۔ اور یہی اس کا پہلا مقصد ہے اس کے بعد دوسری صورتیں اس میں شمل ہوتی ہیں۔"

بیحد دلچسپ معلوماتی اور علمی نوعیت کا مضمون جس میں ادب پارے کا دخل کم لسانی تجربوں اور نفسیاتی مسئلوں کا ذکر بخوبی کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں دو دلچسپ واقعات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ ممتاز بزرگ افسانہ نگار اپیندر ناتھ اشک نے اپنے ایک ناول کا مسودہ یو.پی. اردو اکادمی لکھنؤ میں برائے مالی تعاون جمع کیا۔ اتفاق سے وہ مسودہ برائے تبصرہ عقیل صاحب کے پاس آیا۔ ناول کا عنوان تھا 'شہر میں گھومتا آئینہ' عقیل صاحب نے عنوان کی زبان پر اعتراض کیا اور کہا عنوان اس طرح ہونا چاہیے "شہر میں گھومتا ہوا آئینہ" یہ اعتراض کر کے مسودہ واپس کر دیا۔ اشک جی بھی ضدی بلکہ جھگڑالو قسم کے انسان تھے۔ چونکہ بزرگ بھی تھے اس لئے انھیں اپنی توہین کا

احساس ہوا۔ وہ کسی قسم کی غلطی ماننے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ بحث چل پڑی۔ جو اخباروں اور رسالوں تک پہنچی۔ اشک جی مجھ سے کہتے ''تیرا اساد بڑا قابل بنتا ہے کیا جانتا ہے وہ'' عقیل صاحب نے کبھی کوئی گستاخانہ جملہ تو استعمال نہیں کیا لیکن یہ ضرور کہتے کہ اشک جی پنجابی ہیں انھیں زبان کی نزاکتوں کا علم نہیں۔ لوگوں نے تو اقبال تک کو نہیں بخشا۔ پھر یہ بھی کہتے نئی نسل جو زبان بول رہی ہے وہ کھچڑی ہے، ملواں زبان ہے جو بولنے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن لکھتے وقت محتاط رہنا چاہئے۔ بھائی میں عام انسان کو نہیں تو کا لیکن تم لوگ نہ بولو۔ وہ مجھے دکھے نہیں۔ ارے بھائی دکھائی نہیں دیئے۔ درست ہے۔ تلاشا غلط ہے تلاش کیا صحیح ہے۔'' اسی طرح ایک زمانے میں وہ یہی روک ٹوک لگاتے رہتے کہ شاگردان پریشان، پریشانی اس لئے کہ وہ غلط سے صحیح کی طرف آنے کا مزاج رکھتے تھے۔ بائیس پچیس سال کی پختگی کی واپسی مشکل تو پیدا کرتی ہی ہے اور ہم کوئی مشکل کام کرنا نہیں چاہتے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ایک اور ممتاز بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ کسی سلسلے میں الہ آباد آئے تو میں نے اپنے گھر پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ رتن سنگھ نے افسانہ پڑھا۔ ہم سبھی نے اس کے موضوع پر اپنے اپنے انداز سے تبصرہ کیا۔ عقیل صاحب بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے موضوع پر گفتگو کرنے کے بجائے دو تین جگہ پر املے اور جملے پر اعتراض کر دیئے۔ رتن سنگھ تھوڑا سا خفیف ہوئے لیکن اس وقت کچھ نہ بولے لیکن جب عقیل صاحب چلے گئے اور چند احباب رہ گئے تو رتن سنگھ نے بڑی دلچسپ بات کہی۔ ''فاطمی! تمھارے استاد کا معاملہ ایک مدرسہ کے اس مولوی کی طرح ہے جو لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو پڑھاتا تھا، ان میں سے ایک لڑکی مولوی صاحب پر عاشق ہو گئی اور محبت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ مولوی صاحب نے محبت نامہ پڑھا اور املہ کی دو تین غلطیاں نکال کر بڑی شفقت سے کہا ''بی بی پہلے اپنا املا درست کیجئے اس کے بعد عشق کیجئے گا۔'' ہم سبھی رتن سنگھ کی اس بات پر محظوظ ہوئے لیکن عقیل صاحب اس مولوی کی طرح نہ تھے وہ عشق کا مطلب سمجھتے تھے لیکن سمجھاتے نہ تھے۔ اچھا ہی کرتے تھے اس لئے کہ وہ بھی جانتے تھے کہ جنون عشق میں املا جملہ بھی غلط ہوتا ہے اور ہوش وحواس بھی۔ کہاں تک وہ

درست کرتے۔ محمد حسن صاحب کے رسالہ عصری ادب کے لئے میں نے عقیل صاحب سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا تھا کیا کبھی آپ نے کسی سے عشق کیا تو ایک خفیف سی مجرمانہ نوعیت کی شرماہٹ کے دھیمے سے کہتے ہاں بھئی میں نے بیوی سے پہلے سچا عشق کیا پھر شادی کی۔ حالانکہ انھوں نے دو جھوٹے عشق کئے یا انھیں جھوٹے عشق میں گرفتار کرنے کی مذموم کوشش کی گئی لیکن ان کی تہذیب، شرافت اور خاموشی نے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ ان کے استاد اور مقبول شاعر فراق گورکھپوری کہا کرتے تھے کہ عشق کرنا ضروری ہے خواہ ناکام ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تو بزبان شعر یہ بھی کہتے تھے ؎

زندگی کے واسطے اک روگ ہونا چاہئے
صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں

غرضکہ حرف ولفظ کی اس تقلیب و تشکیل کے تعلق سے عقیل صاحب بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ وہ اکثر ہندی کے ہم عصر اور ہم عمر دوستوں مثلاً امر کانت، رام سروپ چترویدی، جگدیش گپت اور بعد میں راجیند رکمار وغیرہ سے ان موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتے اور بڑے باریک اور معنی خیز نکتے نکالتے کہ سبھی حیران رہ جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہندوستانی اکادمی الہ آباد کے کسی جلسہ میں ہندی کی صف اول کی شاعرہ مہادیوی ورمانہ جانے کس زعم میں اپنی نظم سنانے سے پہلے یہ کہہ گئیں کہ اس میں اردو فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ عقیل صاحب اس جلسے میں موجود تھے، کان کھڑے کرکے نظم سنتے رہے اور ایک کاغذ پر کچھ نوٹ کرتے رہے نظم کے خاتمے کے بعد وہ کان، آنکھ اور سر کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور معذرت کے ساتھ بولے ''اس مختصر سی نظم میں تقریباً ۹ الفاظ اردو فارسی کے ہیں اور انھوں نے وہ الفاظ گنانے شروع کر دیئے۔ مجمع میں بیشتر لوگوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ الفاظ اردو فارسی کے ہیں۔ جیسے اکثر اردو والوں کو معلوم نہیں رہتا کہ یہ الفاظ سنسکرت یا برج کے ہیں۔ مہادیوی ورما نے اپنی لاعلمی ظاہر کیا اور عقیل صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اس سے مہادیوی جیسی عظیم شاعرہ کا بڑکپن تو ظاہر ہوا ساتھ ہی عقیل صاحب کی زباں دانی بھی ظاہر ہوئی۔ نیز یہ بھی کہ اردو ہندی زبانیں باہم اس قدر جذب و

پیوست ہو چکی ہیں کہ اس میں تمیز کرنا یا انھیں الگ کر کے دیکھنا ممکن و مناسب نہیں۔

اسی طرح ایک زمانے میں عقیل صاحب کو تنقید کے ساتھ عملی تنقید کا شوق پیدا ہوا۔ جب ان کی تیسری کتاب 'سماجی تنقید اور تنقیدی عمل' منظر عام پر آئی تو انھوں نے مجھ سے کتاب کے دوسرے حصے کے مضامین کو پڑھنے کی تاکید کی۔ اس وقت تک میں تنقید اور عملی تنقید کے مابین نازک فرق کو سمجھ نہ سکا تھا۔ میں نے استاد محترم کی کتاب کو سمجھنے کے لئے احتشام حسین کی کتاب 'تنقید اور عملی تنقید' کو پڑھا۔ کلیم الدین احمد کی کتاب 'عملی تنقید' کو بھی پڑھا لیکن اس فرق کو لے کر ایسی کوئی بات نہ ملی جب یہ بات میں نے استاد کو بتائی تو انھوں نے آئی۔ اے۔ رچرڈس کی کتاب 'عملی تنقید' (The Practical Criticism) پڑھنے کی تاکید کی۔ بڑی مشکلوں سے اس کتاب کو تلاش کر کے سمجھ سمجھ کر پڑھی۔ اس کتاب کے مطالعے نے دماغ روشن کر دیا۔ میں یہاں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ یوں تو میں نے انگریزی ادب کا مطالعہ بہت کم کیا ہے کچھ ناول ضرور پڑھے ہیں لیکن تنقیدی کتابیں بہت کم۔ گاڑھی تنقید کی زبان مجھے اردو کی ہی ہضم نہیں ہوتی چہ جائکہ انگریزی لیکن میں یہاں یہ کہتا چلوں کہ انگریزی تنقید کی زبان اتنی بوجھل نہیں ہوتی جتنی کہ انگریزی کے نقال اردو کے نمائشی نقادوں کی ہوتی ہے۔ جو تنقید کی مٹی پلید کرتے ہیں اور اس سے زیادہ اپنی۔ عقیل صاحب پر ان سب کا شدید ردعمل ہوتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹوں سے تو نہ اُلجھتے تھے لیکن ہم عصروں کو بخشتے بھی نہیں تھے۔ ایسا نہ تھا کہ وہ نئے پن کے خلاف تھے ان کی کتابوں کے بعض عنوان نئے نئے سے لگتے ہیں۔ مثلاً 'نظمیں پڑھتے ہیں'، 'ورق تمام ہوا'، 'تنقید جستہ جستہ' پھر جب انھوں نے اپنی خودنوشت کا عنوان گئودھول رکھا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس نام کا خیال کہاں سے آیا؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگے گئودھول کا مطلب شامِ زندگی، جب شام کے وقت گائیں جنگل سے گھروں کی طرف لوٹتی ہیں تو ان کے پیروں سے جو دھول اٹھتی ہے اسے گئودھول کہتے ہیں۔ میں نے یہ لفظ کہیں ٹیگور کی نظم میں پڑھا تھا جس کا ترجمہ فراق صاحب نے کیا تھا لیکن وہ لفظ تھا 'گودھولی' میں نے اس لفظ کے صوت اور املا پر جب استاد سے بات کی تو وہ خوش ہوئے اور کہنے لگے ''ہم اردو والے گو نہیں لکھتے

اس املے سے غلط آواز نکلنے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔ دیکھو اس لئے ہم لوگوں نے پریم چند کے ناول گودان کو گئودان میں بدل دیا۔ پرانے اردو والے زبان و بیان کی نزاکتوں پر بڑی نگاہ رکھتے تھے۔ یہ وصف ہم نے لکھنوی تہذیب سے سیکھا ہے۔ دہلی سے فکر لی تب الہ آباد کا خمیر تیار ہوا۔ تو بات چل رہی تھی عملی تنقید کی۔ میں نے رچرڈس کی کتاب پڑھی۔ جو بیحد پسند آئی جسے ایک زمانے میں رال فاکس کی کتاب 'ناول اور عوام' (Novel and people) بہت اچھی لگی تھی۔ خیر یہ تو بہت دقیق موضوعات نہ تھے۔ لیکن جب میں شہرہ آفاق کتاب Illusion of reality پڑھ گیا اور وہ بھی کچھ کچھ سمجھ میں آگئی تو میں کاڈویل کا قائل ہو گیا کہ فلسفہ مشکل کو آسان کرنے کا نام ہے اور تنقید بھی اسی کی ایک شق ہے۔ جو لوگ آسان موضوع کو بلا وجہ مشکل بنا دیتے ہیں وہ فلسفہ جانتے ہیں نہ تنقید۔ یہ بات اردو کے ان جدید نقادوں کو سمجھنا چاہئے جو مدرسہ کی قیل و قال میں الجھے رہتے ہیں اور تنقید کے اصل مقصد اور راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ بہر حال رچرڈس کی اس کتاب کے مطالعہ نے عملی تنقید کے در کھول دیئے۔ اور مجھے لگا کہ عقیل صاحب کی پہلی کتاب عملی انتقادیات، مبادیات کے طور پر اردو کی دوسری کتاب 'نظمیں پڑھتے ہیں' اطلاقیات کے طور پر بہترین نمونے ہیں۔ انھیں دنوں میں نے میراجی کی کتاب 'اس نظم میں' پڑھی۔ پسند آئی۔ میراجی کی شخصیت جو بھی رہی ہو لیکن شعر و ادب کے تعلق سے وہ کبھی ''جدید'' نہیں لگے۔ بلکہ اچھے لگے۔ پھر میں ان کے اس کثیر و عمیق ادب کو پڑھتا چلا گیا جو انھوں نے محض ۳۹ برس میں چھوڑا۔ جب میں نے عقیل صاحب کی عملی تنقید کے نمونے دیکھے جو شاعری کی حدوں سے نکل کر افسانہ اور ناول تک پھیل گئے اور اک مرثیہ کا بھی عملی و تنقیدی تجزیہ پڑھا تو حیران رہ گیا۔ اور صاف لگا کہ یہ تجزیے شعر العجم، یادگار غالب، اس نظم میں کے آگے کا قدم ہے۔ اسی مطالعے کے بعد میں جوش بانی کا ترقی پسند نظم نمبر نکلا جس میں میں نے تقریباً ۷۰ نظموں کے تجزیے کروائے یہ ضخیم شمارہ پسند تو کیا گیا لیکن اس میں مجھے محمد حسن، قمر رئیس وغیرہ کا تعاون نہیں ملا شاید یہ حضرات نظموں کے عملی تجزیوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان تجزیوں میں عقیل صاحب کے دو تجزیے شامل ہیں۔ اول اقبال کی نظم 'سرمایہ و محنت' اور

دوسری نظم فراق کی 'آدھی رات' آپ ان تجزیوں کو ملاحظہ کریں ان میں ایک انفرادی شان نظر آئے گی۔ میں نے بھی استاد کی تقلید کرتے ہوئے اقبال کی نظم 'لینن خدا کے حضور میں' اور مجاز کی نظم 'آوارہ' کے تجزیے کیے۔ یاد ہے کہ عقیل صاحب نے آوارہ کا تجزیہ پسند کیا تھا۔ پورے نمبر کی اشاعت کے لئے چوطرفہ مبارک باد ملی تھی۔ سچ پوچھئے تو سب کہ سب استاد کے قدموں میں بیٹھنے اور سیکھنے کا ثمرہ تھا۔ اس نمبر کو شائع کرنے کے بعد میرے اندر دو کام کرنے سے زیادہ کروانے کا جذبہ بیدار ہوا۔ اول ترقی پسند ادب کی جمالیات پر ایک مکمل کتاب آنی چاہئے۔ دوم ترقی پسند تنقید کی تاریخ پر بھی ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ میں نے قمر رئیس کے سامنے یہ تجاویز رکھیں۔ انھوں نے ان دونوں ہی موضوعات سے اتفاق کیا لیکن خود لکھنے سے معذرت کرتے ہوئے کہا محمد حسن صاحب تو بیمار ہیں اپنے استاد عقیل صاحب سے بات کرو۔ ہر اعتبار سے ان موضوعات پر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پھر میں نے استاد محترم سے گفتگو کی تو وہ سنجیدہ ہو گئے بولے جمالیات والا موضوع تو ذرا ٹیڑھا ہے اس پر کسی اور سے لکھواؤ ش. اختر سے بات کرو۔ میں ترقی پسند تنقید پر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر کب انھوں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کر دیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اس لئے کہ وہ بڑی خاموشی سے کام کرتے تھے۔ بہر حال چند مہینوں میں انھوں نے کتاب مکمل کر لی اور ایک شام انھوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ فاطمی تمھاری خواہش کی تکمیل ہوئی۔ تو میں حیران رہ گیا۔ یہ کتاب بعنوان 'ترقی پسند تنقید کی تاریخ' جولائی ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی اور ۱۴ر جولائی کی شام استاد نے اس کتاب کا پہلا نسخہ مجھے عنایت کیا جس پر لکھا تھا ''فاطمی کے لئے ان کی فرمائش پر۔ سید محمد عقیل'' میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور جب میں نے دیباچہ میں یہ پڑھا:

> ''اس کتاب کی تاسیس میں میرے عزیز شاگرد علی
> احمد فاطمی کا یوگیہ دان اس طرح بھی ہے کہ انھوں نے ہی
> اس موضوع پر مجھے کتاب لکھنے کے لئے متوجہ کیا اور بیچ بیچ
> میں یاد دہانیاں بھی کراتے رہے یہاں تک کہ آخر کار

میں نے یہ کتاب مکمل کر لی۔ اب ایسے شاگرد کہاں؟"

غور کیجئے ان تحریروں کو پڑھ کر مجھے کس قدر فخر و مسرت کا احساس ہوا ہوگا۔ اور آج بھی ہوتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں تقریباً ۴۰ صفحات پر مشتمل ترقی پسند تنقید و ادب کی شعریات، نظریات اور فکریات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد سجاد ظہیر سے لے کر راقم الحروف تک تقریباً دو درجن ترقی پسند نقادوں کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی چالیس صفحات بیحد اہم اور قیمتی ہیں۔ ترقی پسند فکر و فلسفہ سے پُر ایسے معیاری و تاریخی تجزیے کم پڑھنے کو ملیں گے۔ کتاب تو بڑی تھی ہی خود مصنف کا بڑکپن دیکھئے کہ لکھنے کے باوجود بار بار کہتے رہے کہ یہ کتاب تو فاطمی نے لکھوائی ہے۔ ناول والی کتاب بھی فاطمی اور میری دونوں کی شاگردہ نگینہ جبیں کی تحریک پر لکھی۔ یہ اعتراف بھی بڑی بات ہے ورنہ آج بھی اور کل بھی ایسے استاد گزرے ہیں جو شاگرد کی کتاب سے لے اڑے ہیں اور اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں خود شرر والی کتاب کے سلسلے میں شکار ہوا ہوں۔ خیر یہاں اس قصہ کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ بعد میں میں جمالیات کے تعلق سے گذارش کرتا رہا لیکن وہ ٹال جاتے۔ میں نے الہ آباد کی تاریخ و تہذیب پر بھی کچھ لکھنے کو کہا اس پر وہ نیم رضامند ہوئے۔ یہ خیال اس لئے بھی آیا کہ اسی موضوع پر انھوں نے الہ آباد میوزیم میں دو طویل خطبے دئے تھے۔ جسے بعد میں میوزیم نے کتابی شکل میں ہندی میں شائع کیا تھا۔ وہ اس موضوع پر بھی ضرور لکھتے اس لئے کہ یہ ان کا محبوب موضوع تھا۔ الہ آباد، الہ آباد یونیورسٹی، تقسیم ہند کے واقعات، کراری جیسے قصبات دریا آباد جیسے محلات وغیرہ کے وہ انسائکلو پیڈیا تھے بیوی کی موت اور بیٹی کی جوان موت نے انھیں اندر ہی اندر بیحد کمزور کر دیا تھا۔ یہ تو اچھی بات تھی کہ وہ اپنا علم و فکر تو تقسیم کرتے تھے لیکن غم بانٹنے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنی ذاتی اور گھریلو قسم کی باتیں بہت کم کرتے تھے۔ ہم ان کے بہت قریب تھے اور ان موتوں سے ہم بھی غمزدہ تھے۔ اس لئے ہم محسوس کرتے تھے کہ ان دونوں حادثوں نے اور بیٹے کی دوری نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتے البتہ ہم شاگردوں کا انتظار ضرور کرتے تا کہ کچھ علم و ادب کی، اردو دنیا کی، اِدھر اُدھر کی باتیں ہو

جائیں اور ان کا دل بہل جائے۔ ہم دو ایک شاگرد تو پابندی سے جاتے بزرگی میں بھی اور بیماری میں بھی لیکن اوروں نے آنا جانا کم کر دیا تھا۔ جو بھی وجہ رہی ہو کہ اب عقیل صاحب سے دنیاوی فیض ملنے کے آثار نہ کے برابر تھے۔ شعبۂ اردو جہاں استاد نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی بے مثال خدمات انجام دیں اور نہ جانے کتنوں کو صرف ڈگری ہی نہیں نوکری سے بھی سرفراز و مالامال کیا اس کبرسنی میں اتنی بڑی علمی و ادبی شخصیت فراموشی کا شکار رہی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس قسم کی وضعداری کا فقدان نئی نسل میں زیادہ ہے لیکن پرانی نسل کے بعض افراد کے غیر اخلاقی رویوں کو میں کس خانے میں رکھوں۔ ایک بار جب میں نے اسی بے حسی کو لے کر استاد سے شکایت کی تو کہنے لگے "ارے بھائی چھوڑو یہ دنیا ہے میرا جو کام تھا میں نے کیا ان کا جو کام ہے انھیں کرنے دو۔ یہ سب تہذیب سے آتا ہے، ڈگری و نوکری سے نہیں۔ تم بھی اس کی فکر نہ کرنا۔" ایک طرف یہ صورت تھی تو دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ استاد کے موت کی خبر سنتے ہی جن لوگوں نے مجھے فون کر کے تعزیت کی ان میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر خالد علوی، ملکہ نسیم اور نجانے کتنوں کے فون آئے جس سے مجھے تسلی و تشفی کا احساس ہوا۔ بالخصوص اردو گھر، الہ آباد کی بھری پری تعزیتی نشست سے بھی راحت کا احساس ہوا۔ لیکن اس میں بھی شہر کے لوگ زیادہ تھے شاگرداں کم سے کم۔

عین بیماری کے عالم میں جبکہ وہ بیحد نحیف و لاغر ہو چکے تھے۔ ہم لوگ پہنچ جاتے تو اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے۔ شعبہ اردو کا حال دریافت کرتے، پوچھتے کہ تم آج کل کیا کام کر رہے ہو۔ کیا لکھ رہے ہو کی ادھر کوئی نیا ناول آیا ہے۔ پھر کفِ افسوس ملنے لگتے کیا بتاؤں کہ میں اب کچھ پڑھ لکھ نہیں پاتا ہوں۔ کبھی کبھی بے خیالی میں اپنی بیٹیوں سے کہتے صبح مجھے جلدی تیار کر دینا میرا کلاس ہے یونیورسٹی جانا ہے۔ دو ایک مرتبہ مجھ سے بھی کہا۔ بتلاؤ مجھے یونیورسٹی کب آنا ہے۔ میں پیار سے انھیں سمجھاتا اب آپ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ آپ کو کہیں نہیں جانا ہے گھر پر آرام کیجئے تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے

ہوئے کہتے "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا کلاس ہے میرا جانا ضروری ہے۔" زندگی بھر جس نے تعلیم و تدریس میں اپنے آپ کو غرق رکھا ہو، پڑھنے لکھنے کے علاوہ کوئی اور شوق ہی نہ رکھا ہو، عمر آخر میں اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جون ۱۹ء میں جب میں ریٹائر ہوا تو اسی دن شام کو حاضری دے کر جب میں نے یہ اطلاع دی تو سن کر حیران ہوئے پھر نحیف سی مسکراہٹ کے بعد کمزوری آواز میں یہ شعر پڑھا۔

تعلق ترک ہوا اور سبکدوش ہوئے
نوکری چھوڑی تو اُتری ہوئی پاپوش ہوئے

پھر کہنے لگے پڑھنے لکھنے والا پروفیسر کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔ اب جی لگا کر پڑھو لکھو۔ اب تو وقت ہی وقت ہے۔ پھر میرے گال کو ہلکے سے چھوتے ہوئے کہا "تم میرے سچے جانشین ہو، میرے وفادار شاگرد بلکہ بیٹے" اور وہ نڈھال ہو گئے۔ ادھر میں ان کے اس گراں بہا جملے سے مالا مال ہو گیا۔ میری چالیس سالہ خدمات کا پیار و شفقت بھرا اظہار۔ بس مجھے اور کیا چاہئے۔

استاد کی طبیعت روز بروز (میں دن بہ دن لکھنے والا تھا لیکن ایک بار استاد نے تاکید کی تھی کہ یہ اصطلاح غلط ہے۔ دن سنسکرت کا لفظ ہے اور سنسکرت کے الفاظ فارسی ترکیب میں نہیں لکھے جاتے۔) بگڑتی جاری تھی اور وہ کمزور سے کمزور تر ہوتے جارہے تھے۔ دونوں بیٹیوں (سیما اور افشاں) نے ان کی نگہداشت اور علاج میں کوئی کمی نہیں کی لیکن ان کی ضعیفی اور بیماری وہ کس طرح روک لیتیں۔ اسی درمیان مجھے عالمی غالب سیمینار میں شرکت کرنے ماریشس جانا پڑا۔ ڈرتا رہا کہ اس درمیان کوئی واقعہ نہ ہو جائے خدا کا شکر ہے کہ واپسی تک وہ سلامت رہے۔ واپس آیا تو پتہ چلا کہ شدت سے بیمار ہیں اور اسپتال میں بھرتی ہیں میں بھاگا ہوا گیا لیکن وہ پورے طور پر نڈھال تھے اور غفلت میں تھے۔ پھر ICU سے کمرے میں لائے گئے تو میں نے مخاطب کر کے کہا 'میں فاطمی' بس ایک ایک ہلکی سی 'ہوں' نکلی اور آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے تقریباً جواب دیدیا اور کہا کہ اب انھیں گھر لے جائیے، اس سے زیادہ بہتر نہیں ہو سکتے۔ خدمت کیجئے، دعا کیجئے۔

۲۰ر دسمبر ۲۰۱۹ء کو رضا لائبریری رام پور کی مجلس انتظامیہ کی ایک اہم میٹنگ لکھنؤ کے راج بھون میں، میں مجلس کا ممبر ہوں اس لئے لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس نے بیحد اصرار کیا کہ گورنر کے ساتھ یہ پہلی میٹنگ ہے اس لئے شرکت بہت ضروری ہے۔ چنانچہ شدت سردی اور ملک کے گرم ماحول میں مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ بدقسمتی دیکھئے ادھر میں لکھنؤ پہنچا ادھر استاد نے زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ بیٹی افشاں نے روتے ہوئے فون پر اطلاع دی۔ مجھ پر کیا گزری میں بیان نہیں کر سکتا اور کیسے بیان ہو۔ تقریباً نصف صدی کا ساتھ سانس کی ایک کمزور ڈور کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ جس مہربان استاد نے مجھے پڑھایا لکھایا، ڈی فل. کرائی اور عزت و محبت سے اعلیٰ ملازمت دلائی اور ہر طرح سے میری تربیت کی۔ کسی قابل کیا، آج وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں اس رخصت کے لمحے میں اس کے قریب نہیں ہوں۔ اس کا زندگی بھر قلق رہے گا۔ یہ قلق اپنی جگہ پر لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی اپنی جگہ پر کہ استاد نے ایک بھرپور، شاندار اور کامیاب زندگی گزاری۔ جتنی اچھی عمر پائی اتنے ہی اچھے اور بڑے کام کئے۔ کبھی کوئی سیاست نہ کی اور نہ ہی اکرام و اعزاز کے پیچھے بھاگے دوڑے۔ پوری سنجیدگی، متانت اور محنت سے بس پڑھنے میں غرق رہے۔ آج احتشام حسین کے بعد اردو تنقید بالخصوص ترقی پسند تنقید جن ہاتھوں میں پایہ اعتبار کو پہنچی ان میں سید محمد عقیل کا نام بیحد اہم ہے۔

آج سے تقریباً اکیناوے سال قبل سید محمد عقیل ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۸ء میں الہ آباد کے قصبہ کراری کے عیدل پور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جہاں چاروں طرف علمی و ادبی و مذہبی ماحول تھا۔ ابتدائی تعلیم دیہات کے اسکول میں حاصل کر کے وہ الہ آباد شہر آ گئے۔ ۱۹۵۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور ۱۹۵۲ء میں ایم۔اے۔ اردو امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ان کی غیر معمولی کامیابیوں اور دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے وہ ۱۹۵۳ء میں شعبہ اردو سے عارضی طور پر ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں 'اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں' کے موضوع پر ڈی فل. کی ڈگری حاصل کی۔ ابتداً شاعری بھی کی اور شبنم غبار قلمی نام بھی رکھا۔ انھیں دنوں سامرسٹ مام کے ناول کا 'کیک اور شراب' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ ہندوستانی اکادمی

الہ آباد کی فرمائش پر داغ کی شاعری کا انتخاب کیا اور عمدہ مقدمہ لکھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'نئی فکریں' (۱۹۵۳ء) اس وقت شائع ہوا جب وہ صرف ۲۵ سال کے نوجوان تھے۔ اس عالم شباب میں ہی انھوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ فن کیا ہے اور فن اور مواد کا رشتہ کیا ہوا کرتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب ان کے مشفق استاد اعجاز حسین ریٹائر ہو گئے ان کی جگہ پر انھیں کے شاگرد اور نامور ترقی پسند نقاد احتشام حسین پروفیسر ہو کر شعبہ میں آئے تو ان کی صحبت میں فکری و نظریاتی اعتبار سے عقیل صاحب کی ادبی و زندگی میں ایک نیا اور روشن موڑ آیا۔ احتشام صاحب نے عقیل صاحب کو عالمی ادب و تنقید سے گہری واقفیت اسی دور میں ہوئی۔ اس کے بعد عقیل صاحب کے جو مقالات شائع ہوئے ان کے معیار و افکار مختلف تھے۔ ان مقالات کو ان کی کتاب 'تنقید اور عصری آگہی' اور 'سماجی تنقید اور تنقیدی عمل' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں عقیل صاحب کی ایک ہنگامہ خیز 'نئی علامت نگاری' منظر عام پر آئی جو حلقہ جدید میں ہلچل مچا گئی۔ اسی درمیان انھوں نے دو اور بڑے کام کیے۔ اول اپنے استاد اعجاز حسین کی کتاب 'تاریخ اردو ادب' کو اپ ڈیٹ کیا اور دور حاضر تک لے آئے۔ دوسری اہم کتاب 'مرثیے کی سماجیات (۱۹۹۲ء) تھی جس نے رثائی ادب کے روایتی تصورات میں توڑ پھوڑ کی، جس کی مخالفت بھی ہوئی۔ ابھی تک عقیل صاحب میں شعریات کے ماہر استاد اور نقاد سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بعد کے دور میں فکشن پر دو اہم کتابیں لکھیں۔ جدید ناول کا فن (۱۹۹۷ء) اور اردو افسانے کی نئی تنقید (۲۰۰۶) ان دونوں کتابوں کے آجانے کے بعد وہ فکشن کے نقاد کے طور پر مقبول ہوئے۔ اسے بعد یکے بعد دیگرے ان کے تنقیدی مقالات کے مجموعے 'ورق تمام ہوا' (۲۰۱۰ء) تنقید جستہ جستہ (۲۰۱۵ء) اور تعبیر خیال ۲۰۰۳ء) اصول تنقید اور رد عمل (۲۰۰۴ء) شائع ہوئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم کام جو انھوں نے عمر آخر میں کیا وہ ہے ترقی پسند تنقید کی تاریخ (۲۰۰۹ء) ان عمدہ کتابوں اور کارناموں کی وجہ سے عقیل صاحب بہ یک وقت مشرق و مغرب، قدیم و جدید ادب ممتاز نقاد، ادیب اور دانشور کے طور پر جانے گئے جو تفہیم ادب کے لیے نظر اور نظریہ کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نظریہ کے بغیر ادب کا سائنٹفک مطالعہ ممکن نہیں۔

پروفیسر سید محمد عقیل نے شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں تقریباً ۴۰ برس تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ تقریباً ۳۲ طلباء کو ڈی فل مکمل کرائی۔ دو درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان کی گراں بہا ادبی خدمات کے تحت انھیں متعدد اعزاز سے نوازا گیا۔

ایوان غالب نے غالب ایوارڈ دیا۔ دہلی اور یو۔ پی۔ اردو اکادمی نے بڑے بڑے انعامات دیئے ان کے پڑھائے ہوئے شاگرد آج اردو دنیا میں شہرت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنا علمی اثاثہ سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایک اچھے استاد کے اچھے شاگرد اس کی پہچان کراتے ہیں۔ راقم کو تو وہ اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی بیٹیاں، بیٹا مجھے فاطمی بھائی کہتے ہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب میں حاضری دیا کرتا تھا تو اکثر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتا تھا۔ انگلیوں کو غور سے دیکھتا کہ انھیں انگلیوں نے کیسے کیسے مقالات اور کتابیں لکھیں۔ ان انگلیوں کی چھوٹی سی دستخط سے مجھے اتنی بڑی ملازمت ملی۔ میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی ان کا ہاتھ چوم لیا کرتا۔ آج نصف صدی کا استاد و شاگرد کا رشتہ تقریباً ۷۰ سالہ ادبی خدمات کا سلسلہ توڑ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ استاد جب بھی کسی شاعر و ادیب یا دوست کے مرنے کی خبر سنتے تو انیس کا مصرع پڑھتے۔ ع ''ہم کیا رہیں گے جب نہ رسول خدا رہے۔'' سب کو جانا ہے۔ سب کو مرنا ہے لیکن وہ لوگ جو زندگی میں کام کرتے ہیں وہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ عقیل صاحب کی تحریر و تخلیق، تحقیق و تنقید زندہ رہے گی اور ہمیں راستہ اور روشنی دکھلاتی رہے گی۔ لیکن میری ذاتی زندگی میں ان کی کمی ہمیشہ کھٹکتی رہے گی اور یہ خیال ستائے گا کہ اب پڑھنے لکھنے کی تاکید کون کرے گا۔ زبان و بیان کی اصلاح کرن کرے گا۔ فون کون کرے گا۔ سفر کون کرے گا۔ وہ ایک مدرسۂ فکر تھے۔ ایک دبستانِ تہذیب و ادب۔ آج یہ دبستان ختم ہو گیا۔ شاگردانِ عقیل کا آستانہ بھی اجڑ گیا۔ استاد محترم اپنے اس حقیر طالب علم کا آخری سلام قبول کیجیے۔

الوداع اے فکر جمیل! الوداع سید محمد عقیل!!

□□□

پروفیسر محمود الٰہی۔ ذکر و فکر

یہ تو یاد نہیں کہ محمود الٰہی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ جب گھر میں آنکھ کھُلی تو الٰہی کے تذکرے عام تھے اور بڑے ہوئے تو میدانِ ادب میں محمود الٰہی کے تذکرے خاص تھے۔ وہ گورکھپوری یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت یو. پی کی جتنی یونیورسٹیاں تھیں سب کے صدر شعبۂ اردو زوردار لوگ تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر خورشید الاسلام، لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر شبیہ الحسن، الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر سید محمد عقیل اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں پروفیسر حکم چند نیر۔ سب ایک سے ایک۔ اور جو کچھ کمی تھی وہ یو. پی. اردو اکادمی میں جمع ہو گئے تھے۔ محمود الٰہی صاحب کی چیر مین شپ میں واثق جونپوری، علی جواد زیدی، رشید حسن خاں، وجاہت علی سندیلوی، رام لعل، عابد سہیل وغیرہ۔ لیکن محمود الٰہی تو محمود الٰہی تھے۔ سُنا ہے کہ پروفیسری کے علاوہ شاعری سے بھی تعلق تھا۔ ایک زمانے میں زخمی تخلص رکھتے تھے۔ کبھی مشاعرے بھی پڑھتے تھے اور اپنے پُرسوز ترنم سے اپنے زخمی ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسروں کو بھی زخمی کر دیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں زخمی کر دینے والی جیسی بظاہر کوئی بات تو نہ تھی کہ پہلی بار جب میں نے انھیں دیکھا تو دھکا ہی لگا۔ ''ارے یہی محمود الٰہی ہیں۔'' وہ پروفیسر کم ریلوے کے ملازم زیادہ لگے۔ لیکن پتہ چلا کہ وہ خود ریل کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار اور سمجھدار انسان ہیں۔ اکیلے دم پر گورکھپور یونیورسٹی کے مخالفانہ ماحول میں شعبۂ اردو کھُلوا دیا اور بانی پروفیسر ہونے کا شرف حاصل کر لیا اور یہی نہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مختلف اسٹیشنوں سے اچھے لوگوں کو بلکہ بے ضرر قسم کے لوگوں کو شعبہ میں لے آئے۔ کچھ کو ملازمت دلوائی، کچھ سے ملازمت چھڑوائی اور اچھے اچھے شاگرد بنائے اور پوری اردو دنیا میں پھیلا دیا۔ جے پور، علی گڑھ، دہلی، الہ آباد غرضکہ ہر جگہ شاگردانِ محمود الٰہی کا قبضہ ہو گیا۔ جیسے الٰہی کا پوری کائنات پر ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ان کو ان کی ذات سے پہلے ان کی ایک کتاب سے جانا۔ ''اردو میں قصیدہ نگاری کا ارتقاء''۔ قصیدہ ہر یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں بھی۔ چنانچہ پڑھنے پڑھانے نوٹس بنانے کے اس عمل میں سب سے زیادہ محمود الٰہی کی کتاب معاون ثابت ہوتی۔ ابو محمد سحر کی کتاب سے بھی زیادہ۔ محمود اور محمد میں جو فرق ہوتا ہے وہی ان دونوں کتابوں میں بھی تھا۔ یا یوں کہیے کہ طلباء کے لیے محمود الٰہی کی کی کتاب ہی نہیں خود محمود الٰہی بھی ہمیشہ آسان اور مددگار رہے۔ اسی لیے ایک سے ایک طالب علم و شاگرد پیدا کیے۔ ملک زادہ منظور احمد، عبدالحق، احمر لاری، اصغر عباس، فضل امام، قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین، افغان اللہ خاں، شاہد حسین وغیرہ اور بہت سے دوسرے جو پھیل گئے اردو دنیا میں اور مختلف یونیورسٹیوں میں اور محمود الٰہی کا علم بلند کرتے رہے۔ بس کسی وجہ سے دکن فتح نہ ہو سکا۔

یہ سب کہ سب ایسے لائق شاگرد ہیں کہ جن کی زبان سے میں نے محمود الٰہی صاحب کے بارے میں کبھی خراب یا منفی بات نہیں سنی، سب کہ سب استاد کی شان میں رطب اللسان ہی رہتے ہیں۔ عبدالحق صاحب تو ایسے بھکت ہوئے کہ الٰہی سے الہیات تک پہنچ گئے اور فضل امام نے تو انھیں منصب امامت تک پہنچا دیا۔ آخر آخر میں تھوڑا افغان اللہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں ناراض ہوئے۔ ان کی ناراضگی کو ہم لوگوں نے ان کی پٹھانیت کے سپرد کر کے بات کو دبا دیا۔ بہر حال احباب ہوں یا ہم عصر ادیب محقق ناقد سبھی محمود الٰہی صاحب کی تعریف ہی کرتے ہیں۔ بحیثیت انسان و استاد زیادہ، بحیثیت ادیب کم۔ حالانکہ قصیدہ والی کتاب کی تعریف سبھی کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اتنا اچھا کام پھر نہ ہوا۔ کچھ ایسا کام کہ لوگ محمود الٰہی کا قصیدہ پڑھنے لگے جن میں میں بھی شامل ہوں۔ ہر چند کہ میں ان کا شاگرد یا طالب علم نہیں تھا اس لیے کہ میرا تعلق شروع سے ہی الہ آباد سے رہا اور میں احتشام حسین، مسیح الزماں، سید محمد عقیل، محمود الحسن رضوی کا شاگرد رہا ہوں لیکن میں نے ابتدا سے ہی دیکھا کہ میرے یہ چاروں اساتذہ محمود الٰہی کی تعریف کرتے ہیں اور انھیں ایک لائق، محنتی اور ملنسار انسان مانتے ہیں۔ خاص طور پر میرے استاد اور نگراں سید محمد عقیل صاحب ان کے زیادہ قریبی اور بے

تکلف دوست ہیں۔ ان کے ساتھ یونیورسٹی اور اکادمی میں مل جُل کر زیادہ کام کیا ہے۔

ایم. اے. کرنے کے بعد پروفیسر سید محمد عقیل صاحب کی نگرانی میں برائے ڈی. فل. ڈگری میں عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر تحقیق کی ابتدا کی۔ افغان اللہ خاں میرے گہرے دوست ہو چکے تھے کہ وہ فراق پر پی. ایچ. ڈی. کر رہے اور فراق صاحب سے ملاقات کرنے کی غرض سے اکثر الہ آباد آیا کرتے تھے اور مجھے گورکھپور بلانا چاہتے تھے اور میں پہلی بار افغان اللہ خاں کی دعوت پر ہی گورکھپور گیا۔ شاید کوئی جلسہ تھا جس میں مجھے تقریر کرنی تھی کہ تقریر کرنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا۔ بڑا ہوا تو اس شوق کو جلا ملی۔ فراق صاحب، احتشام صاحب، سردار جعفری وغیرہ کی تقریروں سے۔ شام کے وقت افغان اللہ مجھے محمود الٰہی صاحب سے ملوانے لے گئے۔ وہ یونیورسٹی کے مکان میں رہتے تھے جو محمود الٰہی صاحب کی طرح ہی بڑا تھا، لیکن وہ تو ڈرائنگ روم میں آرام دہ کُرسی پر ایک خاص ٹانڈوی انداز سے بیٹھے ہوئے تھے (محمود الٰہی صاحب اصلاً ٹانڈہ کے تھے)۔ کرسی پر پیر اٹھائے ہوئے بے تکلف انداز میں۔ بغل میں پاندان، منھ اگلدان، چہرے پر گھنی داڑھی جو اپنے کھچڑی پن کی وجہ سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کسی حد تک کامیاب تھی، ورنہ اگر وہ پورے طور پر کالی ہوتی تو یہ پہچان مشکل ہوتی کہ داڑھی کہاں ہے اور صاحب داڑھی کس طرف ہیں۔ سچ پوچھیے تو وہ مجھے محمود الٰہی کم، زخمی ٹانڈوی زیادہ لگے۔

لیکن چند ہی لمحوں میں اسی سیاہ شخصیت کی زبان سے جب اُجلی شفاف شفقت ملی، آؤ بھگت ہوئی تو روح تک سفید ہو گئی۔ میری بساط ہی کیا تھی۔ ایک معمولی طالب علم، بس اہمیت تھی تو اتنی کہ عقیل صاحب کا شاگرد تھا جو محمود الٰہی کے دوست ہیں اور افغان اللہ کا دوست جو ان کے شاگرد تھے۔ کیا محبت سے عقیل صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میرے تحقیق کے موضوع کے بارے میں پوچھا۔ پھر محبت و شفقت سے گھُلی اور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چائے پلائی۔ چائے کے ساتھ وہ بسکٹ بھی تھے جو عقیل صاحب کے یہاں کے ارار وٹ کے نازک بسکٹ سے بہت مختلف تھے۔ دبیز و خستہ بسکٹ کو کھاتے کھاتے اسی خستگی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی وہیں سے کیا

ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں۔ میرے مشفق قمر رئیس صاحب نے بھی ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ اور محمود الٰہی دونوں نے ایک ساتھ رشید صاحب کی نگرانی میں پی. ایچ. ڈی. مکمل کی ہے۔ محمود الٰہی صاحب کو وظیفہ ملتا تھا اور قمر رئیس محروم تھے تو ازراہِ دوستی محمود الٰہی اپنے وظیفہ سے ایک معقول رقم قمر رئیس کو جیب خرچ کے لیے دیا کرتے تھے۔ قمر رئیس نے کچھ اور رومانی قصے بھی سنائے تھے، جن کا تعلق ہر اک کی جوانی سے ہوا کرتا ہے۔

علی گڑھ کے زمانے میں محمود الٰہی صاحب کے ایک سینیر ساتھی تھے نسیم قریشی۔ وہ بھی شرر کے ناولوں پر ریسرچ کر رہے تھے، لیکن کسی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ چنانچہ مجھ سے محمود الٰہی صاحب نے تاکید کی کہ علی گڑھ جاؤ اور ان سے ملاقات کرو وہ تمھاری ضرور مدد کریں گے۔ میں بھی کہہ دوں گا۔ اتفاق سے اس کے چند روز بعد ہی الہ آباد جسہ میں نسیم قریشی صاحب علی گڑھ سے آئے۔ وہ ان دنوں شعبۂ اردو میں سینیر استاد تھے۔ جلسہ کی نظامت میں نے ہی کی جس سے وہ خوش ہوئے تعارف ہوا۔ موضوعِ تحقیق کا علم ہوا تو وہ اور خوش ہوئے اور خود ہی علی گڑھ چلنے کی دعوت دے ڈالی۔ میرے استاد عقیل صاحب بھی اس جلسہ میں شریک تھے فوراً بولے انھیں کے ساتھ علی گڑھ چلے جاؤ، ورنہ یہ بھول جائیں گے بیحد مصروف انسان ہیں اور میں نے ایک پرانے استاد، پرانے ایلی گیرین کے ساتھ پہلی بار علی گڑھ شریف میں قدم رکھا اور انھیں کے ساتھ آفتاب منزل شمشاد مارکیٹ میں مقیم ہوا۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ علی گڑھ کا تعارف اور سفر بھی محمود الٰہی صاحب کی وجہ سے ہوا۔ ایک بار قدم کیا نکلے کہ میں نے سفر در سفر، ملاقات در ملاقات کے ذریعہ جلسہ مذاکرہ، مشاعرہ سبھی کو ایک صف میں لا کھڑا کر دیا۔ محمود الٰہی صاحب سے ملاقاتوں، محبتوں اور عنایتوں کے سلسلے اور دائرے پھیلتے ہی چلے گئے۔

ڈی. فل کرنے کے بعد میں آگرہ چلا گیا (۱۹۸۰ء) جہاں مجھے ایک تاریخی کالج سینٹ جانس میں ملازمت مل گئی۔ انٹرویو میں ایکسپرٹ نسیم قریشی تھے اور میں تنہا امیدوار تھا جس کے پاس ڈی. فل. کی ڈگری تھی اس لیے میرا انتخاب ہو گیا۔ اسی زمانہ میں محمود الٰہی صاحب یو. پی. اردو اکادمی کے چیئرمین ہو گئے تھے۔ یو. پی. کی اردو اکادمی ہندوستان کی

پہلی اور قدیم اکادمی ہے۔ آنند نرائن ملاؔ، علی جواد زیدی، نورالحسن ہاشمی جیسے لوگ اس سے وابستہ رہے ہیں۔ یو. پی. کی تمام یونیورسٹیوں کے صدر شعبۂ اردو اس کے ممبر ہوتے ہیں۔ محمود الٰہی صاحب کی یہ خوش قسمتی تھی کہ مجلسِ انتظامیہ میں پڑھے لکھے افراد اور احباب مل گئے۔ ان سب نے مل کر محمود الٰہی صاحب کی اگوائی میں بڑے بڑے کام کیے۔ سچ پوچھئے تو یہ محمود الٰہی کا ذہن اور وژن تھا کہ انھوں نے اکادمی کے ذریعہ ایسے اور بڑے کام کیے جس کی آج بھی لوگ تعریف کرتے ہیں۔ اردو زبان وادب کا قدیمی وکلاسیکی سرمایہ جو نایاب اور کمیاب تھا، تلاش کروا کر اسے دوبارہ شائع کروایا اور نہایت کم قیمت پر بازار اور اردو عوام تک پہنچایا۔ اردو کی مکتبی ونصابی کتابیں شائع کیں جو آج کئی یونیورسٹیوں میں شاملِ نصاب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے کام جنھیں گنوانا مشکل ہے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں انھوں نے آگرے کی نمائندگی کرنے کے لیے مجھے بھی ممبر بنایا۔ بلایا اور بار بار کہا میکش اکبرآبادی سے ملتے رہنا۔ اگر ان سے کوئی کام لے سکو تو بہتر ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔ اس زمانہ تک ل احمد اکبرآبادی بھی زندہ تھے۔ محمود الٰہی صاحب کے ہی کہنے پر میں نے ل احمد صاحب سے ملاقات کی۔ ایک گفتگو ریکارڈ کی۔ جو بعد میں اکادمی کے رسالہ میں شائع بھی ہوئی۔

اسی زمانے میں انھوں نے مجھے ایک بار خط لکھ کر لکھنؤ بلوایا۔ میں راتوں رات آگرے سے لکھنؤ پہنچا اور نو بجے ہی اکادمی کے دفتر پہنچ گیا اور محمود الٰہی صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ دس بجے کے قریب اکادمی کے گیٹ پر ایک رکشا رکا۔ میں نے غور سے دیکھا تو رکشہ کے اندر محمود الٰہی صاحب اور صباح الدین عمر صاحب ٹھنسے ہوئے بیٹھے تھے۔ کیا منظر تھا۔ ایک ممتاز پروفیسر جو اتنی بڑی اکادمی کا چیرمین بھی ہے، لیکن ان کے اس معمولی پن میں ہی بڑکپن چھپا ہوا تھا۔ اکادمی کے پاس اس وقت بھی گاڑی تھی لیکن میں نے انھیں غیر ضروری طور پر گاڑی کو استعمال کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ گاڑی اکثر صدر اکادمی یا دیگر مہمانوں کے استعمال میں ہی رہتی۔ خود رکشے سے آتے جاتے رہتے۔ پروفیسر فضلِ امام صاحب نے بتایا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ گورکھپور یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر بھی

ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنے ذاتی کام کے لیے سرکاری گاڑی کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ صرف یونیورسٹی آتے جاتے۔ یہ باتیں بظاہر معمولی سی لگتی ہیں لیکن ہیں غیر معمولی۔ ذرا سوچئے کہ آج کم پڑھے لکھے لوگ (اور پڑھے لکھے لوگ بھی) اکادمی کے وائس چیئرمین بننے کی بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں اور بن بھی جاتے ہیں۔ صرف لال بتی کی گاڑی کے لیے اور سستی شہرت کے لیے۔ ایسے میں محمود الٰہی، سید محمد عقیل، شبیہ الحسن، رشید حسن خاں وغیرہ کے ایماندارانہ اور سادگی بھرے رویئے طور طریقے ناقابلِ یقین سے لگتے ہیں، لیکن یہ سب سچ ہے اور یہ سچ ان آنکھوں کے سامنے سے گذرا ہے۔ ان کے رویوں سے، شفقتوں سے مالا مال ہوا ہوں، بلکہ بہت کچھ سیکھا ہے حاصل کیا ہے کہ ایسے رویئے از خود تربیت کا ایک مہذب باب کھول دیتے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں میری کتاب ''عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار'' عابد سہیل صاحب نے اپنے ادارے نصرت پبلشرز شائع کر دی۔ یہ میری پانچ سال کی غیر معمولی محنت کا ثمرہ تھا۔ اس کے شائع ہونے کی خوشی تھی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ محمود الٰہی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اسے پا کر بیحد خوش ہوئے۔ مبارک بادوی اور اکادمی میں برائے انعام جمع کرنے کی ہدایت کی۔ اُلٹ پلٹ کر کتاب دیکھتے رہے پھر بولے۔

> ''شرر پر شاید یہ پہلی کتاب ہے جو شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ اس کا کریڈٹ تو تمھیں ملے گا۔ تم اکادمی کے لیے ایک چھوٹا سا کام اور کرو۔''

''جی جی حکم کیجیے!''

> ''سرشار نے بے پناہ مضامین لکھے ہیں، ان میں سے ادبی نوعیت کے مضامین کا انتخاب کرو اور اگر اس میں فکشن ڈرامے وغیرہ سے متعلق مضامین ہوں تو بہتر ہے۔ اکادمی شائع کرے گی۔''

''ضرور ضرور۔ میں ضرور کروں گا۔''

میں خوش ہوا اور میں نے محمود الٰہی صاحب کی ہدایت پر مضامینِ شرر کا ایک انتخاب کر ڈالا، جسے اکادمی نے شائع کیا اور بعد میں میری کتاب پر اچھا انعام بھی دلوایا۔ کب کس سے، کس طرح کا کام لیا جائے یہ محمود الٰہی صاحب اچھی طرح جانتے تھے۔

ترتیب و تحقیق کے اس عمل میں مجھے علم ہوا کہ شرر وہ ادیب و ناول نگار ہیں جنھوں نے ناول کی اہمیت، مقبولیت اور افادیت پر کئی مضامین لکھے اور لفظ ناول کا استعمال پہلی بار کیا ہے۔ اس سے قبل نذیر احمد نے ناول لکھے ضرور لیکن اسے ناول نہ کہہ کر جدید قصہ نگاری کہا اور جب میں نے یہ بات محمود الٰہی صاحب کو بتائی تو وہ بھی اس تحقیق سے خوش ہوئے اور بولے۔

"دیکھو نا ایک کام کی بات نکل آئی۔ کام کرتے رہنے سے یہی فائدے ہوتے ہیں!"

میں نے ایک اور سوال کیا:

"نذیر احمد نے اپنے ناولوں کو ناول کیوں نہیں کہا جب کہ وہ دلّی کالج سے پڑھ کر آئے تھے۔ انگریزی زبان سے واقف تھے۔ انگریزی ناول پڑھ کر ہی اردو میں ناول لکھنے کے بارے میں سوچا؟"

محمود الٰہی صاحب نے غور کرنے کے بعد کہا۔

"غالباً یہ بات ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان انگریزی لفظ، انگریزی ادب و تہذیب کا استعمال کرنا مشکل تھا۔ بیحد ناراض تھے مسلمان کہ انگریزیت کے ساتھ وہ عیسائیت بھی لا رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے حادثہ کے بعد غم و غصہ کی کئی لہریں تھیں جو ایک ساتھ کام کر رہی تھیں۔"

بات قرینِ قیاس تھی اور میں نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا اور اپنے کئی مضامین

میں یہ باتیں دہرائیں۔ محمود الٰہی صاحب جتنے بڑے دانشور تھے، اتنے بڑے مقرر نہ تھے۔ لیکن گفتگو بہت اچھی کرتے تھے۔ ان کی اصل شخصیت محفل میں کھلتی تھی اور اصل صلاحیت تحقیق نما تنقید میں۔

پروفیسر محمود الٰہی نے قدیم فکشن کی رو سے ایک کارنامہ انجام دیا۔ دلّی کالج کے منشی عبدالکریم کی ایک کتاب تلاش کی ''خط تقدیر'' اور اسے اردو کا پہلا ناول قرار دیا۔ ''مراۃ العروس'' سے بھی قبل۔ میں نے بھی وہ ناول پڑھا۔ ناول جتنا کمزور تھا، مقدمہ اتنا ہی مضبوط۔ پھر ان کے کسی نیاز مند نے بتایا کہ انھوں نے ''انارکلی'' ڈرامے کا مقدمہ بھی بہت عمدہ لکھا ہے۔ میں نے اسے بھی پڑھا۔ واقعہ بہت اچھا مقدمہ ہے۔ بعد میں جب انھوں نے اکادمی سے ''الہلال''۔ ''البلاغ'' کے گولڈن ایڈیشن شائع کیے تو اس کا مقدمہ بھی عمدہ تھا اور وہ میرے ذہن میں زخمی ٹانڈوی سے زیادہ پروفیسر محمود الٰہی ہوتے چلے گئے۔ ایک معتبر و محترم شخصیت بنتی چلی گئی۔ اب جب کہ ان کی لائق بیٹی زیبا محمود نے ان کے بکھرے ہوئے مضامین، تبصروں وغیرہ کو کتابی شکل میں شائع کر کے ایک بڑا کام کر دیا ہے تو اس کو بھی پڑھ کر بیحد راحت و تقویت کا احساس ہوا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ اچھے استاد کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب و محقق بھی تھے، لیکن اس سے زیادہ وہ اردو زبان کے خدمت گذار تھے۔ اپنے قلم اور قدم کے ذریعہ، اپنی یونیورسٹی کے ذریعہ، اردو اکادمی کے ذریعہ اور سب سے بڑھ کر اپنے شاگردوں کے ذریعہ اردو دنیا کو جو وسعت و حیثیت عطا کی وہ کام تو بڑے بڑے رائٹر اور اسکالر بھی نہ کر سکے۔ ایک مضمون کے چند جملے ملاحظہ کیجیے اس سے نہ صرف میری باتوں کی تصدیق ہوگی اور ان کی شخصیت کی تفہیم بھی:

> ''میں نہ تو خود کبھی مایوس رہا اور نہ آپ کو مایوس کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حقیقت کو نظر انداز کر دیں۔ میں ان میں سے ہوں کہ جب مجھ پر دنیا تنگ ہوئی تو خود میں نے ایک دنیا بنائی۔ آپ مجھ سے زیادہ باصلاحیت ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ کی جدوجہد کے نتیجے میں ایک نئی دنیا

آباد ہوگی۔" (لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا حال اچھا ہے)

یہ باتیں اردو زبان سے متعلق تھیں۔ اب ادب اور صنعتِ ادب کے بارے میں ان کی آراء کی ایک جھلک دیکھئے:

"اردو میں اشاریت آورد ہے آمد نہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں اشاریت ترقی پسندی کے خلاف ایک ردِّ عمل ہے۔ ان حقائق کے باوصف اشاریتی رجحان نے اردو ادب کو بعض اچھی قدریں بھی دی ہیں۔ پرانی علامتوں کی جگہ نئی علامات کے ترویج کی کوشش کی جارہی ہے اور ان الفاظ کو ادب میں راہ دی جارہی ہے جو اپنی جگہ پر معنویت کے حامل ہیں۔ لیکن طریقہ راسخۂ قدما کی وجہ سے ادبی فن پارے جن کے لیے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے، وہ اشاریت کو مضحکہ خیز بنادیتا ہے۔ دراصل مشرقی ادبیات میں اشاریت استعارہ کی طرح اظہار ترسیل کا موثر ذریعہ ہے۔ اشارات کی پردہ داری بے حجابی کی ایک خوبصورت تصویر ہے اور اشاریت کا یہ انداز اردو کے ہر عظیم ادیب وشاعر کے یہاں ملتا ہے۔"

(اشاریت یا سمبالزم)

سرسید اور ابوالکلام آزاد ان کے محبوب موضوعات تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ وہ ادب کو صرف زبان و بیان، حرفت وصنعت کے حوالے سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ ملک ومعاشرت اور تہذیب وثقافت ان کے سنجیدہ حوالے تھے۔ شاید یہی وہ حوالے ہیں جو ایک زمانے میں ان کو ترقی پسند تحریک کے قریب لے آئے اور وہ عقل پرستی اور روشن خیالی کے ہمنوا بن گئے۔ ان کی تحریروں کی ثقافت اور اسلوب کی دلکشی محض حرف ولفظ کی دروبست سے نہیں پیدا ہوئی (اور ہوتی بھی نہیں) بلکہ وہی روشنی اور زندگی، حرکت وحرارت جو ان کی

فکر میں تھی لاشعوری طور پر ان کی تحریروں میں در آئی تھی۔ وہ تحقیق کی طرف گئے ضرور، لیکن ان کا ترقی پسند ذہن اور تخلیقی زبان ان کو مشکل سے محقق کی صف میں کھڑا کر پاتی ہے۔ وہ نقاد بھی تھے لیکن زندانی کتب نہیں بلکہ زندگی کے نقاد، تہذیب کے نقاد اور ملک و قوم کے تعلق سے مفکر و دانشور اور یہ سارے عناصر جس قدر سرسید، اقبال، آزاد میں نظر آتے ہیں راست طور پر اور کسی کے یہاں نہیں ملتے۔ اسی لیے انھیں سرسید اور آزاد موافق آتے تھے۔ اب میں یہاں سرسید اور آزاد کے سلسلہ میں ان کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں جس سے میرے خیالات کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

> ''۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ہر شعبہ میں جو انقلاب رونما ہوا اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ اس طرح سرسید نے بالخصوص اردو والوں کی جو رہبری کی ہے اس کا بھی علم سب کو ہے۔ سرسید پر اگرچہ ابھی تک کم لکھا گیا ہے لیکن یہ کمی اس حقیقت کے راستے میں حائل نہ ہو سکی کہ اردو کی نشاۃ الثانیہ میں سب سے بڑا سرسید کا ہے۔ نئے دور میں جامع حسیات ترکیب سب سے زیادہ سرسید پر صادق آتی ہے۔ ملک و قوم اور علم و ادب کو بالیدگی اور توانائی بخشنے کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ قابلِ فخر بات یہ ہے کہ اردو زبان ان کے ہاتھوں ایک ہنگامی منزل اور دور زندہ کشی میں ذہنی توانائی آزادئی رائے اور بالیدگی فکر کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔''
>
> (سرسید تحقیق کا رمز آشنا)

اور اب ابوالکلام آزاد کے بارے میں:

> ''ادب کے مظاہر بے شمار ہیں۔ زندگی کا کون سا روپ ہے جس کی جلوہ گری ادب میں نہیں۔ جو جتنا بڑا ادیب

ہوتا، وہ اتنا ہی زندگی کی رنگارنگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے لیکن سب سے بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو الفاظ میں زندگی کی حرارت کو سمو لینے کا سلیقہ جانتا ہو۔ یہی نہیں ادب کی عظمت کا اصل پیمانہ یہ ہے کہ وہ کارزارِ حیات میں کس حد تک خود شناسی، حوصلہ مندی اور مہم جوئی کا درس دیتا ہے۔ ادب کا یہی معیار ہے جس کی بنیاد پر مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار اردو کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے۔ الہلال سے البلاغ تک، ترجمان القرآن سے غبارِ خاطر تک ان کی تحریریں مختلف اور متعدد موضوعات کو محیط ہیں۔ ان میں خالص مذہبی مسائل ہیں اور منطقی موشگافیاں بھی ہیں اور شاعرانہ خود کلامی بھی۔ لیکن ایک بات جو ہر تحریر میں حاوی و غالب ہے وہ ہے ذوقِ نمو اور زندگی کی نئی جولان گاہ فراہم کرنے کا جذبہ۔ مولانا آزاد ان فنکاروں میں ہیں جو زبان کو ادب کی فعالیت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ادب جس کا مطالعہ ہر دور میں انسانیت کے لیے ایک نیا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔"

(ابوالکلام آزاد کی ذہنی جودت)

مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں اور اسکالر محمود الٰہی کو سمجھا جاسکتا ہے اور سمجھنا بھی چاہیے۔ اس لیے کہ محمود الٰہی کے ادبی کارناموں کا مناسب و معقول محاسبہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے چہ جائیکہ ایک چھوٹے سے مضمون میں۔

محمود الٰہی ہلکے سے سیاست داں بھی تھے۔ اُس زمانے میں کچھ مخالف لوگ انھیں مہین سیاست داں کہا بھی کرتے تھے، لیکن میرا مشاہدہ و تجربہ کہتا ہے کہ ان کے اندر اتنی ہی سیاست تھی جتنی کہ ہر پڑھے لکھے انسان میں ملک و معاشرہ کو لے کر ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس

کے ذریعہ بھی انھوں نے اردو کے لیے اچھے کام ہی کیے۔ گورکھپور یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا کھلوانا ان کی تعمیری و تشکیلی سیاسی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھی۔ کیا یہ دوسرے صدور کر سکتے تھے جنھوں نے دس بارہ برس تک شعبوں میں صدارت کی اور ایک سیمینار تک نہیں کیا۔ ویر بہادر سنگھ سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور انھوں نے ہی ان کو اکادمی کا چیرمین بنایا۔ ان کی چیرمینی ان کی ذات کے لیے کم، اردو کی کائنات کے لیے زیادہ مفید اور کارگر رہی۔ انھوں نے یوپی کے اردو کے ادیبوں، دانشوروں، پروفیسروں کا ایک حلقہ تیار کیا جا بجا سیمینار کروائے۔ ہر جگہ شرکت کی۔ اکادمی کو، اردو زبان وادب کو علمی نہ سہی تو عملی سطح پر ایک سمت دیا۔ متحرک کیا اور ایک ماحول بنایا۔ سب محمود الٰہی کا گن گانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس کے زمانہ میں جب ایک بار رضوان علوی صاحب چیرمین بنوادیے گئے تو اردو والوں کو اعتراض ہوا کہ اردو اکادمی کا چیرمین کسی اردو اسکالر کو ہونا چاہئے اور رضوان علوی عرب کلچر کے استاد تھے۔ محمود الٰہی کی ایک آواز پر سبھی پروفیسران اور ممبران نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ اتنی سنجیدگی سے احتجاج ہوا کہ حکومت کو چیرمین بدلنا پڑا اور ممتاز ادیب علی جواد زیدی کو بنانا پڑا اور رضوان علوی فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیرمین بنادیے گئے۔ سیاست وحکومت کے اپنے داؤ پیچ ہوا کرتے ہیں۔ رضوان علوی کے اپنے معاملات تھے اور محمود الٰہی کے اپنے۔ لیکن محمود الٰہی کے اپنے کچھ اصول تھے، ارادے تھے اور منصوبے بھی۔ خواہ وہ اپنے شعبہ سے متعلق ہوں یا اپنی اولادوں سے متعلق۔ لیکن ان سب پر غالب رہتا ہے اردو کا منصوبہ۔ زبان وتہذیب کا جذبہ۔

محمود الٰہی ایک انسان تھے اور انسان کی اپنی کچھ ضرورت اور فطرت بھی ہوا کرتی ہے جن کا تعلق صرف سماج اور معاشرہ سے ہی نہیں آل اولاد اور خاندان سے ہوتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں جتنے اساتذہ تھے ان میں سے بیشتر غیر شادی شدہ۔ احمر لاری، اختر بستوی، افغان اللہ سب غیر شادی شدہ۔ ان سب کے استاد اور بحیثیت صدر شعبہ اس کمی کو محمود الٰہی نے پوری کی اور ان سب کی غلطیوں کی تلافی کی۔ وہ کئی بچوں کے باپ ہوئے، ان میں بھی لڑکیاں زیادہ۔ محمود الٰہی نے ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلوائی

اور کہیں نہ کہیں ملازمت بھی دلوائی۔ اس کے لیے ان کو کافی محنت بھی کرنی پڑی۔ یہ ایسی کوئی بری بات نہیں سبھی کرتے ہیں۔ ایک باپ خاص طور پر۔

آج محمود الٰہی صاحب فراش ہیں۔ مدت سے بستر علالت پر دراز ہیں۔ اردو کے منظرنامہ سے تقریباً غائب۔ وقت کیسے کیسے گُل کھلاتا ہے۔ سیاہی مائل محمود الٰہی صاحب کی اُجلی، مسکراتی شخصیت کیسی کیسی گل افشانی گفتار کرتی رہی۔ لب گلریز اور لفظ دلفریب ہوا کرتے تھے، لیکن آج انھیں لبوں پر خاموشی ہے آنکھوں میں ویرانی ہے۔ صحت اور وقت انھیں کہاں لے جائے اور کس حال میں رکھے اس پر کس کا قابو۔ لیکن ان کے علمی و عملی کارنامے ہمیشہ بولتے رہیں گے۔ گورکھپور یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ہو یا اردو اکادمی۔ اس کی تاریخ میں محمود الٰہی کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ ان کے کئی علمی کام خاص طور پر قصیدہ والی کتاب بحیثیت ادیب و محقق ان کو مدتوں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

میں فضل امام، افغان اللہ وغیرہ کی طرح ان کا شاگرد نہیں رہا۔ ڈی. فل سے لے کر ملازمت تک کے سفر میں ان کا کوئی دخل نہیں رہا (یہ سب میرے استاد سید محمد عقیل کی دین ہیں) پھر بھی میں ان کو کیوں یاد کر رہا ہوں، شاید اسی لیے کہ وہ صرف اپنوں اور اپنے شاگردوں کے لیے ہی نہیں ہم جیسے خوردوں کے لیے بھی ایک مشفق و مہربان شخص تھے۔ ان کی طبیعت میں مشرقیت، خلوص و محبت اور سوز و گداز تھا۔ ایک ایسا اپناپن جو قرب و بعد اور اپنے پرائے سے بالاتر تھا جہاں صرف انسان ہوتا ہے۔ ادب کا طالب علم ہوتا ہے۔ محمود الٰہی صاحب ادیب و ناقد کتنے بڑے تھے، یہ فیصلہ آنے والا وقت کرے گا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک باعمل، بامقصد اور بامروّت انسان تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی زبان و ادب اور شاگردان و محبان کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان دوستی، خورد نوازی اور ملنساری کی اعلیٰ صفات جو اس دور میں کمیاب ہیں، محمود الٰہی صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھیں جسے انھوں نے پوری اردو دنیا کو لٹایا، مالامال کیا جس کے لیے اردو دنیا انھیں آسانی سے فراموش نہیں کر سکے گی۔

□□□

قاضی عبدالستار

پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

بزرگوں پر مضمون لکھنا وہ بھی شخصی اور تاثراتی نوعیت کا مشکل کام ہوتا ہے، ویسے بزرگوں کی بھی کئی قسم ہوتی ہے۔ کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جو بزرگ ہوتے ہوئے بھی دوست ہوتے ہیں۔ جیسے میرے لیے قمر رئیس صاحب، اقبال مجید، عابد سہیل، محمود الحسن رضوی وغیرہ۔ کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عزت واحترام بے تکلف قسم کا مضمون لکھنے میں حائل ہوتے ہیں جیسے رشید حسن خاں، محمد حسن، سید محمد عقیل وغیرہ۔ حالانکہ میں نے فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری جیسے بزرگوں اور شہرت یافتہ شاعروں پر تاثراتی مضامین لکھے ہیں لیکن یہ لوگ فنکار تھے اور ایسے بڑے فنکار اور دانشور جن کا تعلق ہر نسل سے ہوتا ہے۔ کچھ شخصیتیں ان کے درمیان آتی ہیں جن کی شخصیت کے پیچ وخم اور کیف وکم از خود متاثر اور مائل کرتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ایک بزرگ استاد اور رائٹر کی حیثیت سے قاضی صاحب کا بھی میں بیحد احترام کرتا ہوں لیکن ان سب سے قطع نظر ان کی شخصیت میں ایک سرور آمیز کھرا پن اور لذت آمیز نوکیلا پن ہے۔ ایک عجیب طرح کا بانکپن بلکہ مزیدار قسم کا کڑوا پن جس میں ایک نیا پن اور اپنا پن تو ہوتا ہی ہے کبھی کبھی اور بھی کئی قسم کے ''پن'' جھلک پڑتے جو بڑا مزہ دیتے اور یہی وہ مزہ ہے جس نے یہ مضمون لکھنے پر مجبور کر دیا۔

آپ قاضی صاحب سے اگر ذرا بھی قریب ہیں تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ صبح سے لے کر شام تک، چائے سے لے کر جام تک، نام سے کر کام تک یہاں تک کہ آل احمد سرور سے لے کر خورشید الاسلام تک غرض کہ ہر عمل، ہر گفتگو میں ایک مخصوص ترنگ ہوتی، طنطنہ ہوتا۔ گرج چمک بھی اور پھر نرمی اور لچک بھی۔ لیکن یہ نرمی اور بیش بہا موتی ہر ایک کے حصہ میں کم آتے۔ ایک بار اعتماد کا گوہر ہاتھ لگ جائے تو سب کچھ لوٹ لیجیے۔ دامن

بھر لیجئے۔ کم از کم جب تک آپ ان کی صحبت میں رہیں گے تو یہی محسوس ہوگا کہ آپ کی سماعت اور ذہانت، آپ کا من اور دامن سب موتیوں سے بھر گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔ بعد کا حساب میں نے کبھی نہیں کیا اور اکثر نے نہیں کیا۔ اس لیے کہ کچھ تو وقت پر چھوڑ دینا چاہئے۔

سچ تو یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت پر مجھے لکھنے کا وہ حق نہیں ہے جو ان کے قریب کے شاگردوں اور بے تکلف دوستوں کا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں نے کبھی ان کو اپنے استاد سے کم نہیں سمجھا۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے استاد (سید محمد عقیل) کے دوست ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ میرے دوستوں (اشرف، غضنفر، طارق، کنول وغیرہ) کے استاد ہیں۔ دونوں حوالوں سے مجھے ان کو استاد کی طرح ماننا ہی تھا ورنہ وہ قاضی عبدالستار جو ایک افسانہ نگار رہے۔ میں اس سے کافی پہلے واقف ہو چکا تھا۔ میں اس وقت ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ گھر میں علمی اور مذہبی ماحول تھا۔ والدہ، خالہ بڑی بہنیں، شرر راشدالخیری، صادق سردھنوی، وغیرہ کے تاریخی ناول ذوق وشوق سے پڑھتی تھیں۔ ان ناولوں کے نام بھی عجیب ہوتے تھے۔ فاتح مفتوح ''فاتح مکہ'' ''ملک العزیز ورجنا'' ''لرزتے آنسو'' ''شامِ زندگی'' وغیرہ کہ جن کے عنوان سے ہی آنسو ٹپکنے لگتے (کیا معلوم تھا کہ بعد میں ایسے ہی ناولوں پر تحقیق کرنی پڑے گی) مجھے تو ابن صفی کے ناول پسند آتے کہ ان کے قصے، ان کے کردار، ان کی زبان مجھے ان دنوں دیوانہ کیے ہوئے تھے۔ میں یہ ناول چوری چھپے پڑھتا کہ گھر کا مذہبی ماحول کھلے عام پڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ والد صاحب گھر میں تاریخ طبری پڑھتے اور باہر میلاد شریف اور مجھے بھی ٹوپی پہنا کر نعت پڑھواتے۔ والدہ اور بڑی بہنیں دن میں لہک لہک کر سبز گنبد پر سلام بھیجتیں اور رات کو پوری عقیدت کے ساتھ اجتماعی طور پر شرر کے ناول پڑھے جاتے۔ عین انھیں دنوں سوتے جاگتے، دوڑتے بھاگتے اکبری، اصغری، موہنا، انجلینا جیسے کرداروں کے نام میرے کان میں بھی پڑے جو بعد میں بہت کام آئے۔ پھر پتہ نہیں کب اور کیسے انھیں کتابوں کی بھیڑ میں ''پیتل کا گھنٹہ'' نام کی ایک کتاب ہاتھ لگ گئی۔ کچھ ادھر اُدھر سے افسانے ضرور پڑھ

رکھے تھے لیکن ''پیتل کا گھنٹہ'' پڑھا تو دل و دماغ میں گھنٹی بج گئی۔ حالانکہ اس وقت کچھ باتیں سمجھ میں نہ آئی تھیں کہ یکّے والا گھوڑے کو چابک کیوں مارتا ہے اور پیتل کا گھنٹہ فروخت کیوں ہو جاتا ہے۔ بس مجھے اپنے دیہات کے بڑے ابا یاد آئے اور شاندار مسجد جو کھنڈر میں تبدیل ہو رہی ہے وہ یاد آئی پکی سڑک سے گاؤں تک چلنے والے یکّے بھی یاد آئے۔ اس کتاب کے سرورق پر گول پیلے گھنٹے کی اور بیک کور پر قاضی عبدالستار کی تصویر کو دیکھ کر ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہوا تھا، کہہ پانا مشکل ہے کہ گھنٹی گھنٹے کی وجہ سے بجی تھی یا قاضی صاحب کی تصویر، تحریر اور تخلیق کی وجہ سے۔ یہ کتاب الہ آباد سے چھپی تھی کہ ان دنوں قاضی عبدالستار کے دوست بلونت سنگھ، محمود احمد ہنر، ضیاء الاسلام وغیرہ نے الہ آباد سے رسالہ نکالنے اور کتابیں شائع کرنے کا نقصان دہ کام چھیڑ رکھا تھا کہ ان تینوں کو فائدے کا کام کرنا آتا ہی نہ تھا۔ نقصان برداشت کرتے کرتے اور منہ سے خون تھوکتے ہوئے پہلے دو تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی طرح میں چوری چھپے کرشن چندر، عصمت چغتائی، رام لعل وغیرہ کے افسانے، ابن صفی کے دل آویز ناول پڑھتا اور دن دہاڑے محفل میلاد میں رقت آمیز ترنم سے نعت خوانی کرتا۔ اس طرح دو چار سال گزرتے تو میں ایسے جلسوں کی نظامت بھی کرنے لگا۔ ایک بار ایسی ہی ایک محفل میں علی گڑھ سے محترم نسیم قریشی مہمان مقرر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ میں اس وقت تک احتشام حسین کا شاگرد ہو چکا تھا۔ اور ایم۔اے۔ کرنے کے بعد شرر کے تاریخی ناولوں پر ریسرچ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بلکہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا اس لئے کہ مجھے تو مشاعرہ وغیرہ کی نظامت میں زیادہ مزہ آتا تھا خواہ وہ نعتیہ مشاعرہ ہی کیوں نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی مذکورہ مشاعرہ کی نظامت میں کچھ اور انداز سے کر گیا کہ نسیم قریشی کے پان کی سرخی کچھ اور زیادہ سرخ ہو گئی۔ تعارف ہوا۔ اور جب میں نے شرر کا نام لیا تو اچانک پان کی پیک ٹپک پڑی اور وہ اپنے پان کی چھینٹوں سے تر رومال سے پوچھتے ہوئے بولے ''میں نے بھی کبھی شرر پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کا کام شروع کیا تھا لیکن کر نہ سکا۔ تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو میرے پاس کچھ مواد ہے وہ سب میں تمہیں دے دوں گا۔'' اور اس طرح مواد کی لالچ میں کم علی گڑھ

یونیورسٹی دیکھنے اور گھومنے کی لالچ میں میں ان کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ میں نے علی گڑھ میں نسیم صاحب کے ساتھ آفتاب منزل شمشاد مارکیٹ میں قیام کیا۔ پہلی مرتبہ تقریبا پندرہ روز اور دوسری مرتبہ ماہ ڈیڑھ ماہ۔ وہیں میری ملاقاتیں انگریزی کے سید امین اشرف اور اردو کے ابوالکلام قاسمی سے ہوئیں۔ علی گڑھ میں نسیم قریشی صاحب کی گھریلو زندگی ان کے نوکر چاکر، ان کا رہن سہن، ان کا پاندان، ان کی شیروانی، ان کی محفل آرائی، ان کے احباب اور پورے علی گڑھ میں ان کی حیثیت اور قدر و قیمت یہ ایک الگ باب ہے۔ اس پر پھر کبھی لیکن یہ ضرور ہے کہ علی گڑھ میں اکثر شخصیتوں کے الگ الگ باب ہیں اور کبھی کبھی تو یہ باب پڑھے بھی نہیں جا پاتے بقول شاعر

میری حیات کا افسانہ دیکھنے والو
کہیں کہیں سے یہ قصہ پڑھا نہیں جاتا

اسی زمانے میں میری ملاقات ایک ذہین طالب علم شارق ادیب سے ہوئی جسے ابتدا پڑھنے لکھنے کا، ادیبوں سے ملنے کا اور دوست بنانے کا شوق تھا۔ چنانچہ جلد ہی ہم دونوں دوست بن گئے۔ اور میں نے اس سے قاضی عبدالستار صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شارق نے شعبۂ اردو کے بجائے گھر پر ملاقات کی تجویز رکھی۔

ان دنوں قاضی صاحب دودھ پور کے ایک مکان میں رہتے تھے جس کے ایک حصہ میں وہ خود تھے اور دوسرے حصہ میں وحید اختر مرحوم۔ شام کو چپکے چپکے شارق مجھے قاضی صاحب والے حصے کی طرف لے گیا کچھ اس طرح کے دوسرے حصے کو خبر نہ ہو، میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس وقت تو ایسا لگا تھا جیسے ہم اپنے محبوب کے گھر میں اس کے والد کے ڈر سے چوری چھپے داخل ہو رہے ہوں۔ اب یاد تو نہیں کہ اس پہلی ملاقات میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اور ہو بھی کیا سکتی تھیں میں ایک ادنیٰ طالب علم تھا (آج بھی ہوں) البتہ اس پہلی ملاقات میں قاضی صاحب مجھے محبوب ہی لگے تھے اور وحید اختر والد۔ یہ ضرور یاد ہے کہ جب انھوں نے سنا کہ میں شرر کے تاریخی ناولوں پر ریسرچ کر رہا ہوں تو انھوں نے اپنے تاریخی ناول داراشکوہ اور صلاح الدین ایوبی پڑھنے کو کہا تھا اور شارق نے ہی یہ ناول پڑھنے

کو دیئے اور یہ ناول میں نے انھیں دنوں علی گڑھ میں ہی پڑھ ڈالے تھے۔ اور پھر جب علی گڑھ سے قربت ہوتی گئی تو اندازہ ہوا کہ علی گڑھ اپنے آپ میں ایک ریاست ہے جس میں نجانے کتنے داراشکوہ اور صلاح الدین ہیں۔ بہر حال جو کوئی بھی تھا اور جو کچھ بھی تھا اپنے آپ کو بادشاہ وقت سے کم نہ سمجھتا تھا۔ یہ بات اس وقت زیادہ محسوس ہوئی جب شعبۂ اردو میں ایک پروفیسر شپ تھی اور دو بڑے امیدوار تھے قاضی عبدالستار اور خلیل الرحمن اعظمی۔ خورشید الاسلام صدر شعبہ تھے۔ ان کا طوطی بولتا تھا۔ کچھ ان کے طوطے بھی بولتے تھے، رٹے رٹائے جملے۔ خیر میں تو باہر کا تھا، مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مجھے جو بات اچھی لگی تھی وہ یہ کہ ان دنوں پڑھنے لکھنے والے نوجوانوں کی بھیڑ تھی۔ شارق کے ذریعہ میری ملاقاتیں سید محمد امین، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، ابن کنول، صغیر افراہیم، غیاث الرحمن وغیرہ سے ہوئیں اور ابوالکلام قاسمی کے ذریعہ آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، عبید صدیقی، مہتاب حیدر نقوی، اسعد بدایونی، غضنفر وغیرہ سے پھر یہ دائرہ پھیلتا ہوا منظور ہاشمی، عبید الرحمن ہاشمی، پیغام آفاقی، نوری صاحب، پرویز جعفری، شہپر رسول، طارق سعید وغیرہ بزرگوں میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شہریار، اطہر پرویز، نورالحسن نقوی، زیدی جعفر رضا اور بزرگوں میں آل احمد سرور، معین احسن جذبی، اسلوب احمد انصاری تک جا پہنچا۔ شارق نے ہی دو ایک بار رشید احمد صدیقی سے بھی ملاقات کروائی۔ لیکن اس پوری بھیڑ میں قاضی صاحب کی بات اور شناخت بالکل الگ تھی۔ اس میں ان کے طور طریقہ اور رکھ رکھاؤ تو دخل تھا ہی شاگرد نوازی اور خورد نوازی کا بھی تھا شاید اس لئے کہ ہم سب سے زیادہ ان کے قریب تھے کچھ یہ بھی تھا کہ اشرف، طارق، شارق، کنول، غیث وغیرہ شروع ہی سے افسانہ نویسی کی طرف متوجہ تھے۔ اور ان کا فطری وفکری جھکاؤ ایک بڑے افسانہ نگار کی طرف تھا۔ غضنفر اس وقت شہریار کی طرف زیادہ متوجہ تھے، افسانے کی طرف بعد میں غالباً سولن میں ملازمت مل جانے کے بعد آئے۔ پیغام آفاقی کو کم از کم علی گڑھ تک اکادکا معمولی کہانی کے ذریعہ ہی جان سکا تھا۔ شارق اور طارق کے ساتھ میری نجانے کتنی ملاقاتیں قاضی صاحب سے ہوئیں۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا دائرہ پھیلتا گیا۔ لکھنؤ، الہ

آباد۔ پٹنہ، دہلی اور نجانے کہاں کہاں۔ ان ملاقاتوں کا نہ کوئی حساب ہے اور نہ کوئی فہرست۔ یہ مجھے ضرور یاد ہے کہ قاضی صاحب نے ہی سب سے پہلے تاریخی ناول کے فن اور اسلوب کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا تھا کہ جب تک تمھارا ذہن صاف نہ ہوگا کہ تاریخ کیا ہوتی ہے اور ناول کیا ہوتا ہے اور تاریخی ناول میں دونوں کی آمیزش ایک بیحد مشکل امر ہوتا ہے۔ اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ناول کی تمام قسموں میں سب سے مشکل قسم تاریخی ناول کی ہوتی ہے۔

''کیوں؟'' میں نے طالب علمانہ سوال کیا تھا۔

''اس لئے کہ اس میں تاریخ اور تخیل کا امتزاج ہوتا ہے اور یہ دونوں باہم بعد اور تضاد رکھتے ہیں۔ تاریخ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اور ناول، ناول کا قصہ، کردار، زبان وغیرہ کا تعلق حقیقت سے ہوتے ہوئے بھی تخیل و تصور ہوتا ہے۔ اپنی ایک دنیا آباد کرنی ہوتی ہے اور تاریخ آپ کو اپنی حقیقتوں سے باہر نہیں جانے دیتی وہاں تصور کے پر جلنے لگتے ہیں۔''

قاضی صاحب یہ سب باتیں ایک مخصوص اور پر شکوہ انداز میں کہتے کہ وہ خود ایک تاریخ یا تاریخی کردار لگنے لگتے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ان کا تخت اور گاؤ تکیہ اس پورے عمل میں کلیدی کردار ادا کرتے۔ کبھی تکیہ ان کی گود میں ہوتا اور کبھی وہ تکیہ کی گود میں۔ سچ بات یہ ہے کہ گھر کی آرام دہ زندگی میں گاؤ تکیہ ان کی شخصیت سے اس قدر گھل مل گیا تھا کہ انھوں نے تکیہ کے علاوہ کسی اور پر تکیہ کیا ہی نہیں۔ جب تکیہ پر ان کی کہنی ٹکی ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ کوئی تاریخ دہرانے جا رہے ہیں اور تاریخ میں سچائی تو ہوتی ہی ہے اور سچائی میں کڑواہٹ جو دراصل صداقت کی ہوتی ہے جسے قاضی صاحب سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ لیکن قاضی صاحب اس انتساب سے خوش ہی ہوتے حالانکہ اس خوشی میں کچھ ان کی خارجی اور نفسیاتی وجہیں بھی کام کرتی رہتیں جن کی تفصیل میں جانا مناسب ہے نہ سودمند۔ بس کچھ اشارے ہی کافی ہوں گے۔

جن دنوں وہ سلیمان حال کے سامنے رہتے تھے میں اپنے ایک دوست فخر الکریم کی تھیسس کی رپورٹ کے سلسلے میں ان کے پاس گیا۔ انھیں کچھ یاد نہ تھا موضوع دریافت

کیا تو میں نے عرض کیا اردو ناول میں خاندانی زندگی۔ پہلے تو مقالہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ نہیں ملا تو فرمایا شام کو رپورٹ لے کیجئے گا۔ آپ کا کام تو ہو چکا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا ایک خاص تیور میں بولے

''تاریخی ناول کو آپ کتنا سمجھ سکے؟''

میں نے اپنے طور پر کچھ باتیں کیں۔ تیور تیوری میں بدل گئے، فرمایا

''دیکھئے برخوردار تاریخی ناول پر کام کرنا آسان کام نہیں ہے۔ کتنے انگریزی کے تاریخی ناول پڑھے آپ نے.... یہ اردو والے تاریخ وارتخ کیا جانیں انھیں عشق ومحبت سے ہی فرصت نہیں۔ جب دیکھئے آنسو بہاتے رہتے ہیں بس مزاج اور موسم کی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ذرا ان شاعروں سے پوچھئے کہ فسانۂ عجائب پڑھی ہے آپ نے، آئین اکبری کا مطالعہ کیا، ابوالکلام کی نثر سمجھی آپ نے۔ اگر یہ کہہ دیں کہ سمجھ لی تو میں استعفیٰ دے دوں خون تھوکنا پڑتا ہے نثر لکھنے میں....''

پھر وہ کچھ اور بولے اور بولتے ہی گئے میرا دھیان دوست کی تھیس کی طرف لگا ہوا تھا۔ جب وہ چائے لینے اندر گئے تو میری نظر تخت کے نیچے پڑی، جہاں وہ مقالہ پڑا ہوا تھا، جلدی سے میں نے نکالا اور ان کی خدمت میں پیش کیا۔

اس سے پہلے بھی قاضی صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی پر میں نے تاریخ اور تاریخی ناول سے متعلق انگریزی میں لوکاچ اور بٹر فیلڈ کی کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے مقالہ میں پورا ایک باب تاریخی ناول کے فن سے متعلق منسوب کر دیا تھا، جسے بعد میں میں نے الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا اور جب میں نے یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی تو انھوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور پیار سے اپنے قریب بیٹھایا اور اپنا تازہ ترین ناول غالب کا ایک نسخہ عنایت کیا اور پھر یوں گویا ہوئے:

''فاطمی! کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ اردو یا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی زیادہ تر تاریخی ناول ایک خاص عہد میں ہی لکھے گئے۔ غدر کے بعد انیسوی صدی کی آخری دہائیوں میں۔ بیسویں صدی کی بعد کی دہائیوں میں کوئی ایک بھی تاریخی ناول دکھا دیجئے۔

سوائے قاضی عبدالستار کے۔"

میں نے عرض کیا شرر کے مقلدین صادق سردھنوی، ایم اسلم وغیرہ بیسویں صدی کے ہی ہیں۔

"یہ تاریخی ناول نگار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو ناول نگار ہی نہیں یہ سب کمرشیل رائٹر ہیں۔ یہ ناول کم لکھتے ہیں قوم کو افیم زیادہ کھلاتے ہیں۔ ان کے یہاں تاریخ ہے نہ ناول۔ اور کون ہے بتایئے۔"

میرے ذہن میں عصمت چغتائی کا ناول 'ایک قطرہ خوں' کا نام آیا۔ 'آگ کا دریا' کو بھی ہم نیم تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میں نے مارے احتیاط کے ان کے نام نہیں لئے کہ یہ خواتین ہیں اور پتہ نہیں جھونک میں قاضی صاحب اس طرح نواز دیں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں احترام کا بھی جذبہ ہے۔ اور دونوں بڑی خواتین کا نام بیحد احترام سے لیتے رہے ہیں۔ آپ قاضی صاحب کی گفتگو جس انداز سے لیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ 'داراشکوہ' اور 'صلاح الدین ایوبی' طرز کے ناول اس عہد میں نہیں لکھے گئے۔ یہاں ایک بات پر میں اور چونکا تھا کہ تاریخی ناول نویسی کے عمل میں عام طور پر تاریخی ناول نگار ماضی بعید کے واقعات زیادہ لیتا ہے تاکہ حقائق جتنے مبہم ہوں گے اتنا ہی تصور و تخیل کو کام کرنے کا موقع زیادہ ملے گا۔ اردو میں ایسے ہی ناول زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً فردوس بریں، ایام عرب، زوال بغداد، بعض دوسرے لیکن قاضی صاحب کے ساتھ مقاصد برعکس ہے۔ جو شہرت دراشکوہ کو ملی وہ صلاح الدین ایوبی کے حصہ میں نہیں آئی۔ حالانکہ زبان و بیان کے معاملے میں جتنی محنت انھوں نے صلاح الدین ایوبی میں کی ہے جو تاریخی ماحول ابھارا ہے وہ داراشکوہ میں نہیں ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر قاضی صاحب سے کبھی بات نہیں کی اس لئے کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے پھر مجھے علی سردار جعفری کے وہ جملے یاد آگئے کہ ادب اور تخلیق کے معاملات عجیب وغریب ہوتے ہیں یہاں کوئی بندھا ٹکا اصول یا پیمانہ کام نہیں کرتا۔ اکثر عمدہ ادب ناہموار ماحول میں پھلتا پھولتا ہے۔ اس کی مثال وہ اس طرح دیتے کہ دیکھو دکن میں کس قدر شیعی ماحول

اور تہذیب تھی لیکن انیس لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کم و بیش یہ عجیب و غریب باتیں قاضی صاحب کی شخصیت اور لٹریچر میں ہیں۔ قاضی صاحب کے ساتھ بہت کچھ عجیب ہے۔ بنے بنائے راستوں پر چلنا انھیں پسند نہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بنانے کے قائل ہیں اور کہیں بھی اس راہ میں روکاوٹ آجائے تو قلم سے لے کر تلوار تک آجاتے ہیں۔ میں اکثر اس تیکھے پن جو کبھی کبھی کڑوے پن میں بدل جاتا غور کرتا۔ ڈاکٹر غیاث الدین نے قاضی صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''قاضی عبدالستار دوست اور دشمن کا اشتہار علی العلان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رعایت کا خانہ خالی نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں نے انھیں اکھڑ، ضدی اور بد دماغ کا نام دے رکھا ہے اور قاضی صاحب کو یہ نام بہت پسند ہیں۔'' (مقدمہ آئنۂ ایام ص ۸)

ماہر نفسیات فرائڈ نے لکھا ہے کہ بچپن کی فطری مسرتوں سے محرومی یا حصول مسرت میں بیجا قسم کی رکاوٹیں آگے چل کر طبیعت میں ضد یا انانیت پیدا کر دیتی ہیں۔

مجھے قاضی صاحب کے بچپن کے واقعات کا زیادہ علم نہیں۔ البتہ ان کی زبان سیتاپور کے مچھریٹہ گاؤں کا ذکر سیکڑوں بار سنا جہاں وہ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ کہیں میں نے یہ بھی سنا یا پڑھا کہ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے ماموں قاضی جمیل الدین ایڈوکیٹ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ والدین کے بارے میں زیادہ علم تو نہیں ہے لیکن ماموں کے ذریعہ تعلیم و تربیت کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ والدین کی محبت و صحبت سے محرومی۔ ہر چند کہ زمیندار گھرانے کی شان بان کے ماحول میں وہ پلے بڑھے اور سارے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرتے گئے۔ لکھنؤ کے خالص ادبی و تہذیبی ماحول میں وہ بڑے ہوئے اور اعلیٰ تعلیم احتشام حسین اور محمد حسن جیسے بڑے نقادوں کے سایے میں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے اور پھر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں قنوطیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ سیتاپور، لکھنؤ

کے شعری و ادبی ماحول میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ پھر پتہ نہیں کب اور کن حالات میں وہ کہانی کی طرف آ گئے۔ اور ان کی پہلی کہانی 'اندھا' کے عنوان سے لکھنؤ کے رسالہ 'جواب' میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی لیکن ان کو اصل شہرت اس وقت ملی جب ۱۹۵۳ء میں ان کا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' ادارۂ فروغ اردو کی طرف سے شائع ہوا۔ جسے بعد میں ہندی والوں نے پہلا اور آخری خط کے نام سے چھاپا۔ پھر اردو میں بھی اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا ناول 'شب گزیدہ' ۱۹۵۹ء میں نقوش میں چھپا۔ ان کی غیر معمولی شہرت یافتہ کہانی 'پیتل کا گھنٹہ' ۱۹۶۲ء میں رسالہ کتاب میں شائع ہوئی۔ ان دنوں قاضی صاحب شہرت کے آسمان پر تھے اور ان کی تخلیقات دھڑا دھڑ شائع ہو رہی تھیں۔ 'بادل'، 'مجو بھیا'، 'غبار شب' کے علاوہ 'دارا شکوہ'، 'صلاح الدین ایوبی'، 'غالب'، 'خالد بن ولید'، 'حضرت جان' وغیرہ۔

اس مختصر سے تعارف سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سا واقعہ، حادثہ یا موڑ تھا جس نے قاضی صاحب کو ایسی ملازمت عزت و شہرت کے باوجود ان کی زندگی اور شخصیت کو کسی من چاہی آسودگی سے محروم رکھا۔ البتہ کبھی کبھی یہ ضرور ہوتا ہے کہ شفقت و محبت کی کمی یا جنسی عدم تشفی اندر ہی اندر ایک خاص قسم کی کجی پیدا کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی سماجی اور خارجی عناصر بھی عجیب و غریب انداز سے کام کر جاتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اردو کی ایک خاص تہذیب و تعلیم میں ڈھلا ہوا شخص دوسروں کی بد تہذیبی اور جہالت کو پل بھر کے لئے برداشت نہیں کر پاتا۔ یہ اور بھی غور طلب ہے کہ وہ شاعری سے نثر نگاری کی طرف کیوں اور کیسے آ گئے۔ ان کی تحقیق کا موضوع بھی یاسیت و قنوطیت سے پُر تھا۔ کچھ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی گڑھ نے ان کی زمیندارانہ و معیار پرستانہ اقدار کی قدر نہ کی ہو کہ ایک سے ایک جاگیردار وہاں پہلے سے ہی براجمان تھے۔ اور علی گڑھ خود ایک رجواڑہ بن چکا تھا۔ علی گڑھ کی سیاست اور منافقت بھی دور دور تک شہرت رکھتی ہے۔ سرور صاحب کی سیاست کو قاضی صاحب سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے ریٹائر ہو جانے کے بعد جو جگہ خالی ہوئی اس کے دعویدار ہوئے مقابلہ خلیل الرحمٰن اعظمی سے تھا۔ ان کی بھی ایک حیثیت تھی اور وہ ان دنوں

بیمار بھی تھے۔ اس لئے تھوڑی سی ہمدردی بھی تھی لیکن جب نتیجہ آیا تو قاضی صاحب پروفیسر ہوئے نہ خلیل صاحب ایک تیسرے صاحب ہو گئے جن کی حیثیت ان دونوں کے مقابلے بہت کم تھی۔ ایک خیال ہے کہ اس حادثہ نے تو خلیل صاحب کی جان ہی لے لی۔ قاضی صاحب کی تلخی۔ برہمی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ ان کی اب تک کی زندگی کا خراب ترین دور تھا۔ اس خرابی اور جنون میں اوران کے مشیر کاروں نے کچھ ایسے کام بھی کروائے جو عام ہوش وحواس کے عالم میں وہ کبھی نہ کرتے۔ وقت بدلا تو وہ پروفیسر بھی ہوئے اور صدر شعبہ بھی اور پھر وہ لوگ بھی ان کے قریب آ گئے جو ان کی پروفیسری کے خلاف تھے۔ البتہ ہم جیسے شاگردان ان کے دوران صدارت دور دور ہی رہے۔ لیکن یہ دوری اس وقت معدوم ہو گئی جب وہ ریٹائر ہو گئے۔ اس لئے کہ ہمیں تو ان کی ذات سے پیار تھا، ان کے اندر کے فنکار سے لگاؤ تھا، احترام تھا۔ اس درمیان ان کی گھریلو زندگی بھی متاثر ہوئی۔ ان کی دوسری بیوی جنھیں ہم کوثر آپا کہتے تھے، ذہنی طور پر بیمار ہو گئیں، اس کے اثرات بھی قاضی صاحب پر پڑے۔ ہم نے ان کی پریشانیوں کو قریب سے پڑھا۔ ہم خود بھی پریشان ہوئے۔ پریشانی بانٹنے کی فکر بھی کی۔ لیکن یہ قاضی صاحب کا حوصلہ تھا کہ وہ ان تمام طوفانوں کو برداشت کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس درمیان انھوں نے بہت کم لکھا۔ ایک ضد میں 'حضرت جان' جیسا ناول لکھ گئے جو کامیاب نہ ہو سکا۔ تخلیق وتحریر کے اعتبار سے یہ ان کا کمزور دور تھا ان کو جو کچھ لکھنا تھا ۱۹۷۰ء سے قبل لکھ چکے تھے۔ اب وہ تقریر سے کام چلاتے تھے اور یقیناً وہ مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ حالات نے ان کے اندر جھنجلاہٹ ضرور پیدا کر دی تھی لیکن جھنجلاہٹ، بے باکی اور صاف گوئی میں ڈھل کر ان کی تقریر کا خوصورت حصہ بن گئی۔ پہلے وہ شاعری کے خلاف تو بولتے ہی تھے اب تنقید کے خلاف بھی بولنے لگے۔ ان کا یہ جملہ بیحد مشہور ہوا ''اردو تنقید نے اردو افسانے کے ساتھ وہ سلوک کیا جو لنکا نے رام کے ساتھ کیا تھا۔'' یا ''کسی اس شاعر کا نام بتایئے جسے پیغمبری ملی ہو۔'' ان کی باتیں، ان کی تقریریں دلچسپ اور معلوماتی ہوتی تھیں اور سامعین پر نشتر بھی لگاتی تھیں۔ ادیبوں و شاعروں کو شرمسار بھی کرتی تھیں کہ اردو والوں میں غیبت اور منافقت کرنے والوں کی تعداد

بڑھتی جا رہی تھی۔ گورکھپور ریڈیو اسٹیشن پر طارق چھتاری نے افسانے سے متعلق جو پروگرام کیے اس میں انھوں نے افسانے کے فن سے متعلق جو تقریریں کیں وہ یادگار تھیں۔ اس سیمینار میں ہندی کے بڑے بڑے افسانہ نگار بھی موجود تھے۔ قاضی صاحب کی تقریروں سے وہ جھوم جھوم اٹھے کہ اس نوعیت، صداقت اور بلاغت کے ساتھ تقریر ہندی میں کہاں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندی دنیا جو قاضی صاحب سے پہلے سے بھی واقف تھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھانے لگی اور ان کی چیزیں ہندی میں بھی آنے لگیں اور میرا خیال ہے کہ ہندی میں جتنے مقبول و معروف قاضی صاحب ہوئے ان کے ہمعصروں میں کوئی اور نہ ہو سکا۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو عصمت چغتائی کا انتقال ہو گیا۔

جنوری ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ دہلی اردو اکادمی نے ''عصمت چغتائی اور نیا اردو افسانہ'' کے عنوان سے سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ بے شمار نئے افسانہ نگار بلائے گئے، ساتھ ہی ساتھ کچھ سینئر بھی مثلاً قاضی عبدالستار، جوگیندر پال، رتن سنگھ، کلام حیدری وغیرہ بھی تھے۔ اور پرانی نسل کے لوگوں میں حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری وغیرہ بھی سیمینار میں شریک ہوئے۔ وہ ایک یادگار اور تاریخی سیمینار تھا۔ جس کے مہتمم خاص قمر رئیس صاحب تھے۔ ایک اجلاس کی صدارت قاضی صاحب کو کرنی تھی اور عصمت کی زبان پر انھیں مقالہ پڑھنا تھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا کہ ان دنوں وہ تقریر سے زیادہ کام چلاتے تھے چنانچہ اس سیمینار میں بھی انھوں نے تقریر ہی کی لیکن وہ ایک یادگار تقریر تھی۔ پہلے تو انھوں نے میرامن، رجب علی بیگ سرور کے اسلوب پر باتیں کیں اس کے بعد آزاد شبلی وغیرہ کی انشاپردازی کی خوبیاں بیان کیں ان حوالوں سے جب بیحد خوبصوت اور معنی خیز پس منظر تیار ہو گیا تب عصمت کی نثر پر بڑے اعتماد سے بولے:

''عصمت نے عورتوں کے جو محاورے دیے ہیں
اور اسلوب کی نئی قلم لگائی ہے اس سے اردو ادب خالی
تھا۔ اس سے قبل نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ نے عورتوں
کے محاورے لکھے تھے لیکن جلد ہی وہ ہانپ جاتے

ہیں۔لیکن عصمت نے بے تکان لکھا وہ صدہا صفحات لکھتی چلی جاتی ہیں۔ان کے کردار سے زیادہ ان کے مکالمات مضبوط ہیں۔عصمت کو مکالمات پر قدرت حاصل ہے۔ان کی ساری انفرادیت ان کی زبان کے طلسم پر ہے۔لفظ ان کا میڈیم ہے جیسے مصور کا رنگ میڈیم ہوتا ہے۔جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیقی زبان کے بغیر افسانہ ہو سکتا ہے میرا خیال ہے کہ وہ اپنی رائے پر دوبارہ غور کریں۔.....سای دنیا کے عمدہ افسانہ نگاروں نے اگر سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں تو درجن بھر کہانیاں ہی زندہ رہی ہیں۔عصمت کی درجن بھی کہانیاں زندہ رہیں گی، لحاف ان میں نہیں آتی۔لوگوں نے عصمت کی عمدہ کہانیاں پڑھی نہیں ہیں۔لحاف کی شہرت ان کو کم نصیب کرنے کے لئے دی گئی ہے۔عصمت کے ساتھ تنقید نے سنجیدگی نہیں برتی اور آج بھی یہی صورت ہے۔عصمت، بیدی، منٹو میں سے ہر ایک پر نصف درجن کتابیں لکھی جانی چاہئے تھیں لیکن افسوس کہ یہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اس سے زیادہ بدنصیبی کہ اردو زبان میں پیدا ہوئے۔افسانے کی تنقید مشکل کام ہے۔تنقید کی تن آسانی اور افسانے مشکل پسندی نے افسانے سے تنقید کو دور رکھا.....''

میں علی سردار جعفری کے بغل میں بیٹھا اس سیمینار کی رپورٹ تیار کر رہا تھا جو بعد میں رپورتاژ کی شکل اختیار کر گئی۔مجھے تیزی سے لکھتا دیکھ کر جعفری صاحب بولے ''ٹیپ کر لیتے بھائی۔بہت اچھی تقریر کی ہے قاضی صاحب نے'' سردار جعفری جو خود بہت بڑے

مقرر اور مفکر تھے ان کی تعریف ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقریر اور مقالوں کے بعد بحث بھی ہوئی تھی اور میں نے بھی کچھ عرض کرنے کی جسارت کی تھی۔ ہر تخلیق کار کا اپنا ایک میدان ہوتا ہے۔ اصل خلاقی تو وہاں دکھاتا ہے اور جہاں اِدھر اُدھر ہوا بھٹکنے لگتا ہے۔ کم لوگ ایسے ہیں جو بیک وقت کئی موضوعات اور لب ولہجہ پر قدرت رکھتے ہوں۔ قاضی صاحب کس ضرورت سے باہر جانے لگے ان کو جاتے دیکھ کر میں نے کہا تھا۔ چونکہ قاضی صاحب بار تشریف لے جارہے ہیں اس لئے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی بات کی تائید میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ خود قاضی صاحب کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ خطہ اودھ زوال پذیر جاگیردارانہ ماحول۔ جب وہ اس میدان سے باہر نکلتے ہیں تو ان کا قلم تھکنے لگتا ہے۔ قاضی صاحب رُکے سنا اور پھر باہر چلے گئے۔ کچھ لوگوں نے میری باتوں سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ آخر میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے قاضی صاحب نے فرمایا تھا:

> ''میں اپنے خوردوں کا خاصا لحاظ کرتا ہوں۔ بزرگوں کا نہیں۔ فاطمی کو میرے سامنے کہنا چاہئے۔ جوش نے کہا تھا میری تخلیقات شیر کے بچے ہیں اگر زندہ رہیں گے تو کھیلیں گے ورنہ مر جائیں گے۔ میں وہاب اشرفی کا جواب نہیں دوں گا کہ میں ہندوستان کی جمہوریت کا معزز شہری ہوں۔ اس لئے بحث نہیں کروں گا۔ نثر کا سب سے بڑا اعجاز پیراڈاکس (Paradox) میں ہے۔ اور پیراڈاکس میں لکھنا بہت مشکل ہے۔ اردو کے چند ادیب ہی ایسی نثر لکھ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت آزاد، شبلی، منٹو، عصمت اور رشید احمد صدیقی کے یہاں ملتی ہے۔ اردو افسانے کی تنقید ٹھہر گئی ہے کم زبان ہو گئی ہے۔ شعر کے عظمت کے وقت تقریر کی بات نہ کیجئے

خطابت کی بات کیجئے پھر فیصلہ کیجئے پھر فیصلہ کیجئے۔''
اور قاضی صاحب بہتے چلے گئے۔ آواز بلند سے بلندتر ہوتی گئی۔ اب وہ قاضی صاحب نہیں لگ رہے تھے جو تھوڑی دیر قبل ایک سنبھلی ہوئی متوازن تقریر کررہے تھے۔ اس وقت ان کی تقریر میں خطابت کم للکار زیادہ تھی۔ ہم میں سے کسی نے ان کی انا کو چھیڑ دیا تھا اور وہ انانیت انھیں بولنے پر مجبور کررہی تھی پھر یہ بھی کہ سیمینار میں جو بات زور سے کہی جائے وہ فوری طور پر سچ ہوتی ہے بعد کا سچ خواہ کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن سیمینار میں کئی مقالے، تقریریں اور افسانے پڑھے گئے تھے جن پر خوب بحثیں بھی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ہم سب بہت تھک گئے تھے۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ پورے سیمینار میں نوجوانوں نے بازی ماری تھی۔ جس سے ہم سب بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں ہم سب طارق چھتاری کے گھر کی طرف چل پڑے جو ان دنوں نیو فرینڈز کالونی میں رہتا تھا اور دہلی ریڈیو آفیسر تھا۔ ہمارا پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، انجم عثمانی، فرحت احساس، سلام بن رزاق، ساجد رشید، خورشید احمد اور طارق پر مشتمل تھا۔ جس کی سربراہی قاضی صاحب فرما رہے تھے۔ جن کی تقریر سے ہم سب خوش تھے اور پیار و اصرار سے ان کو اپنے ساتھ لے آئے تھے اور وہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ آ بھی گئے۔ ان کو کہیں جانا تھا لیکن وہ ایسی کئی شامیں اپنے شاگردوں اور صحبتوں کے لئے قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی اسی ادا پر تو ہم جان چھڑکتے تھے۔ ہم سب بیحد موڈ میں تھے قاضی صاحب کچھ زیادہ ہی۔ ایک تو اپنی کامیابی دوسرے شاگردوں کی کامیابی۔ دہلی جیسے شہر میں ان کے شاگرد انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہر طرح کا انتظام کرتے۔ لیکن اس دن سارا انتظام خود قاضی صاحب نے کیا تھا، کھانے سے لے کر پینے تک۔ اس لئے کہ وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے۔ ان کے اس شفقت آمیز موڈ کا پہلا شکار میں ہی ہوا۔

''دیکھئے فاطمی صاحب! آپ نے شرر پر کام کیا ہے
ان کے سارے ناول پڑھے ہیں لیکن کیا وہ تاریخی ناول
لگتے ہیں۔ کیا شرر ایک ناول کو بھی تاریخی زبان دے

سکے ہیں۔ دربار یا جنگ کا نشہ کھینچ سکتے ہیں کیا وہ جانتے
تھے کہ تاریخ لکھنے کی کیا زبان ہوتی ہے اس کے برعکس
پڑھئے 'داراشکوہ' اور 'صلاح الدین ایوبی'....''

''جی میں نے پڑھے ہیں یہ ناول'' میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔

''یقیناً آپ نے پڑھے ہوں گے اور آپ کو پڑھنا بھی
چاہئے اور یہ سب چیزیں پڑھے جانے کے قابل ہیں۔''

قاضی صاحب کچھ اور بھی فرماتے رہے۔ میں سوچتا رہا کہ اچانک شرر کا ذکر کیوں۔ پھر جلد ہی سمجھ میں آ گیا کہ معاملہ اسلوب کا ہے اس کی رنگارنگی کا ہے ساتھ ہی صبح والی بات کی وضاحت کا بھی۔ میں نے صرف اتنا ہی عرض کیا:

''شرر کے ناول تاریخی کم رومانی زیادہ ہیں پھر اس
وقت ناول نویس کا وہ شعور پروان نہ چڑھ سکا تھا۔''

قاضی صاحب تھوڑا نرم ہوئے پھر بھی کچھ دیر تک اسی قسم کے موضوعات پر بیحد خوبصورت اور پر مغز گفتگو رہی اور ہم تمام نئے لکھنے والوں کا حلقہ ہمہ تن گوش تھا۔ ان کی خدمت میں مؤدب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمارے استاد تو تھے ہی قاضی اور مفتی بھی۔ مفتی اس لئے کہ اس وقت انھیں کی وجہ سے وہ دعوت ہمیں مفت میں نصیب ہوئی تھی۔ جب سب بیٹھ گئے تو قاضی صاحب نے زیر لب تبسم فرما کر کہا۔ ''ذرا فاطمی کی کلاس لے رہا تھا یہ بھی میرے شاگردوں کی طرح ہے۔''

''یقیناً آپ میرے استاد ہیں۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میرے دل میں آپ کے لئے بیحد احترام ہے۔'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

''مجھے معلوم ہے اسی لئے تو میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔ ویسے فاروقی (پیغام آفاقی) بھی میرے براہ راست شاگرد نہیں ہیں یہاں شاگردوں میں خورشید، طارق، غضنفر اور اشرف ہیں۔ لیکن میں فاروقی کو بھی اپنا شاگرد مانتا ہوں۔''

''ہم سب آپ کے شاگرد ہیں اور ہم آپ کی بیحد قدر کرتے ہیں اور آپ کا یہ

بڑکپن ہے کہ آپ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کو نوازتے ہیں۔" سلام بن رزاق نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ قاضی صاحب نے بڑی محبت سے ہم سب کو مخاطب کیا اور بولے:

"مجھے بیحد خوشی ہے کہ آپ لوگ آج کے سیمینار میں ہی نہیں بلکہ آج کے ادب میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور بزرگوں کے رعب وداب میں آئے بغیر اپنی باتیں کہہ رہے ہیں۔ میں نے بھی یہی کیا تھا۔ آپ اپنی بات کہئے اس میں ذرا بھی ہچکچایئے نہیں۔ مائک چھین کر اپنی بات کہئے۔ ہٹا دیجئے سب کو اپنی راہ سے۔ ڈائنامک ہونے کی ضرورت ہے۔ میرے لئے ایک استاد کے لئے اس سے بڑھ کر اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ میرے خوردوں، میرے شاگردوں میں اتنا حوصلہ اور اتنی طاقت آ چکی ہے کہ وہ اپنی آواز میں اپنی بات کہہ سکیں اور ان کی آواز نہ صرف سنی جائے بلکہ حاوی رہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ نسلیں آتی ہیں ان میں جو کمزور ہوتے ہیں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جاتے ہیں لیکن جن میں جان ہوتی ہے وہ سر اٹھا کر اپنی بات کہتے ہیں اور منواتے ہیں۔ آج آپ لوگوں نے جس حوصلہ او جوش وخروش سے اپنی بات کہی ہے یہ آپ کا حق ہے...... یہ کیا کہ آپ جی رہے ہیں چوہوں کی طرح۔ آپ کیا ہیں صاحب۔ اردو کے شاعر ہیں۔ مرے کچلے شاعر۔"

میں نے بات کا رخ بدلا اور عرض کیا

"یہ دیکھئے قاضی صاحب غضنفر آپ کے شاگرد ہیں!"

"جی ہاں میرے شاگرد ہیں۔ اگر ان کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"اردو اکادمی نے ان سے بھی مقالہ لکھنے کو کہا تھا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ سردی بہت ہے۔" میں نے بات میں گرمی پیدا کرنی چاہی۔

"یہ سردی کیا شئے ہوتی ہے غضنفر صاحب۔ اس عمر میں ہم نے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔"

"آپ نے تو اس عمر میں بھی بڑے بڑوں کے....." میں نے لقمہ دیا۔

"شیر کی طرح جینا چاہیے۔ گیدڑ کی طرح نہیں، ہاں تو جناب آپ کی عمر شریف؟"

"وہ۔ وہ قاضی صاحب سولن میں واقعی بہت سردی پڑ رہی ہے پھر میں باقاعدہ نقاد نہیں ہوں۔" غضنفر استاد کے سامنے منمنائے۔ "یہ نقاد کیا ہوتا ہے۔ کس کھیت کی مولی ہوتی ہے۔ آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔" پھر قاضی صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا "معاف کیجیے گا آپ میں سے کوئی نقاد تو نہیں۔"

"یہ فاطمی اور خورشید ہیں" انجم عثمانی نے شرارتاً جلدی سے ہمارے نام لے لئے۔

"نہیں خدا کے فضل سے یہ لوگ نقاد نہیں ہیں۔ خورشید میرے شاگرد ہیں اور فاطمی بھی شاگرد ہی ہیں۔ اور جو میرے شاگرد ہیں وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں نقاد نہیں۔ ہاں تو صاحبزادے آپ کو مقالہ لکھ کر آنا چاہیے تھا، اپنی بات کہنی چاہیے تھی۔"

"دیکھو نہ بھائی، ہم لوگ بھی تو لکھ کر لائے ہیں اور پڑھیں گے۔" ساجد رشید نے فتح کا اعلان کیا اور نقاد کو شکست دے دی۔ قاضی صاحب کے تنقید کے خلاف حملے زمانہ بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ اگرچہ کسی زمانے میں انھوں نے بھی اس میدان میں خامہ فرسائی فرمائیں کی تھی۔ اور اردو شاعری کی قنوطیت پر باقاعدہ کتاب لکھی اور چھپوائی۔ جمالیات پر بھی ایک کتاب لکھی، افسانے کی تنقید پر بھی ان کے مضامین ہیں۔ لیکن اس میدان میں زیادہ بات بنی نہیں۔ قاضی صاحب پھر بولے:

"دیکھئے صاحب معاملہ یہ ہے کہ ترقی پسندوں میں
صف اول کا نقاد ہے ہی نہیں۔ تخلیق کار صف کے
ضرور ہیں۔ ان پر صف سوم کے نقادوں نے تنقید کر کے

صف دوئم میں آ کھڑے ہوئے اور شمار ہوا صف اول کے
نقادوں میں۔ ہمارے یہاں جتنے بھی بڑے نقاد ہیں وہ
سب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ حالی، شبلی، آزاد سب
شاعر ہیں۔آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری پہلے تخلیق کار
ہیں اس کے بعد نقاد۔ احتشام حسین بھی شعر کہتے تھے
باقاعدہ شعر کہتے ہوئے پکڑے گئے۔ اردو تنقید بانجھ
عورت کی طرح ہے۔کمزور اور کھلنجی ہے۔"

اور قاضی صاحب پوری ترنگ میں اردو تنقید کی تواضع کرتے رہے۔ایسی تواضع وہ اکثر کرتے رہے ہیں۔ وہ شام ایک یادگار شام تھی۔ایک حسین اور کبھی نہ بھلائی جانے والی شام۔

یہ محض ایک واقعہ کی روداد ہے یا قاضی صاحب کی شخصیت کی کج کلہی اور کج ادائی کی ایک جھلک ان کے بیباک فکر وخیال ان کی تخلیقی نوعیت کی تقریر وتحریر۔ان کی فنکارانہ گل افشانی گفتار۔ان کے اقدار ان کے کردار کے ایسے نجانے کتنے واقعات ہیں کہ اگر ان کو لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب تیار ہو جائے۔ ۱۹۸۷ء میں ہم لوگوں نے الہ آباد میں نئی کہانی پر بڑا سیمینار کیا تھا جس میں افتتاح کرتے ہوئے قاضی صاحب نے افسانے کے فن پر بہت اچھی تقریر کی تھی۔اسی طرح خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سیمینار کی تقریر۔ مجھے ان سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ذاتی محفلوں میں بھی جس طرح کی علمی گفتگو کرتے اس میں تخلیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا رنگ ہوتا گر ان کے مضامین، تقریریں، انٹرویو وغیرہ جمع کیے جائیں تو یقین ہے کہ فن افسانہ سے متعلق وہ ایک بیحد کارآمد معیاری کتاب ہو سکتی ہے۔ بہر حال ہم شاگردوں سے ان کی محبتیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی وابستگی۔ پھر اس سے روٹھ کر جنوادی لیکھک سنگھ میں چلے جانا اور ترقی پسندوں کو برا بھلا کہنا۔قمر رئیس، سید محمد عقیل، اقبال مجید، عابد سہیل، رتن سنگھ جیسے ہم عصروں سے ان کی محبت اور دوستی۔ سردار جعفری، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کی نفرت

اور دشمنی۔ احتشام حسین، محمد حسن، جذبی، عصمت، قرۃ العین حیدر، اشک وغیرہ کے تئیں ان کا احترام۔ ان سب کے الگ الگ رنگ تھے اور الگ الگ انداز لیکن معاملہ احترام وعقیدت کا ہو یا محبت ونفرت کا قاضی صاحب کے تمام طرح کے رویوں میں ایک مخصوص شدت اور وحدت رچی بسی ہوتی۔ وہ دوستی بھی دشمنی کی طرح کرتے اور دشمنی بھی دوستی کی طرح۔ ان سب کی کہانیاں یکساں ہیں لیکن ہیں بے شمار جن کی تفصیل میں جانا فی الوقت ممکن نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ جو بھی کرتے اس میں ریاکاری اور مکر وفریب دور دور تک نہ ہوتا۔ ان کا اندرون اور بیرون ایک ہے دوہری شخصیت تو ان کو چھو بھی نہیں گئی۔

بہر حال قاضی صاحب اپنی منفرد، انوکھی، البیلی شخصیت اور سادگی بھرے کردار کی وجہ سے اور سب سے بڑھ کر اپنی بابانگ گوئی کی وجہ سے اپنی زندگی میں خود ایک افسانہ بن گئے۔ وہ جتنے مقبول اور ہر دل عزیز ہیں اس میں ان کی شخصیت کی گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ ان کی کڑواہٹ کا بھی بڑا دخل ہے۔ ان کی گفتگو میں رسیلے پن کے ساتھ ساتھ ایک نوکیلا پن بھی ہوا کرتا ہے۔ کل ملا کر ان کی شخصیت اس کانٹے کی طرح ہے جو گلاب کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ ساتھ کھلتا ہے او نسیم بہار اس کی اسی طرح پرورش کرتی ہے جس طرح گلاب کی پنکھڑیوں کی۔ ان کے شخصی اور تخلیقی دونوں اسلوب کو ان کیفیتوں سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔

میں نے یہاں ان کے افسانوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں ان کے افسانوں کا جتنا عمدہ قاری ہوں فکری ونظریاتی طور پر اتنا ہی نکتہ چیں بھی، اس لئے کہ ان کے افسانوی ادب پر پھر کبھی عرض کروں گا۔ لیکن علی گڑھ کے تعلق سے یہ بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے اس علمی شہر میں کئی دہائیاں گذاریں اور ان کے فکر وشعور کا بڑا حصہ اسی شہر میں پروان چڑھا لیکن سیتاپور مجھریٹہ ان سے کبھی الگ نہ ہو سکا۔ اکثر علی گڑھ والوں کی علی گڑھ کمزوری ہوتی ہے لیکن قاضی صاحب ک کمزوری علی گڑھ نہ تھی۔ بلکہ اگر میں یوں کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ جس زمانے میں وہ شدت سے ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھے اس کی ایک وجہ علی گڑھ بھی تھی۔ اگر چہ ان کے کچھ بہت اچھے شاگرد حق شاگردی ادا

کرتے رہے اور ان کی پریشانیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ان کے دل و دماغ اور گھر کی پریشانی کس طرح تقسیم کرتے۔ ابھی تک آخری بار جب میرے دعوت پر الہ آباد آئے تو میں نے بھی یہی بات محسوس کی میں نے ہر طرح سے ان کی خدمت اور دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ اشک صاحب کے بیٹے نیلابھ کے ساتھ شام کا اہتمام کیا اس شام قاضی صاحب نے اشک صاحب کو بہت یاد کیا۔ تقریباً آبدیدہ ہو گئے پھر پیار سے نیلابھ کو ڈانٹنے بھی لگے، پھر اسی کیفیت میں اپنے گھر اور بیٹے کے حالات بیان کیے۔ ہم سب ان کے دکھوں کو سنتے رہے، سوچتے رہے کہ یہ بدنصیبی صرف ہندوستان اور بالخصوص اردو کے ادیبوں کے حصہ میں آئی ہے۔ الہ آباد سے رخصت ہونے لگے تو مجھے گلے سے لگایا اور پھر پھسریٹہ چلے گئے کہ وطن جانا ان کی مجبوری تھی۔ قاضی صاحب ادھر کافی عرصہ سے اپنے اصل وطن میں ہی رہ رہے ہیں۔ وہ ادب اور آج کی دنیا سے تقریباً کٹ چکے ہیں لیکن ان کی تحریریں و تقریریں، ان کے افسانے اور ناول پورے رنگ، آہنگ اور گھن گرج کے ساتھ پڑھے جاتے رہیں گے۔ آج بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ الہ آباد آئیں گے۔ میرے شاگردوں سے ملیں گے اور اسی انداز ولب ولہجہ میں کہیں گے

فاطمی میرا شاگرد تو نہیں ہے لیکن شاگرد کی طرح ہے۔ میں اسے بہت عزیز رکھتا ہوں۔ یہ فکشن پڑھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ ادب پڑھنا ہے لکھنا ہے تو پہلے سچ بولنا سیکھو۔ جھوٹوں کو شرمندہ کرو۔ نام نہاد ادیبوں کو اکھاڑ پھینکو۔ چاپلوسی کو ذلیل کرو اور خوب پڑھو۔ جس نے آزاد، شبلی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کو نہیں پڑھا تو اسے ادب نہیں پڑھنا چاہئے۔ اسے گھاس چھیلنا چاہئے۔"

زندگی بھر اپنے سچے صداقت آمیز اور بے باکانہ جملوں اور رویوں کی وجہ سے قاضی صاحب نے جتنے دوست بنائے اس سے زیادہ دشمن بنائے۔ ان کے دشمن بھی کئی

طرح کے ہیں۔ کوئی انھیں افسانہ نگار ہی نہیں مانتا۔ کسی کی نظر میں وہ ایک معمولی افسانہ نگار ہیں۔ اور بعض انھیں بزعم خود غلط اور کمزور انسان سمجھتے ہیں لیکن سچائی تو ان سب تعصبات سے دور اپنا کام کرتی رہتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو افسانے کی کوئی بھی تاریخ اور کوئی بھی فہرست ایسی نہ ہوگی جس میں قاضی صاحب کے افسانے اور ناول شامل نہ ہو سکیں۔ جہاں تک ان کی شخصیت کی کج ادائی اور کھرے پن کا سوال ہے تو میں یہی عرض کروں گا کہ خلوص سے قاضی صاحب کے باطن میں جھانکئے اور جوش کا یہ شعر پڑھئے۔

کانٹوں کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

□□□

ایسے تھے اقبال مجید!

اقبال مجید بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے رخصت ہونے کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ عمر بھی ہو چکی تھی اور عرصہ سے بیمار بھی تھے لیکن سانس میں پھر بھی ایک آس تو ہوتی ہی ہے۔ جب بھی فون پر بات ہوتی کبھی مایوسی کی بات نہ ہوتی۔ اسی بے تکلفی سے بات کرتے جیسا پرانے دنوں میں کرتے تھے تو ایک امید بندھ جاتی اور امید پر ہی دنیا قائم ہے لیکن موت بھی ایک حقیقت ہے جو آیا ہے وہ جائے گا بھی، لیکن کام کرنے والے یاد کئے جاتے ہیں۔ اقبال مجید بھی ناقابل فراموش نام ہے اس لئے کہ اس کا زندہ رہنے والا کام ہے اور یہ کام اس نے ناموافق و ناہموار ماحول میں کیا۔ والد ریلوے میں ملازم تھے۔ مرادآباد جیسے صنعتی شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی معمولی طور پر ہوئی۔ گھر کا ماحول پس منظر نہ زیادہ علمی تھا اور نہ معاشی طور پر مضبوط۔ ایک مضمون میں خود انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے:

> ''مجھ جیسے کمترین انسان کے پاس نہ خاندانی امارت اور نہ شکوہ کا کوئی پس منظر ہے اور نہ دولت و ثروت سے حاصل ہونے والا نام و نمود۔ علم و فضل کا کوئی کارنامہ بھی خاندان اور اس کے بزرگوں سے وابستہ نہیں اس لئے ایسے ایسے واقعات کہاں سے لاؤں جو سوانح حیات کے بیان میں روشن چاند ستارے چمک سکیں۔ بس عام انسانوں کے بہت ہی عام واقعات ملیں گے۔''

یہ عام واقعات، یہ عمومیت، یہ معمولی پن جسے ہم حقیر سمجھتے ہیں ادب اور بالخصوص فکشن کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بس ذرا راستے کی تلاش رہتی ہے اور وہ راستہ اقبال مجید کو مرادآباد، سیتاپور میں نہیں ملا تو لکھنؤ آ کر ملا اور اسے ملنا ہی تھا۔ اس لئے کہ اندر کا فنکار فن کے راستے از خود تلاش کرتا رہتا ہے۔ لکھنؤ میں احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد

حسن جیسے بزرگ اساتذہ ملے۔ قاضی عبدالستار، رام لعل، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، قمر رئیس جیسے احباب ملے اور سب سے بڑھ کر ترقی پسند تحریک کا سایہ ملا جو بعد میں نظریہ بن گیا۔ وہ عمومیت خصوصیت میں اس وقت بدلی جب لکھنؤ کے ادبی تخلیقی ماحول نے اردو افسانہ نگار دوستوں کی افسانوی فضا نے انھیں ''عدو چچا'' جیسے معمولی کردار کو لے کر افسانہ لکھا۔ اس وقت ایسے معمولی ناموں اور کرداروں کو لے کر افسانے لکھے جا رہے تھے۔ 'کالو بھنگی'، 'کچرا بابا'، 'تائی ایسری'، 'آنندی'، 'آپا'، 'ننھی کی نانی' وغیرہ۔ انھیں کے بطن سے عدو چچا بھی برآمد ہوئے۔ یہ افسانہ لکھنؤ کی ایک ادبی محفل میں پڑھا گیا، جس پر خوب بحث ہوئی۔ بحث اس لئے کہ عدو چچا محض ایک کردار نہ تھے بلکہ تقسیم ہند کے تعصبات کا شکار تھے اور ایک مردانہ وار کردار اچانک تقسیم کے حادثے سے شیر سے گیدڑ بن گیا۔ سیاسی اور سماجی سیاق و سباق میں افسانہ پر منٹو بیدی وغیرہ کی گونج تھی۔ ظ. انصاری نے اسے شاہراہ میں ایک خاص نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ بس پھر کیا تھا اقبال مجید ایک چھوٹے کردار کے ذریعہ بڑے افسانہ نگار بن گئے۔ جسے گھیسو مادھو نے پریم چند کو، کالو بھنگی نے کرشن چندر کو، طوائفوں نے منٹو کو اور بوڑھی عورتوں (بچھو پھوپھی اور ننھی کی نانی وغیرہ) نے عصمت کو جوان کر دیا تھا۔ یہ دور ہی ترقی پسند افسانوں کا تھا۔ جہاں افسانہ اپنی سماجی حیثیت اور گہرے انسانی و ذہنی شعور کے ذریعہ آسمان پر پہنچا ہوا تھا اور منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، عباس، ق.س وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ اس طوطی کے شور میں ایک الگ طوطے کی آواز نکالنا اور متوجہ کرنا بیحد مشکل کام تھا۔ لیکن یہ مشکل کام اقبال مجید نے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ترقی پسندوں کی آواز دھیمی پڑنے لگی اور جدیدیت کا زور بڑھنے لگا۔ ایسی صورت میں اقبال مجید نے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھائے۔ پھونک پھونک کر افسانے لکھے۔ اقبال مجید بہت پڑھے لکھے انسان نہ تھے اگر وہ بہت پڑھے لکھے ہوتے مفکر و دانشور ہوتے تو وہ باقر مہدی ہو جاتے۔ اقبال مجید فنکار نہ ہو پاتے۔ کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا تخلیق پر عذاب بن کر ٹوٹتا ہے جیسے ان دنوں بعض جدید نقادوں پر ٹوٹ رہا ہے کہ فنکار اور تخلیق کار بننے کی للک انھیں وہ سب

کرنے پر مجبور کر رہی ہے جو انھیں نہیں کرنا چاہئے۔ تخلیق کی اولیت وعظمت کا جادو تنقید اور نقاد دونوں کو شرمسار بھی کرتا ہے۔ اقبال مجید نے ایک جگہ خود ہی لکھا ہے:

''یہ حقیقت ہے کہ میں نے بہت زیادہ نہیں پڑھا۔
شاید بہت زیادہ پڑھنے کا اگر ذہن متحمل نہ ہو تو آدمی باقر
مہدی کی طرح ہم چنیں دیگرے نیست ہو جایا کرتا ہے۔
جس سے شخصیت کی درست نشو ونما نہیں ہو پاتی۔''

ایک جگہ اور دلچسپ بات لکھی ہے:

''کہانیاں لکھنے کے لئے آدمی کو شبلی یا حالی ہونے
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہانی لکھنے کے لئے کتابوں سے
زیادہ انسان کا علم ہونا ضروری ہے۔''

اور اقبال مجید کے پاس انسانی علم اور ذہنی شعور بہت گہرا تھا۔ جو محض کتابی نہیں تھا۔ حقیقی تھا اس لئے کہ وہ بے حد جد و جہد کر کے معاشی حالات سے ٹکرا کر اس سمت آئے تھے۔ اسی لئے انھیں علم تھا کہ اسے پوری دردمندی اور سوز و گداز کی طرح اپنانے اور پیمانہ فن میں ڈھالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ دردمندی نہ ہوتی تو وہ فن کاری بن کر عدو چچا کے کردار میں نہ ڈھلتی اور یہی دردمندی انسان شناسی بن کر 'دو بھیگے ہوئے لوگ' میں سماجاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب یہ افسانہ شائع ہوا تو سبھی کو چونکا گیا۔ انسانوں کی دو نسل کی معمولی سوچ نے، فرق اور رویے نے افسانے کو غیر معمولی بنا دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ایم اے. سال اول کا طالب علم تھا اور خام اور عام سے افسانے بھی لکھتا تھا ایک شام ایک افسانہ سنانے احتشام حسین صاحب کے گھر پر گیا تھا تو انھوں نے کمزور افسانہ سننے کے بعد اقبال مجید کے اسی افسانہ کو پڑھنے کی تاکید کی تھی۔ میں اس افسانہ کو حاصل کرنے لکھنؤ گیا جسے عابد سہیل کے ادارہ نصرت پبلیشرز نے شائع کیا تھا۔ عابد سہیل سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور انھوں نے میرے شوق اور جذبہ کو دیکھ کر پورا مجموعہ بطور تحفہ عنایت کیا تھا جو آج بھی میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ پہلی قرأت میں یہ افسانہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس

وقت افسانہ کا نہ سمجھ میں آنا ہی فن کی معراج سمجھی جاتی تھی اقبال مجید یوں تو جدیدیت کے شکار نہ تھے اور ترقی پسند تحریک کے سایے میں پروان چڑھے تھے وہ اعتراف کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میری ادبی تربیت ترقی پسند
تحریک کے زیر سایہ ہوئی لیکن میں وہ ڈرپوک ترقی پسند
نہ تھا جس کا افسانہ شب خون میں چھپنے سے ترقی پسندوں
کا دھرم بھرشٹ ہو جایا کرتا ہے۔''

حالانکہ وہ شب خونی مزاج کے افسانوں کے بارے میں بھی ایک رائے رکھتے تھے:

''اپنے سینیئر افسانہ نگاروں کے ساتھ اس نے بھی
آدرشوں اور نظریوں کو اوندھے منھ گرتے دیکھا۔ پھر ان
کے زوال سے جو جگہ خالی ہوئی اس سے پیدا ہونے
والے خالی پن اور انتشار کی تاریخ کے نئے Pattern
نے ایک ظلم یہ کیا کہ افسانے سے اس کی وہ تمام خوبیاں
چھین لیں جس کے بھروسے وہ اپنے پڑھنے والوں
میں مقبول تھا۔''

بڑے مفکر اور دانشور نہ ہونے کے باوجود کیا عمدہ بات کہی ہے:

''افسانہ انسانوں کی ایسی سرگزشت ہے جس کے
سہارے افسانہ نگار زندگی پر تنقید تو کرتا ہی ہے مگر اس
کے ساتھ اپنے نظریہ کی تعبیر بھی کرتا ہے۔''

اپنے انھیں خیالات کی بنیاد پر وہ ساری زندگی انسانوں کی بدلتی، بگڑتی، بل کھاتی، لڑکھڑاتی ترقی کے نام پر نوچ کھسوٹ کرتی ہوئی زندگی کی داستان لکھتے رہے۔ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' کے بعد انھوں نے ایمرجنسی کے اذیت ناک دور میں 'مدافعت'، 'پوشاک' جیسے غیر معمولی علامتی افسانے لکھے۔ 'جنگل کٹ رہے ہیں'، 'ایک حلفیہ بیان'، 'پیٹ کا کیچوا' جیسے افسانوں کا نظرانداز کرنا بھی مشکل ہے۔ بعد کے دور میں جب انھوں نے 'تماشا گھر'

اور 'آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت' جیسے مجموعے شائع کیے تو میری ان سے بے شمار باتیں ہوئیں۔ جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اقبال مجید نے اپنے ان افسانوں کے ذریعہ ہر طبقۂ فکر میں اپنی مستند و معتبر شناخت قائم کی۔ وہ رام لعل یا جوگیندر پال کی طرح جلدی جلدی اور چھوٹے چھوٹے بے شمار افسانے لکھنے کا قائل نہ تھے۔ بلکہ بیحد سوچ سمجھ کر ٹھونک بجا کر زبان و بیان کو ایک مخصوص تخلیقی لب ولہجہ دے کر کچھ اس طرح لکھ جاتے تھے کہ افسانہ شروع کرتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ ان کے زبان و بیان لب ولہجہ میں بلا کی کشش اور تخلیقی رچاؤ ہوا کرتا تھا کہ قاری محض اس لطف کے لئے بھی پڑھ جاتا تھا۔ لیکن اس زبان، لہجہ اور محاورے کے درمیان جو ایک دبی دبی سی تہذیبی فضا سر اٹھاتی رہتی تھی وہ افسانے کو بہت دور تک لے جاتی تھی۔ مجھ سے کہتے بھی تھے۔ فکر کو، مسئلہ کو، تہذیب و ثقافت کو بین السطور سے جھانکنا چاہئے۔ اگر وہ بالائی کی طرح اوپر اوپر تیرنے لگے تو افسانہ پھیکا اور بے مزہ ہو جائے گا۔

ایک بار ان کا ایک طویل افسانہ شب خون میں شائع ہوا۔ انھوں نے مجھ سے پڑھنے کی تاکید کی۔ میں شب خون عموماً نہیں پڑھتا تھا لیکن اقبال صاحب کے کہنے پر ان کا افسانہ پڑھا۔ اچھا لگا۔ گفتگو پر میں نے کہا کہ یہ تو ناول کا موضوع ہے۔ اسے ناول نہ سہی تو ناولٹ ہی بنائیے۔ وہ راضی تو ہوئے پر مسئلہ یہ تھا کہ اسے شائع کون کرے۔ عابد سہیل کا ادارہ نقصان اٹھا رہا تھا اور وہ اسے بند کرنے جا رہے تھے۔ قمر رئیس صاحب تاشقند میں تھے ورنہ وہ اسے دہلی کے کسی پبلیشر سے شائع کروا دیتے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اردو کے موجودہ معاشرہ میں اقبال مجید جیسے بڑے فنکار کا ناول کون چھاپے اور کیسے چھپے۔ مجھے غیرت آئی اور میں نے اسے شائع کرنے کا فیصلہ لیا۔ میرے اس فیصلہ سے وہ خوش ہوئے اور میں نے ان کے ایک نہیں دو ناولٹ یکے بعد دیگرے شائع کیے۔ 'نمک' اور 'کسی دن' جب طویل افسانہ ناولٹ بنا تو انھوں نے میری رائے جاننا چاہی۔ میں نے تکلف ضرور کیا لیکن ان کے اصرار پر عرض کیا اس کو پھیلانے میں مزدوروں والی محنت دکھائی دے رہی ہے۔ جبکہ عمدہ تخلیق میں محنت کے بجائے محبت اور تخلیقی عظمت ظاہر ہونی چاہئے۔ اس کو

آپ نے کھینچ تان کر ربر کی طرح پھیلایا ہے اسی لئے وہ تحقیقی شان نہیں دکھائی دے رہی ہے جو آپ کا خاصا ہے۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا لیکن ڈر بھی گیا کہ اپنے سے اتنے بڑے فنکار کو ایک چھوٹا قاری کیا سے کیا کہہ گیا۔ لیکن اقبال مجید کا اقبال واقعی بلند تھا۔ انھوں نے میری طالب علمانہ باتوں کا قطعی برا نہیں مانا اور یہی کہا۔ ''شاید تم سچ کہہ رہے ہو میں اس پر غور کروں گا۔'' یہ تھے اقبال مجید۔ ایک واقعہ اور یاد آرہا ہے عبدالصمد، حسین الحق، ذوقی وغیرہ کے افسانوں اور ناولوں میں زیادہ تر مسلمانوں کے حالات پڑھ پڑھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اردو افسانہ محض ایک قوم کی زبوں حالی کے اظہار سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ ہر چند کہ تمام باتیں سچ ہیں اور تلخ ہیں تاہم افسانہ ہندو مسلمان نہیں ہوتا بلکہ ایک عام انسان ہوتا ہے تو پھر اردو افسانہ میں عام انسان کیوں نظر نہیں آتا۔ دکن، آسام کیوں نظر نہیں آتا۔ حد یہ کہ پنجاب بھی نہیں۔ ٹھیک انھیں دنوں اقبال مجید کا بھی ایک افسانہ آمد میں شائع ہوا۔ وہ بھی مسلمانوں کی زبوں حالی سے متعلق تھا۔ انھوں نے پڑھنے کی تاکید کی تو میں نے پڑھ کر ان سے یہ شکایت کی۔ خیال رہے کہ میں اپنے ہم عصروں سے شکایت کرنے کی ہمت نہ جٹا سکا تھا لیکن اپنے سے سینئر اور بڑے افسانہ نگار سے جب یہ شکایت کی تو انھوں نے بڑی محبت سے سنا اور اعتراف کیا کہ شاید تم سچ کہہ رہے ہو لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ افسانہ نگار جس ماحول میں رہتا ہے اس کی ستم ظریفی اسے پہلے متوجہ کرتی ہے لیکن اس ستم ظریفی کا تعلق حال سے زیادہ ہونا چاہئے ماضی سے کم مقامیت سے اٹھ کر عالمیت کی طرف جانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ ''یہ تھے اقبال مجید'' جو اپنے خوردوں کی باتوں کو بڑی محبت سے سنا کرتے تھے۔ جیسے اقبال مجید، عابد سہیل وغیرہ کی باتیں احتشام حسین، آل احمد سرور، سجاد ظہیر، سردار جعفری وغیرہ سنا کرتے تھے۔ یہ ایک سلسلہ ہے محبت وشفقت کا جو پوری تحریک پر چھایا ہوا تھا۔ آج کے جدید بزرگوں یا دوستوں کے بارے میں کچھ لکھئے یا اعتراض کیجئے تو آستین چڑھا کر لڑنے مرنے اور نقاد کو جاہل کہنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ غالباً اسی لئے آج کے نقادوں نے آج کی تخلیقات پر لکھنا چھوڑ دیا ہے یا کم کر دیا ہے۔ راقم بھی اسی عتاب کا شکار ہوتا رہتا ہے جس کے سلسلے بک سے فیس بک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس

کے باوجود میں آج تک فکشن کے بارے میں ایمانداری سے لکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ یہ جذبہ، یہ عادت میں اقبال مجید، عابد سہیل اور قمر رئیس سے سیکھی ہے۔ ان سب سے مجھے بے پناہ محبتیں ملی ہیں۔ درس لیا ہے۔ بھوپال ہو یا لکھنؤ۔ دہلی۔ الہ آباد تمام مقامات پر اقبال مجید نے دیا زیادہ لیا کم۔ اردو افسانے کو چند انمول امر افسانے دیے، ڈرامے دیے، ناول دیے، ایک نیا اسلوب دیا۔ فکشن کو ایک نیا موڑ دیا لیکن ہم انھیں کیا دے پائے۔ کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے کے انعامات و اعزازات کبھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اقبال مجید کبھی اس کے پیچھے بھاگے بھی نہیں۔ ان میں ایک پرکشش صوفیانہ مادہ تھا جو ان کی شخصیت میں چار چاند لگاتا تھا۔ جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھا تو اس وقت یو. پی. اردو اکادمی کا ممبر بھی تھا۔ اکادمی کی گرانٹ بڑھ چکی تھی اور سب سے بڑے ابوالکلام آزاد ایوارڈ کی رقم پانچ لاکھ کی ہو چکی تھی۔ اس سال ہم نے بڑا ایوارڈ اقبال مجید کو دینے دلانے کے بارے میں سوچا۔ یو. پی. کی دوسری یونیورسٹیوں کے صدر شعبہ اقبال مجید کے نام پر متفق ہو گئے لیکن وائس چیئرمین جو مشاعرے کے ایک مقبول شاعر ہیں وہ اقبال مجید کے کام اور نام سے واقف نہ تھے۔ ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ وہ بشیر بدر کو دلوانا چاہتے تھے، جس سے ہم نے اختلاف کیا اس لئے کہ وہ بی. جے. پی. کے ہم نوا ہو چکے تھے۔ بارے کسی طرح اتفاق ہوا اور یہ ایوارڈ اقبال مجید کو ملا جو ان کا حق تھا۔ ہم نے جب یہ خوش خبری اقبال مجید کو دی تو وہ معمولی سا شکریہ ادا کر کے رہ گئے۔ ہمیں حیرانی ہوئی لیکن ہم جلد ہی سمجھ گئے کہ اقبال مجید کی صوفیانہ و فقیرانہ طبیعت ان سب جھمیلوں بلکہ لالچوں میں کم پڑتی تھی۔ وہ دنیاداری سے دور رہتے تھے۔ اب جبکہ معمولی سے لے کر غیر معمولی لوگ انعام و اکرام کے لئے طرح طرح کے منصوبے بلکہ سازشیں کرتے رہتے ہیں اقبال مجید ایسی تمام سفلی، بازاری حرکتوں سے ہمیشہ دور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مرتے دم تک ساہتیہ اکادمی کا انعام نہیں ملا۔ جب ایک بار میں نے اس محرومی پر ان کے سامنے ہی غم و غصہ کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے اور بولے جب یہ ایوارڈ کرشن چندر جیسے بڑے فنکار کو نہیں ملا۔ جوگیندر پال کو نہیں ملا، سردار جعفری وغیرہ کو نہیں ملا تو ان کے آگے ہم کیا چیز ہیں۔ اقبال مجید کرشن

چندر سے بیحد متاثر تھے۔ خاص طور سے نوجوانی کے دنوں میں خوب پڑھتے تھے۔ لیکن ان کے مطالعہ میں ایک جذبہ ضرور کام کرتا تھا کہ کیسے ان سے الگ ہوا جائے۔ تخلیق پر تقلید کا الزام نہ لگنے پائے۔ اور اس میں اقبال مجید کامیاب بھی ہوئے۔ میرے اصرار پر انھوں نے کرشن چندر پر ایک جذباتی اور تاثراتی نوعیت کا مضمون بھی لکھا جو ان کی کتاب 'بشر دوستی اور نئی ترقی پسندی' میں شامل ہے۔ جس میں وہ ایک طرف یہ تاسف ظاہر کرتے ہیں کہ کرشن چندر کے ساتھ تنقید نے انصاف نہیں کیا دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں ''اگر کرشن چندر کا سارا لکھا نوجوان فکشن نگار کے سامنے رکھ دیا جائے اور وہ بھی بغیر کسی تنقیدی عمل کے تو یہ عمل کرشن چندر کو بھی نقصان پہنچائے گا اور آج کے نوجوان قاری کو بھی۔ اس کتاب میں نئے افسانے پر کئی مضامین ہیں جنھیں پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوثر چاند پوری یا رام لعل کی طرح محض قصہ نویس نہ تھے بلکہ غور وفکر کے بعد پوری سنجیدگی و بالیدگی کے ساتھ افسانہ لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں قصے کم ہیں مسئلے زیادہ ہیں۔ مسائل کو وہ پوری باریکی اور ذہانت کے ساتھ عہد و تہذیب کے سیاق وسباق پیش کرتے ہیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثال ان کا مشہور افسانہ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ہے۔ ان کے افسانے سوچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایک بار بھوپال میں ہی میں نے ان کے ساتھ چند گھنٹے گزارے دن کا نفیس کھانا کھایا اور ان کے ساتھ شام تک رہا۔ انھوں نے اپنی شام کی ہوا خوری کا پروگرام ملتوی کر کے مجھ سے گفتگو کی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ اس دن افسانے کے فکر وفن اور عوامل ومحرکات پر خوب خوب باتیں کیں۔ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' کا بھی ذکر آیا۔ یہ افسانہ لکھنؤ میں لکھا گیا تھا۔ حضرت گنج کا کافی ہاؤس دانشوروں اور فنکاروں کا اڈہ ہوا کرتا تھا۔ کافی ہاؤس سے نکلتے ہی بارش شروع ہوگئی۔ اقبال مجید ایک چھجے کے نیچے کھڑے ہو گئے اور بتایا کہ کھڑے کھڑے اس افسانے کو خلق کرنے کا خیال آ گیا۔ گھر پہنچتے ہی ایک نشست میں افسانہ کاغذ پر یوں اتر آیا جیسے الہامی شعر ڈھل جایا کرتے ہیں۔ کوئی واقعہ نہیں، کوئی حادثہ نہیں اور کوئی تجربہ بھی نہیں۔ بس ہلکا سا مشاہدہ اور خیال کا تخلیقی رویہ۔ اقبال مجید نے اس شام اور کئی شام وسحر بار بار اعتراف

کیا کہ لکھنؤ کی ادبی فضا نے اور احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد حسن وغیرہ کی سرپرستی اور رہنمائی نے انھیں راستے دکھائے اور ہم لوگ یعنی رام لعل، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، رتن سنگھ، احمد جمال پاشا وغیرہ ایک طرح سے مقابلے تھے بلکہ کون زیادہ فکر انگیز اور علامت خیز افسانہ لکھتا ہے۔ ہم عصروں کے درمیان صحت مند مقابلہ اور بزرگوں کے ذریعہ دانشمند رویوں نے ہمیں راستے دکھائے اور ہم چل پڑے۔ 'عدو چچا' ہمارا پہلا افسانہ ہے جو مشہور ہوا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر ہم نے 'کالو بھنگی'، 'کچرا بابا'، 'تائی ایسری'، 'ننھی کی نانی' جیسے افسانے نہ پڑھے ہوتے تو ہم 'عدو چاچا' نہیں لکھ سکتے تھے۔ بزرگوں سے جتنا سیکھنا ضروری ہوتا ہے اتنا ہی ضروری ہوتا ہے ان سے الگ راستہ بنانا۔ ہم میں اور عابد سہیل میں یہ لگ رہتی تھی۔ عابد سہیل فلسفہ مضمون پڑھ کر آئے تھے، فلسفیانہ گفتگو زیادہ کرتے تھے جو میرے کم سمجھ میں آتی تھی۔ رتن سنگھ تو گرونانک کی طرح تھے بس صوفیانہ گفتگو کرتے تھے۔ قاضی عبدالستار کو زمینداری کا نشہ تھا اور پھر ریڈ کی بیماری ہوگئی تھی۔ سب سے کمزور میں ہی تھا۔ کوئی پس منظر نہیں۔ کوئی علم بھی نہیں۔ اس لئے میں نے کچھ چیزوں کو چیلنج کی طرح لیا۔ ان دنوں اچھی بات یہ تھی کہ ہم سب پڑھتے بھی خوب تھے اس کے بعد گفتگو بھی خوب کرتے تھے۔ اب یہ سلسلے بند سے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے آج بھی لکھے جارہے ہیں اور اچھے لکھے جارہے ہیں لیکن ان پر گفتگو نہیں ہوتی۔ آپ اختلاف ہی کیجئے لیکن منطقی انداز سے۔ مشوروں اور بحثوں سے صرف فکر کی ہی نہیں تخیل کی راہیں بھی نمو پاتی ہیں۔ اقبال مجید ابتداً ٹیچر تھے سیکھنے سکھانے کے دن تھے۔ لیکن بعد میں وہ آل انڈیا ریڈیو میں آگئے اور اعلیٰ افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ زندگی میں مسرت وغم سے پُر کئی حادثے ہوئے۔ پسندیدہ بیوی ملی۔ لائق اولادیں تو ایک بیٹے کی اچانک موت نے بھی انھیں زندگی کا درس دیا۔ بھوپال جیسے شہر میں اقامت پذیر رہے۔ جو سفر لکھنؤ سے شروع ہوا وہ بھوپال میں ختم ہوا۔ دونوں نوابوں کا شہر۔ اقبال مجید بھی دیکھتے دیکھتے اردو افسانے کے نواب ہوگئے۔ ممبئی میں ان کا جشن منایا گیا۔ ہمیں بھی بلایا گیا۔ کیا عزت تھی۔ کیا اپنائیت تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ہر طبقۂ فکر کے درمیان مان سمان تھا۔ وہ ایک ہیرو کی طرح لگ رہے تھے اور ہم سب

ان کے مداح اور فین۔ ان کی شخصیت لمبی چوڑی اور گوری چٹی تو تھی ہی ان کا ذہن بھی صاف اور شفاف تھا۔ جس میں ایک پر کشش معصومیت اور دلنواز شرافت تھی۔ اپنے چھوٹوں سے بیحد محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ میری بیٹی کی شادی ہوئی میں نے ان کو مدعو کیا۔ خرابی صحت کی وجہ سے وہ شرکت تو نہ کر سکے لیکن بیٹی کے لئے ایک خطیر رقم کا چیک روانہ کیا۔ میں نے جب سوال کیا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی تو بولے "یہ تمہارے لئے نہیں بیٹی کے لئے ہے۔" یہ وہ بیٹی ہے کہ جب وہ غالب سیمینار میں شرکت کرنے الہ آباد آئے تھے تو غالباً ۱۹۹۷ء کی بات ہے جب پوری دنیا میں غالب صدی منائی جارہی تھی ہم نے بھی الہ آباد میں بڑے سیمینار کا اہتمام کیا جس میں قمر رئیس، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی وغیرہ کے ساتھ اقبال مجید بھی الہ آباد آئے۔ کیا مقالہ پڑھا۔ روایتی تنقید سے بالکل الگ۔ تحقیقی انداز کا مقالہ جو سب پر بھاری پڑ گیا۔ اس وقت میری چھوٹی بیٹی کی عمر کم تھی اور سالگرہ پڑ گئی تھی اقبال مجید اس کو تحفہ دینے کے لئے پریشان تھے اور پھر خفیہ طور پر سول لائنز جا کر ایک تحفہ خریدا اور بیٹی کو دیا۔ یہ محبت اور وضعداری اب دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان کی سرشت میں محبت تھی۔ سادگی تھی۔ خلوص و محبت سے پُر ان کی شخصیت میں بچا بابا والا رچاؤ تھا۔ صاف ایسا لگتا تھا کہ کوئی خاندان کا اپنا فرد ہے۔ دوست اور بھائی۔ ان کے خطوط بھی اتنے ہی پیارے ہوتے۔ ان کی ہر کتاب پر "پیارے فاطمی" لکھا ہوتا۔ اب یاد نہیں کہ ان سے کہاں کہاں اور کتنی ملاقاتیں ہوئیں۔ کیا کیا باتیں ہوئیں بس یہ یاد ہے کہ ہزار بار ہم ملیں ہوں گے۔ جنم جنمانتر کا ساتھ ہے اور ساتھ رہے گا۔ بھوپال سے نصرت مہدی کا فون آئے گا کہ فلاں تقریب ہے فاطمی صاحب آپ کو آنا ہے اقبال مجید بھی آرہے ہیں اور اقبال مجید آتے بھی تھے۔ حد یہ کہ گزشتہ دنوں اقبال کی تقریب کے سلسلہ میں بھی وہ جلسہ میں آئے اور صدارت کی۔ میں حیران ہوا کہ ایک جدید افسانہ نگار کی جلسۂ اقبال میں صدارت۔ چہ معنی دارد۔ ہم سبھی نے ناقد ہونے کے زعم میں قابلیت بگھاری۔ لیکن اقبال مجید نے کچھ نہیں بگھارا۔ پوری سادگی اور دیانت داری سے اقبال کی ضرورت عہد جدید میں نے عنوان پر سادگی سے گفتگو کر گئے۔ اور یہ بھی کہ کس طرح کوئی عظیم شاعر تمام سرحدوں کو توڑ کر ہر عہد

کے لئے ضرورت بن جاتا ہے۔ بہت اچھی گفتگو کی اقبال مجید نے کہ ہم حیران رہ گئے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ گھر آنے کی دعوت دی لیکن مجھے شام کی فلائٹ سے لکھنؤ آنا تھا اس لئے گھر نہ جا سکا البتہ الہ آباد پہنچنے پر میں نے خیریت کی اطلاع دی اور مبارکباد دی کہ آپ نے اقبال پر غیر رسمی اور غیر تنقیدی گفتگو کی۔ وہ خاکساری کا اظہار کرتے رہے لیکن اس اظہار میں بھی کوئی تصنع نہ تھا بلکہ سچائی اور معصومیت تھی۔

نصرت صاحبہ کا پھر فون آیا ہے کہ ۲۶ رفروری ۱۹ء کو کیفی اعظمی پر سیمینار ہے فاطمی صاحب آپ کو آنا ہے۔ میں نے حامی تو بھر لی لیکن خیال ستا تا رہا ہے کہ اقبال مجید کے بغیر بھوپال کیسا لگے گا۔ لیکن پھر یہ بھی خیال آیا کہ قمر رئیس کے بغیر دہلی اور عابد سہیل کے بغیر لکھنؤ اور قاضی عبدالستار کے بغیر علی گڑھ جیسا لگا ویسا ہی بھوپال بھی لگے گا۔ یہ دنیا ہے جو چلتی رہتی ہے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دنیا کا بازار گرم رہتا ہے لیکن اس بازار میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو کام کر جاتے ہیں۔ اچھے کام۔ یادگار کام۔ اقبال مجید نے بھی کام کئے ہیں اور اردو فکشن کو تازہ کار کیا ہے۔ ان کے ناول اور چند افسانے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ہم تو اس پر بھی فخر کریں گے کہ ہم نے اقبال مجید کی قربت اور محبت پائی ہے اور ان کی دلنواز مہربان شخصیت کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے بلکہ بہت کچھ سیکھا ہے۔ تھوڑی بہت ان کی خدمت کی ہے جس کو وہ بار بار دہراتے تھے، احسان شناسی کا اظہار کرتے تھے اور ہم ان کے بڑکپن کو یاد کر شرمندہ ہو جاتے تھے۔ اپنے چھوٹوں سے پیار، بزرگوں کا احترام، ہم عصروں سے تکرار، پھر سب سے پیار ہی پیار۔ ایسے تھے اقبال مجید۔!

□□□

تم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ
(عابد سہل کی یاد میں)

چار دہائیوں کا لمبا ساتھ اور ایک مختصر سی پندرہ بیس منٹ کی مدت میں اس کا اظہار دریا کو کوزے میں کس طرح بند کیا جائے۔ یہ صرف محاورتی اشارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جس شخص فنکار افسانہ نگار، ادیب ، دانشور کے بارے میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں وہ ایک دریا ہی تھا جس میں کئی طرح ندیاں خاموشی کے ساتھ آ کر سما جاتی تھیں۔ یہ ندیاں مختلف سمتوں سے آئیں ان کی رنگت، بہاؤ اور گہرائی بھی مختلف ہوتی لیکن دریا تو دریا ہے خشک و تر کو جذب کرتا ہے اور لعل و گہر لٹاتا ہے اور خاموش رہتا ہے، اس کی خاموشی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ جو ندی چھچھلی ہوتی ہے وہی زیادہ شور کرتی ہے عابد سہیل ایک دریا ہی تھے جن میں مختلف علوم وفنون کی ندیاں مدغم تھیں لیکن ان سب پر غالب تھی جد وجہد اور سنگھرش کی ندی 'غم کا دریا' جس کو انھوں نے سب سے چھوٹا غم کہا لیکن وہ پیدا ہوا تھا بڑے غم کی کوکھ سے۔ یہ باتیں ان کی خودنوشت میں آ چکی ہیں۔ 'جو یاد رہا' ایک بہترین خودنوشت اور سنگھرش کی داستان جس پر میں تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں اس لیے یہاں کچھ اور زاویہ سے عرض کردوں گا۔

طویل عرصہ گذر جانے کی وجہ سے اب یاد تو نہیں کہ عابد سہیل سے پہلی ملاقات کب اور کس مقام پر ہوئی البتہ یہ ضرور ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے (۱۹۷۴) کرنے کے بعد جب میں نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر ڈی فل. کا مقالہ لکھنے کا کام شروع کیا تو لکھنؤ آنا جانا زیادہ ہونے لگا۔ اوّل وجہ تو شرر کا لکھنوی ہونا تھا۔ دوسری وجہ سے اس وقت تک مسعود حسن رضوی ادیب کا باحیات ہونا۔ مسعود صاحب کے ایک بیٹے انور مسعود کو میرے ایک رشتہ کی خالہ جن کا تعلق صفی پور (اناؤ) سے تھا منسوب تھیں اس وقت نیر مسعود کے افسانوں کا زور تھا جس میں ان کی مینا تو کم بولتی تھی ان کے طوطے زیادہ چہکتے

تھے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نیز مسعود کے بہنوئی تھے۔ مسعود صاحب کے داماد اور میرے استاد چھوٹے بیٹے اظہر مسعود سے دوستی تھی۔ بہر حال اس پورے گھرانے سے گھر جیسے تعلقات تھے۔ سب کہ سب نخاس میں ادبستان میں رہتے تھے۔ اسی نخاس میں پروفیسر شبیہ الحسن بھی تھے جو اس وقت صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی تھے۔ اسی کے آس پاس کیور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ میں ملک زادہ منظور احمد اور عابد سہیل رہتے تھے۔ میں انجمن ترقی پسند تنظیم میں داخل ہو چکا تھا اور عابد سہیل ایک ترقی پسند ادیب، افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ شہرت تھی رسالہ 'کتاب' کے مدیر کے طور پر جس نے ایک ادبی رسالہ کے طور پر بے پناہ شہرت حاصل کر رکھی تھی لیکن افسوس میں ان کے قریب اس وقت آیا جب وہ کتاب کی اشاعت بند کر چکے تھے اور اس کا الوداعی شمارہ نکال چکے تھے یا نکال رہے تھے۔ کتاب کی ادبی صحافت وخدمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس کے چند شمارے جو انھوں نے بطور تحفہ عنایت کیے تھے، غور سے دیکھا تو ایڈیٹر کے طور پر کسی اور کا نام درج تھا۔ ایک مجلس مشاورت تھی جس میں احتشام حسین، حیات اللہ انصاری اور عابد سہیل تھے۔ پہلا ورق کے عنوان سے اداریہ عابد سہیل ہی لکھتے لیکن کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھتے۔ پورے رسالہ میں عابد سہیل کا نام برائے نام ہوتا جبکہ پورا رسالہ انھیں کا ترتیب دیا ہوتا۔ آج جب میں دیکھتا ہوں کہ اردو کے بعض رسائل مدیر کو زیادہ فوکس کرتے ہیں دوسروں کو کم۔ بعض رسائل تو اپنی ذات کو پروجیکٹ کرنے کے لیے ہی نکالے جاتے ہیں نکالے جا رہے ہیں تو ایسے میں عابد سہیل کی صحافت ایمانداری، وضعداری کے معنی سمجھ میں آتے ہیں، عابد سہیل صرف ایک رسالہ کے مدیر نہ تھے بلکہ انگریزی کے مستند صحافی بھی تھے اور صحافت کے اعلیٰ اقدار سے بخوبی واقف تھے اور واقفیت کے علاوہ ان کی شخصیت میں ایک معصوم سی کسر نفسی، سادگی اور قناعت پسندی تھی جو میں نے ان کی ذاتی زندگی میں بھی خوب خوب دیکھی اس لیے کہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا۔

رسالہ 'کتاب' کے حوالے سے ایک اور بات جو بیحد اہم ہے اور جس کو میں پوری

ایمانداری اور ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ 'کتاب' نے نئے لکھنے والوں کی بیحد ہمت افزائی کی۔ میرے بعض سینئر احباب فکشن نگار 'شوکت حیات'، 'حسین الحق'، 'عبدالصمد' وغیرہ کہتے ہیں کہ انھیں یا تو رسالہ 'آہنگ' نے متعارف کرایا یا 'کتاب' نے یہ الفاظ دیگر کلام حیدری اور عابد سہیل نے اور یہ بات صدفی صد درست ہے اس لیے کہ ان دونوں نے مجھے بھی متعارف کرانے اور ادبی دنیا میں پیش کرنے میں بیحد تعاون کیا۔ میرے ابتدائی مضامین 'آہنگ' میں شائع ہوئے۔ کتاب تو جیسا کہ عرض کیا کہ بند ہو چکا تھا لیکن نصرت پبلیشرز موجود تھا اور خوب کام کر رہا تھا۔ میری پہلی کتاب 'بیس نئی کہانیاں' نصرت پبلیشرز یعنی عابد سہیل نے شائع کی۔ بات 78-1977 کے آس پاس کی ہے۔ ہمارے فکشن سے متعلق مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ پھر بھی بزرگوں سے ہماری یہ شکایت تھی کہ وہ لوگ قرۃ العین حیدر قاضی عبدالستار، رام لعل وغیرہ سے نیچے نہیں اترتے۔ نئے افسانہ نگاروں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ انھیں دنوں علی گڑھ میں نئے افسانے پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں محمد حسن، قمر رئیس، سید محمد عقیل جیسے بزرگ نقادوں سے علاوہ افسانہ نگاروں میں اقبال مجید، عابد سہیل جوگیندر پال، قاضی عبدالستار وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہم نئے لوگ (سید محمد اشرف، طارق چھتاری، ابن کنول، شارق ادیب وغیرہ) بھی شامل ہوئے۔ ہم نے وہاں خوب ہنگامہ کیا کہ 1970ء کے بعد کے افسانوں پر گفتگو ہونی چاہئے۔ نئے افسانوی مزاج و معیار کو سمجھنا چاہئے۔ جب کافی ہنگامہ ہوا تو چائے کے وقفہ میں محمد حسن نے مجھے اپنے پاس بلایا جہاں عابد سہیل بھی بیٹھے ہوئے تھے حسن صاحب نے کہا:

"تم لوگ اتنا شور کیوں مچاتے ہو اگر نئے افسانے میں دم خم ہے تو اس پر کام کرو۔"

"کام! کس طرح کا کام.........؟"

"تم یہ کرو کہ بیس نئی کہانیوں کا انتخاب کرو اور اس پر ایک عمدہ سا مقدمہ لکھو اس کی اہمیت و انفرادیت پر بحث کرو....."

"میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ انتخاب

شائع کون کرے گا؟''

''میں شائع کروں گا''

عابد سہیل نے پورے اعتماد سے کہا

''آپ شائع کریں گے؟''

میں نے خوشی سے سوال کیا

''ضرور شائع کروں گا اگر آپ اس میں میرا کوئی افسانہ

شامل نہ کریں تو ــــــ''

یہ عجیب سی شرط تھی جو اس وقت تو میں نے مان لی لیکن جب میں اس کام میں مصروف ہوا اور پچاسوں افسانے پڑھے تو اندازہ ہوا کہ صرف اور صرف نئے افسانوں کا انتخاب ایک مشکل کام ہے پھر یہ بھی کہ کوئی بھی نیا افسانہ خلاء میں جنم نہیں لیتا وہ پرانے سے ہی نیا بنتا ہے، صرف حال میں نہیں ہوتا ماضی سے اس کا ایک رشتہ بہر حال ہوتا ہے اس لیے میں نے انتخاب میں چند بزرگوں کے عمدہ افسانے شامل کرنے پر مجبور ہوا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس وقت تک ملک میں ایمرجنسی لگ چکی تھی اور اس موضوع پر اقبال مجید اپنا شاہکار افسانہ 'مدافعت' اور رتن سنگھ 'پناہ گاہ' لکھ چکے تھے جو ان دنوں بیحد مشہور ہوئے تھے۔ علی گڑھ کے اسی سیمینار کی محفل افسانہ میں عابد سہیل نے ایک بیحد پُر اثر، جذباتی افسانہ 'سوا نیزے پر سورج' سنایا تھا جو لکھنؤ کے شیعہ سنی فساد پر تھا جس کو سن کر ہم سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ بچوں کے کرداروں کے ذریعہ سادہ سے اسلوب میں لکھا گیا یہ افسانہ جادو کا سا اثر کر گیا تھا۔ عابد سہیل نے جس دردمندی اور فنکاری کے ساتھ اسے لکھا تھا اتنے ہی سوز و گداز اور غم زدگی و خستگی کے ساتھ پیش بھی کیا تھا۔ یوں بھی عابد سہیل کی دبی دبی سی آواز۔ گفتگو کا عاجزانہ انداز، درویشانہ لب و لہجہ ــــ ان کی اپنی ایک شناخت رکھتا تھا جو کبھی کبھی ان کے افسانوں میں بھی جذب و پیوست ہو جاتا تھا۔ شاید اسی لیے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ سب سے 'چھوٹا غم' منظر عام پر آیا (1976) تو محمد حسن نے ان کے فکر و فن کے بارے میں اچھی بات کہی تھی:

''ان میں زندگی کا دھیماپن ہے۔ نرمی اور شائستگی ہے۔
زندگی اپنی ساری پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر چھوٹی سی گرہ میں
تبدیل ہو جاتی ہے۔ بڑی معصوم سی گرہ۔ نرم و نازک ریشم
کی سی گرہ جو کھلتی مشکل سے ہے مگر اپنی نرمی نہیں کھولتی۔''

کیا عمدہ اور صحیح تجزیہ ہے۔ میں نے بھی ان کے افسانے پڑھے ہیں لیکن مجھے ان کے خاکے، مضامین اور سوانح عمری زیادہ پسند آئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ جب فنکار سامنے ہے تو فن کا عکس کیوں پڑھا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب شخصیت جذباتی ہو کر سامنے آئی ہے تو عمدہ افسانے ہو گئے ہیں۔ سب سے چھوٹا غم میں شامل افسانے 'نوحہ گر'، 'بفاتن'، 'چھوٹے لوگ' جیسے عمدہ افسانے جو کرداروں کی بنیاد پر لکھے گئے تھے اور جن میں شعوری یا لاشعوری طور پر کالو بھنگی، منگو کوچوان، تائی ایسری، ننھی کی نانی جیسے افسانوں کے اثرات پوشیدہ تھے لیکن ان میں عابد سہیل کی اپنی زندگی کا غم۔ جدوجہد، سنگھرش کی داستان بھی چھپی ہوئی تھی۔ جہاں جہاں وہ فکشن کو فلسفہ بنانے میں لگے زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ایسا شاید اس لیے رہا ہوگا کہ انھوں نے فلسفہ سے ایم۔اے۔ کیا تھا۔ انگریزی کے صحافی تھے اور ڈی۔ایچ۔ لارنس کے اس خیال پر نظر تھی کہ فکشن جب تک فسفہ نہ بن جائے عمدہ اور بڑا فکشن نہیں کہلایا جا سکتا لیکن یہ بھی تو ہے کہ فلسفہ جب تک فکشن میں فنکارانہ طور پر تحلیل نہ ہو جائے وہ فکشن نہیں بنتا۔ رومان، وجدان کا جز نہ بن پائے تو بات نہیں بنتی۔ ایسا اس لیے بھی تھا کہ میری نظر میں وہ جتنے بڑے افسانہ نگار تھے اس سے زیادہ بڑے مفکر، دانشور تھے۔ ادیب و ناقد بھی اور جب جب فنکار پر ناقد سوار ہوا ہے کم و بیش یہی صورت ہوتی ہے۔

میں نے بیس نئی کہانیاں میں عابد سہیل کی شرط نہیں مانی اور ان کا افسانہ 'سوا نیزے کا سورج' شاملِ اشاعت کر لیا۔ حالانکہ ان کا مجموعہ سب سے چھوٹا غم منظر عام پر آچکا تھا اور اس نام سے ان کا افسانہ بھی مشہور ہو چکا تھا جسے بعد میں قمر رئیس نے دہلی اردو اکادمی کے ایک انتخاب میں بھی شامل کیا۔ اس وقت میں بھی شامل کر سکتا تھا لیکن

میں نے اس پر اثر اور غیر مطبوعہ کہانی کو ہی شامل کیا اور اپنے مقدمہ میں لکھا:

''یہ انتخاب نصرت پبلشرز کے اہتمام سے شائع ہوا ہے اور سب جانتے ہیں کہ نصرت پبلشرز کے سرپرست و مالک عابد سہیل صاحب ہیں۔ انکسار و عاجزی کے طور پر وہ اپنی کہانی کی شمولیت پر سخت معترض تھے لیکن گذشتہ دنوں علی گڑھ میں ہونے والے کہانی کے دوروزہ سیمینار میں انھوں نے اس قدر پیاری اور اثر انگیز کہانی سنائی کہ میں نے بادلِ ناخواستہ اس کہانی کو چھین کر اس انتخاب میں شامل کر لیا۔ یہ کہانی اتفاقیہ طور پر اس انتخاب میں شامل ہوگئی۔ کہانی کار کی حیثیت سے عابد سہیل نے یقیناً اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ موجودہ عہد کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اپنی ٹھنڈی تحریروں میں ضم کر لینا ان کا خاص آرٹ ہے۔''

یہ انتخاب جولائی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اور بیحد مقبول ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد نئی کہانیوں سے متعلق یہ پہلا انتخاب تھا جسے پسند کیا گیا اور مجھے اس سے بیحد فیض پہنچا۔ مطالعہ، مقدمہ، مقبولیت، شہرت کا، راتوں رات میں فکشن کا ناقد کہلایا جانے لگا۔ ناقد تو خیر کیا تھا (وہ تو اب بھی نہیں ہوں) بس ایک جنون تھا اور کام کر گیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس کے پس پردہ دو بزرگوں کا غیر معمولی یوگیہ دان تھا۔ محمد حسن اور عابد سہیل۔ محمد حسن کا معاملہ تو بس رائے مشورہ کی حد تک تھا لیکن عابد سہیل نے اسے واقعی عملی جامہ پہنایا تھا۔ خطرہ مول لیا تھا۔ خسارہ کا کام کیا تھا۔ یوں بھی وہ خسارے کا کام کرنے میں ماہر تھے۔ بس معاملہ زبان و ادب کا ہو، لیکن یہ بھی ہے کہ ان کی ترقی پسندی جارح نہ تھی۔ ذاتی بغض وعناد سے دور تھی۔ فکر و نظر کے دائرے اور تخلیقی اشارے تک تھی البتہ تنقید میں وہ پکے مارکسی تھے۔ تاہم جس نوعیت کے تعلقات شمس الرحمٰن فاروقی، نیز مسعود وغیرہ سے تھے جو کبھی کبھی

خالی قسم کے ترقی پسندوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتے تھے لیکن عابد سہیل بنیادی طور پر انسان دوست تھے۔ دوستی اور نظریہ سازی ان کے لیے دو الگ الگ قدریں تھیں جسے پرانے وضعدار ترقی پسند ہی سمجھ سکتے تھے۔ نئے تو خیر کیا سمجھیں گے۔ اس کتاب کی مقبولیت نے ڈیڑھ بوتل کا نشہ پلادیا اور میں نے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۷۹ میں الہ آباد میں نئی کہانیوں پر ایک بڑا سیمینار کیا جس میں بلا مبالغہ تقریباً پچاس نقاد اور افسانہ نگار شریک ہوئے۔ اس میں عابد سہیل بھی شریک ہوئے اور قدم قدم پر مشورے دیتے رہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ۔ علی گڑھ، دہلی جہاں بھی فکشن پر پروگرام ہوئے یا انجمن ترقی پسند مصنفین کا نفرنس ہوئیں ہم ساتھ ساتھ شریک ہوئے اور عابد سہیل کی تنقید و تخلیق سے فیض اٹھائے۔ ان کی سادگی، بے تکلفی اور خورد نوازی کی وجہ سے ایک میں ہی کیا لکھنؤ، الہ آباد کے بیشتر ادیب و شاعران سے اور ان کے ادارے سے بیحد قریب تھے اور وہ ان سب کی خوشی خوشی حاجتیں پوری کرتے۔ رائے مشوروں سے نوازتے۔

۱۹۷۹ء میں میں نے اپنی تھیسس جمع کر دی۔ ۱۹۸۰ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں لکچرر ہو گیا ہاں میکش اکبر آبادی سے ملاقاتیں ہوئیں انھوں نے نظیر اکبر آبادی پڑھنے کو کہا۔ آگرہ کی نمائندگی کرنے کے لیے پروفیسر محمود الٰہی نے یوپی اردو اکادمی کا ممبر بنالیا۔ اکادمی میں بھی عابد سہیل تھے جو وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے۔ کیا پڑھ لکھ رہے ہو۔ اکثر خط بھی لکھتے۔ ان کا ادارہ خسارے میں چل رہا تھا لیکن وہ پھر بھی چلائے جارہے تھے صرف اس لیے کہ کچھ پرانے نئے ادیبوں کی، ادب کی خدمت ہو رہی ہے اور وہ خدمت کرتے رہتے گھاٹا سہتے رہے۔ اس گھاٹے کا ایک اور سودا انھوں نے میری ایک اور کتاب نظیر اکبر آبادی شائع کی اور ۱۹۸۶ء میں میری تھیسس ''عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار'' شائع کی۔ اور کتاب پر بڑی محبت سے لکھا:

> ''ڈاکٹر علی احمد فاطمی ان چند اساتذہ میں ہیں جن کی علمی
> و ادبی کاوشوں سے ان کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے
> ۱۹۷۸ء سے انھوں نے تصنیف و تالیف کی جانب سنجیدگی

سے توجہ دی اور افسانوی ادب کو خصوصاً اپنی تنقیدی
کاوشوں کا موضوع بنایا۔ پچھلے سات آٹھ برسوں میں
اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ان کے تقریباً ۲۵
مضامین ہندو پاک کے اہم جرائد میں شائع ہو چکے
ہیں۔ زیر نظر تصنیف ان کا وہ مقالہ ہے جس پر الٰہ آباد
یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے
اس تحقیقی وتنقیدی مقالہ میں شرر کی زندگی اور ان کے
اکتسابات کے متعدد پہلوؤں سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور
ان کے فن کو معروضی انداز سے جانچنے اور پرکھنے کی
کوشش کی ہے۔ شرر اور ان کے عہد کو سمجھنے کے لیے اس
کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

میرے لیے یہ تعارف محض رسمی نہ تھا بلکہ ایک سینئر کی طرف سے محبت کی سوغات تھی۔ اور ایسی کئی سوغاتیں عابد سہیل اپنے ہم عصروں خوردوں اور دوستوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اسی لیے عابد سہیل کی شخصیت خلوص ومحبت اور معاونت کا ایک گہوارہ بن گئی تھی اور ان کی دوکان ایک ادارہ مجھے یہ اعتراف کرنے ہیں ذرا بھی تکلف نہیں کہ مجھے جن چندلوگوں نے غیر معمولی اور شفقتوں سے نوازا۔ ہمت افزائی راہنمائی کی ان میں عابد سہیل کا بھی ایک اہم نام ہے۔

۱۹۸۳ء میں آگرہ سے الٰہ آباد آ گیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ عابد سہیل خوش ہوئے اور خوشی سے بھرا خط لکھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب میں ان کی مدد کروں گا۔ کتب خانے کے لیے کتابیں خریدوں گا کتاب کی اشاعتِ نو پر باتیں کروں گا۔ لیکن ان کے گھریلو حالات بدل رہے تھے۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ اب وہ زیادہ نقصان دہ کاروبار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے نصرت پبلشرز کے بھی بند کرنے کا خیال بار بار آتا رہا اور پھر ایک دن یہ آیا کہ دوسروں پر چڑھے ہزاروں کا قرض

معاف کرتے ہوئے یہ ادارہ بند ہوگیا۔ ہم سب فکر مند ہوئے کہ اب عابد سہیل کیا کریں گے، وقت کیسے گزاریں گے لیکن عابد سہیل تو یہاں بھی قلندر نکلے، پیشانی پر ذرا بھی بل نہیں، پریشانی کا ذرا بھی احساس نہیں، بلکہ خوش اور آزاد کہ اب جم کر پڑھنے لکھنے کا کام کریں گے۔ادھورے کام پورے کریں گے اور انھوں نے ایسا کر دکھایا۔ کاروباری زحمتوں سے آزاد ہوکر پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ انھوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ دراصل وہ کاروبار کے لیے بنے ہی نہ تھے۔وہ سراپا زبان وادب، تخلیق وتنقید کے انسان تھے۔فکشن کے مردِ میداں تھے انھوں نے جتنے اچھے افسانے لکھے اس سے زیادہ فکشن پر مضامین لکھے اور یہ کام اس وقت ہوا جب وہ ذمہ داریوں سے آزاد ہوکر تخلیق وتنقید کی طرف آگئے۔ اس درمیان انھوں نے افسانے بھی لکھے جو بعد میں 'غلام گردش' کے عنوان سے مجموعے میں شامل ہوئے لیکن اس مجموعہ میں بھی ان کا وہ افسانہ شامل نہ تھا جو میں نے بیس نئی کہانیوں میں لیا تھا۔میں نے ان سے ایک بار سوال بھی کیا تو وہ بس مسکرا کر رہ گئے۔اس مسکراہٹ میں مسلکی تعریف کی لہر ڈوب رہی تھی ابھر رہی تھی۔ خیر میرا خیال ہے کہ انھوں نے افسانوں سے زیادہ مضامین اچھے لکھے ہیں۔بیحد عمدہ خاکے لکھے ہیں اور غیر معمولی خودنوشت سوانح لکھی ہے۔ پھر بھی ان کی بنیادی شناخت ایک تخلیق کار کے زیادہ رہی لیکن کچھ لوگ انھیں صحافی پہلے مانتے ہیں۔

شاعری کے مقابلے جب اردو فکشن نے صنفی حیثیت سے اپنی انفرادی شناخت قائم کی تو بزرگوں نے فکشن اور اس کی تنقید کی طرف توجہ دی۔ وقار عظیم، وارث علوی، قمر رئیس وغیرہ نے بطورِ خاص۔ خاصے کام ہوئے۔ عابد سہیل، وارث علوی، قمر رئیس وغیرہ کی طرح پروفیشنل نقاد تو نہیں تھے لیکن جب ان کے تنقیدی مضامین بھی شائع ہونے لگے تو وہ پوری دلچسپی سے پڑھے جاتے۔ گفتگو وبحث کا حصہ بنتے اور جب ان کی کتاب 'فکشن کی تنقید' (۲۰۰۰) منظرِ عام پر آئی تو اس پر خوب چرچے ہوئے۔ اوّل تو یہ کہ وہ کتاب جدید نقاد شمس الرحمن فاروقی کے نام معنون تھی جس پر بعض ترقی پسند ناقدین نے ناراضگی ظاہر کی کہ سہیل درمیانہ رویہ اپناتے ہیں، سب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں وغیرہ دوئم یہ کہ یہ کوئی تنقید

نہیں ہے تنقید کی زبان ہی نہیں ہے۔ سوئم یہ کہ افسانوں کا تجزیہ کرنا اور بات ہے اور افسانوں کے رجحانات ومیلانات اس کے فکروفن پر گفتگو کرنا اور بات ہے۔ یہ بات اس لیے بھی اٹھی کہ اس کتاب میں چند مضامین کے ساتھ ساتھ سات افسانوں کے تجزیے تھے۔ تجزیہ، تشریح اور تنقید میں بہر حال فرق ہوا کرتا ہے وغیرہ۔ تنقید کے آداب کچھ بھی ہوں لیکن افسانے پر کرشن چندر، جوگیندر پال قاضی عبدالستار، اقبال مجید، عابد سہیل وغیرہ جیسے فنکاروں نے جب جب تنقیدی مزاج کے مضامین لکھے ہیں اس نے ایک الگ قسم کا لطف دیا ہے۔ تخلیقی تنقید کا لطف، عابد سہیل ان سب میں آگے تھے۔ فلسفہ کے طالب علم تھے لیکن کبھی کبھی غیر ضروری فلسفہ طرازی گراں گذرتی تھی۔ تحریر میں اور تقریر میں بھی۔ اس لیے وہ پورے طور پر فنکار نہ بن سکے۔ اور نہ ہی پورے طور پر ناقد۔ سچ پوچھیے تو وہ کسی شعبہ میں پورے نہ تھے لیکن پھر بھی بڑے بڑے پورے اور بھرے پیٹ کے ادیبوں و نقادوں سے بہت بڑے تھے۔ ان کا نامکمل پن دوسروں کی نام نہاد تکمیلیت سے بہت بلند تھا۔ ان کی ادب کی سمجھ، بالخصوص افسانہ کی سمجھ غیر معمولی تھی۔ اس غیر معمولی پن نے ہی ان کو بڑا افسانہ نگار نہیں بننے دیا لیکن افسانہ کا ذہین اور مہین پارکھ ضرور بنا دیتا ہے۔ اس تائید کے لیے میں ان کے چند مضامین پڑھنے کی سفارش کروں گا۔ اوّل اسی کتاب میں شامل مضمون 'تہذیب ثقافت اور افسانہ' اور دوسرا مضمون جوان کی زندگی کے آخری دور کا مضمون ہے۔ اور شاید اس کے بعد انھوں نے کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھا وہ ہے 'نثر۔ فکشن اور سروکار' ان مضامین کو ملاحظہ کیجیے آپ کو پروفیشنل تنقید اور بالخصوص جدید تنقید کا نصابی۔ مکتبی اور تکنیکی رویہ نظر نہ آئے گا۔ مختصر افسانہ کو تہذیب وثقافت جیسے بڑے سروکاروں سے جوڑ کر دیکھنا اور تاریخ وتہذیب کے حوالے سے پرکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ عمل تو وراث علوی کے یہاں بھی کم ملتا ہے چہ جائیکہ مہدی جعفر۔ یہ ایک بڑا اسیاق وسباق تھا جسے عابد سہیل جیسا صحافی، فلسفی، تاریخ داں۔ گہرا سیاسی اور سماجی شعور رکھنے والا ہی کرسکتا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے تنقید کو بھی خانہ وحاشیہ میں قید کر رکھا ہے اس لیے عابد سہیل کی تنقید اور فکشن کی پرکھ اس معیار تک نہ پہنچی جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ آپ

'پیتل کا گھنٹہ' اور 'نیا قانون' کے تجزیے بطور خاص پڑھئے۔ آپ کو میری گفتگو پر یقین آ جائے گا۔ کوئی کچھ بھی کہے میں انھیں افسانہ نگار سے زیادہ بڑا افسانہ کا پارکھ سمجھتا تھا اور آج بھی میرا یہی خیال ہے۔ وہ میرے مضامین بھی پڑھتے تھے۔ رپورتاژ اور سفرنامے بھی۔ فون کرتے یا خط لکھ کر ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہ ایک ترقی پسند ہی کر سکتا تھا۔ جدید نقادوں کو میں اپنی کتابیں بھیجتا ہوں تو رسید تک نہیں دیتے۔ ملاقات پر بھی ذکر نہیں کرتے۔ ایک عجیب غیر اخلاقی و غیر ادبی سکوت طاری رہتا ہے۔ نقادوں کی مجرمانہ خاموشی ادب کو کس قدر نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس کا اندازہ ان کو نہیں لیکن یہ تو ہوتا ہی جا رہا ہے کہ رفتہ رفتہ تنقید اور نقاد دونوں ہی بے وقعت ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف بعض تخلیق کار خود نقاد بننے کی نازیبا کوشش میں مبتلا ہیں اور یہ زعم خود اپنے آپ کو اپنے عہد کا بڑا ہی نہیں سب سے بڑا تخلیق کار ہونے کا اعلان کرتے جا رہے ہیں۔ تخلیق و تنقید پر کیا وقت آن پڑا ہے۔

کچھ فرصت پانے کے بعد اچانک ان پر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا دورہ پڑ گیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہ انھیں بڑا اور بہت بڑا بنانے میں لگ گئے جبکہ وہ پہلے ہی سے بڑے تھے لیکن عابد صاحب تمام ترقی پسندوں سے بڑا بنانے لگے۔ بعد میں پتہ چلا کہ علیم صاحب رشتے میں ان کے ماموں تھے سہیل صاحب کا خیال تھا کہ علیم صاحب کے ساتھ انصاف نہیں ہوا بس تو پھر وہ خود ہی انصاف کرنے بیٹھ گئے اور واقعی انصاف کر ہی ڈالا۔ بیحد عمدہ اور بڑے کام کئے۔ علیم شناسی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک زمانے میں وہ اٹھتے بیٹھتے بس علیم صاحب کا ہی ذکر کرتے۔ ایک بار تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ 'لندن کی ایک رات' دراصل علیم صاحب کا لکھا ہوا ناول ہے۔ ہم ان کی اس علیم نوازی پر حیران ہو جاتے کبھی کبھی پریشان بھی ان باتوں سے قطع نظر انھوں نے علیم شناسی کا حق تو ادا کیا ہی۔ اس سے فرصت ملی تو خاکے لکھے۔ بہترین خاکے۔ اتنے کہ دو کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔ ۲۰۰۴ء میں 'کھلی کتاب' اور ۲۰۱۵ء میں 'آدھے ادھورے'۔ ان کتابوں کو میں نے بھی پڑھا۔ بعد کی کتاب پر تبصرہ بھی کیا۔ یہ خاکے رسمی و روایتی نہیں بلکہ ان میں پورے ایک طرف شخصیت کا زیر و بم اور کیف و کم نظر آتا ہے تو دوسری طرف ایک تہذیب، تہذیب اودھ اور تہذیب صحافت۔

یہی بات میں ان کی تنقید کے بارے میں بھی کہتا ہوں۔ان کی تخلیق بھی تنقید کے پاس سے ہو کر گذرتی ہے اور تنقید تو تخلیق کے بطن سے ہی پیدا ہوتی ہے۔خاکوں کی بھی یہی صورت وہ صرف شخص کا تعارف بھی کراتے ہیں۔بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسے خاکے عابد سہیل جیسا نرم ومحبت کرتے والا انسان ہی لکھ سکتا ہے جو دوسروں کو عزت ومحبت نہ دے سکے وہ خاکے کیا لکھے گا شاید یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں خاکہ نویسی کا چلن کم ہو گیا ہے۔

اب میں آخر میں ان کی خودنوشت 'جو یاد رہا' کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

پروفیسر قمر رئیس جب دہلی اردو اکادمی کے چیئرمین تھے تو انھوں نے اکادمی کی جانب سے کئی بزرگوں ترقی پسند ادیبوں کو وظیفے دلوائے اور ان سے کچھ اچھے کام لیے،ان میں سے ایک عابد سہیل بھی تھے۔خودنوشت کا منصوبہ اسی ادارہ کا تھا جسے بہ حسن وخوبی انجام دیا عابد سہیل نے۔تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کو بعنوان 'جو یاد رہا' نے دہلی اردو اکادمی نے شائع بھی کیا۔اس منصوبہ کے سلسلے میں وہ اکثر دہلی آنے جانے اور ایوانِ غالب کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کرتے۔میں بھی اکثر وہیں ٹھہرتا ہوں۔سال ۲۰۱۲ء کے آخری دن تھے۔میں دہلی گیا تو سیدھے غالب انسٹی ٹیوٹ پہنچا دیکھا تو عابد سہیل بھی موجود ہیں۔انھوں نے مسرت آمیز انکشاف کیا کہ ان کی خودنوشت شائع ہونے والی ہے۔میں نے اظہارِ مسرت کیا اور کہا کہ اس کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔دوسرے دن صبح میں نے دیکھا کہ ڈھیلا ڈھالا پائجامہ اور اتنا ہی ڈھیلا کرتا اور کرتے پر الٹا سوئٹر پہنے بغل میں اخبار میں کچھ چھپائے میرے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

''سو رہے ہو کہ جاگ رہے ہو؟''

''جی میں تو صبح ہی اٹھ جاتا ہوں۔آیئے تشریف لایئے''

''بھئی مجھ سے صبح اٹھا نہیں جاتا'' یہ کہا ہی تھا کہ اخبار اور اس میں چھپی ہوئی چیز زمین پر گر پڑی وہ اس کو اٹھانے کے لیے جھکے لیکن جھکا نہ گیا۔میں نے جلدی سے وہ چیز اٹھائی۔اس چیز کو دیکھے بغیر میں نے معنی خیز انداز میں کہا''اب آپ سے جھکا بھی نہیں جاتا۔''

وہ میرا اشارہ سمجھ گئے اور فوراً بولے''زندگی میں کبھی نہیں جھکا تو اب کیا جھکوں گا!''

اچھا بھائی چھوڑیے" کل میں نے جو بات آپ سے کہی تھی کہ میری کتاب آرہی ہے۔ شام کو دو کاپیاں آگئی ہیں ایک کاپی آپ کے لیے لایا ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ آپ اسے پڑھیں گے اور اپنی بے لاگ رائے پیش کریں گے" یہ کہہ کر انھوں نے کتاب پر میرے ہی قلم سے لکھا "عزیز دوست علی احمد فاطمی کے لیے خلوص کے ساتھ۔ عابد سہیل ۲۳ دسمبر ۱۲ء"

میں ان کا دوست نہ تھا۔ وہ صرف عمر، علم، کام غرضکہ ہر اعتبار سے بڑے تھے لیکن یہ ان کا بڑکپن تھا۔ میں نے تقریباً تمام ترقی پسندوں میں یہاں تک کہ بزرگ ترین سردار جعفری، معین جذبی میں بھی دیکھا کہ وہ اپنے خوردوں کو بھی دوست ہی سمجھتے تھے۔ عزیزم یا برادرم کہہ کر خط لکھتے۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر باتیں کرتے۔ برابر کا درجہ دیتے۔ کاش کہ یہ رویہ وجذبہ جدید اور مابعد جدید نقادوں کا بھی ہوتا ان کے یہاں تو زبان کھولتے ہوئے تکلف بلکہ خوف کا احساس ہوتا ہے اور ہم لوگ خاص طور پر میں اپنی بات کہتا ہوں کہ میں سردار جعفری، ممتاز حسین، محمد حسن، قمر رئیس اور خود اپنے استاد سید محمد عقیل صاحب سے بھی اختلاف کرتا تھا۔ بحث کرتا تھا اور یہ تمام لوگ اس اختلاف کا استقبال کرتے تھے۔ چائے پلاتے تھے۔ سردار اور قمر رئیس تو کچھ اور بھی کھانے پلانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ عابد سہیل کا معاملہ صرف چائے تک محدود رہتا یہ الگ بات ہے کہ ان کی محبت، اپنائیت، سادگی اور شرافت کا اپنا ایک انداز تھا بلکہ ایک نشہ تھا جس سے میں بارہا شرابور ہوا ہوں۔ بہرحال میں نے وعدہ کیا کہ میں ضرور لکھوں گا یوں بھی میں سوانح یا خودنوشت سوانح بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ مجھے تھوڑی حیرت ضرور تھی اس لیے کہ وہ کبھی اپنی کتاب پر لکھوانے کی بات نہیں کرتے تھے پھر اس کتاب کے بارے میں کیوں کہا۔ بعد میں انھیں سے پتہ چلا کہ کچھ ماہ قبل دو خودنوشتوں پر میرے تفصیلی مضامین اوّل وامق جونپوری کی خودنوشت گفتنی ناگفتنی اور دوسرے استاذی عقیل صاحب کی 'گئو دھول' میرے تفصیلی مضامین پڑھ اور پسند کر چکے تھے۔ یہ بات انھوں نے مجھ سے خود کہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ خودنوشت کے فن پر کچھ گفتگو بھی ہوئی تھی۔ ان کی طرف سے تخلیقی تھا اور میں نے تنقیدی انداز سے گفتگو کیا تھا

یوں بھی ہزار تکلف والا بند انسان بھی کبھی کبھی اپنوں سے کھل جاتا ہے اور اسے کھلنا بھی چاہئے۔ بند انسان آزاد بھی نہیں ہوتا اور کبھی کبھی خطرناک بھی ہوتا ہے___ یہ بات میں پورے اعتماد اور اخلاص سے کہہ سکتا ہوں کہ اس لمبی مدت میں کئی ایسے مقامات آئے ہیں جب انھوں نے مضبوط لمحوں میں کمزور باتیں کی تھیں وہ کمزوری جو فطری ہوا کرتی ہے جسے نقاد تو چھپاتے ہیں لیکن فنکار اکثر نہیں چھپا پاتے۔ من کی باتیں درپن میں جھلک ہی جایا کرتی ہیں اس کے برعکس نقاد جو نہیں ہوتا اس کو ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور اپنے آپ کو نام نہاد علمی انداز میں اکسپوز بھی کرتا رہتا ہے۔ میں پوری ذمہّ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ عابد سہیل جب جب فنکار ہوتے تو ان کی معصومیت وشفافیت بڑی دلکش ہوتی تھی اور جب کبھی وہ دانشور (جو وہ تھے) یا اس سے زیادہ بننے کی کوشش کرتے تو بلاوجہ کی نمائشی و مصنوعی انداز جھلکنے لگتا تھا۔ لیکن اس میں بھی ایک لطف تو تھا۔ خیر!

الہ آباد آ کر پہلی فرصت میں میں ان کی کتاب کو بغور پڑھنا شروع کیا تو بس پڑھتا ہی چلا گیا۔ تقریباً ۲۲ صفات پر مشتمل ایک تفصیلی مضمون لکھ ڈالا۔ شائع ہونے سے قبل میں نے احتیاطاً واحتراماً اس کی ایک کاپی پہلے انھیں کو روانہ کی جسے انھوں نے پڑھا پسند کیا اور کچھ معمولی تبدیلیوں کی طرف اشارے بھی کئے۔ میں نے فوراً تبدیلیاں کر کے وہ مضمون 'ایوانِ اردو' میں برائے اشاعت بھیج دیا جسے بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے ایک عمدہ کتاب پر تفصیلی مضمون لکھا بلکہ اپنے ایک بزرگ کی غیر معمولی کوششوں کو سراہا لیکن مجھے اس وقت سخت حیرت ہوئی جب اسی رسالہ کے اگلے شمارے میں میرے مضمون سے متعلق عابد سہیل کا ایک مختصر سا اعتراض نما مضمون شائع ہوا جسے پڑھ کر میں حیران رہ گیا، جب میں نے اصلاح کے لیے مضمون بھیجا تھا تو اس وقت ان اعتراضات کو انھوں نے واضح کیوں نہیں کیا۔ یہ معمہ کئی ماہ تک مجھ پر سوار رہا پھر گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ہلکا ہو گیا اس درمیان میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن اس مسئلہ پر نہ انھوں نے مجھ سے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے بعد میں اندازہ ہوا کہ ان اعتراضات کو وہ براہ راست مجھے لکھتے ہوئے تکلف کر گئے اس میں بھی ان کی محبت

اور شرافت کا ہی دخل تھا اس درمیان ناول کے فکر وفن پر میرے کئی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے جنہیں انھوں نے پسند کیا اور فون کیے۔ 'ایوانِ اردو' فروری ۲۰۰۴ء کے حصہ مضامین میں ان کا ایک مضمون ناول 'برف آشنا پرندے' پر شائع ہوا۔ اسی مضمون کے نیچے میرا ایک مضمون 'رتن سنگھ' کی خودنوشت پر تھا جسے عابد سہیل نے بیحد پسند کیا اور کہا کہ تمہارے مضمون سے تحریک پا کر اب میں ان کی کتاب پر مضمون لکھنے جا رہا ہوں اور انھوں نے لکھا اور بیحد عمدہ لکھا اس کے آگے میرا مضمون بہت معمولی تھا۔ رتن سنگھ ان کے دوست تھے اور ایک لمبا ساتھ تھا۔

جیسا کہ میں عرض کیا کہ عابد سہیل سے میری ملاقاتوں ومحبتوں کے سلسلے چار دہائیوں پر مشتمل تھے۔ ایک مضمون میں ان کا اظہار ممکن نہیں اور نہ ہی ان کے تمام کارناموں کو سمیٹ کر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ یوں تو ادب وادیبوں میں ایسے لوگ گذرے ہیں جنھوں نے کئی ناول لکھے۔ کئی افسانوں کے مجموعے چھوڑے لیکن ایک ہی شخص افسانے لکھے۔ افسانہ کی تنقید بھی لکھے۔ اردو میں ادرات کرے اور انگریزی میں صحافت، خاکے لکھے۔ اور مقدمے بھی۔ کالم بھی اور خودنوشت بھی۔ اردو میں بھی لکھے اور انگریزی میں بھی۔ اردو کی اکثر چیزیں انگریزی میں پیش کرتے اور انگریزی کی اردو میں۔ ایسی رنگارنگ اور مختلف الجہات شخصیت کو ایک مضمون میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ یہ تو ایک مکمل تھیسس کا موضوع ہے جو اب لکھی جانی چاہئے۔

اسے تو محض ایک یادگاری اور تاثراتی مضمون سمجھنا چاہئے جس میں میں نے ایک اپنے اس بزرگ دوست کو ترقی پسند ادیب ودانشور کو۔ مجاہد اردو کو۔ اور انسان دوست فنکار کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان صحبتوں، مذاکروں، کانفرنسوں کو یاد کیا ہے جو ان کے ساتھ گذاری ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ کئی سفر کیے ہیں۔ کئی بار ہوٹلوں میں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ان کی خدمت کی ہے۔ ان کا سوٹ کیس اٹھایا ہے ان کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور جوتیوں کے فیتے جو اکثر ان کے کمربند کی طرح ڈھیلے رہتے تھے انھیں جھک کر کسا ہے۔ ان کے بچوں کو پیار کیا ہے۔ ان کی بیگم کے ہاتھوں کی چائے پی ہے۔ ان کے بیٹے ساجد کی

شادی میری رشتہ کی بھتیجی سے ہوئی ہے۔ ہم ان شادیوں میں شریک ہوئے ہیں جوالہ آباد میں ہوئی تھی۔ غرضکہ بے شمار واقعات کہاں تک ذکر کروں۔

لکھنؤ تو اب بھی جاتا ہوں۔ مجبوراً جانا پڑتا ہے لیکن اب لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا 'عابد سہیل' نہیں رہے۔ 'ملک زادہ منظور' نہیں رہے۔ 'علی جواد زیدی' نہیں رہے۔ 'شہنشاہ مرزا' نہیں رہے۔ نہ وہ دانش رہی نہ دانش محل۔ اب لکھنؤ سیاسی مرکز بن چکا ہے اور شاعر و ادیب بھی سیاسی ہو چکے ہیں۔ ہائے کیا دن تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ سے امین آباد کا زمینی سفر۔ شہنشاہ مرزا سے عابد سہیل تک کا ذہنی سفر۔ ایک تاریخ۔ ایک تہذیب۔ ایک دبستان اور اب شامِ غریباں عابد سہیل۔ ''تم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ''

□□□

ہم تو کیا سب اسی کے گھائل ہیں

حسن عابد سے جس نوع کے ذاتی ونظریاتی رشتے رہے ہیں اور جس طرح سے وہ پیام وپیغام اور نیا سفر کے لئے کلام سے نوازتے رہے ہیں اور کلام کو ارتقاء میں شایع کرتے رہے ہیں نیز کراچی بلاتے اور اپنے گھر کا خاص مہمان بناتے رہے ہیں اور ایک بھائی کی حیثیت سے اپنی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں سے نوازتے رہے ہیں اس کے پیش نظر تو میں بہت پہلے ہی سے ان کی شخصیت اور خصوصاً شاعری کے بارے میں لکھنا چاہ رہا تھا اور اس چاہت میں محض احسان مندی یا جوابی کاروائی کا جذبہ نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت میں واقعتاً ایک ایسی مشفقانہ گھلاوٹ اور سرپرستانہ اخلاص تھا کہ بہت کچھ نثار کر دینے کو جی چاہتا تھا۔ حالانکہ شعروادب کی سطح پر میں خالی خولی محبت وشفقت سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا ۔یہ الگ قسم کے شخصی اوصاف ہیں جن کی قدر کی جانی چاہئے لیکن فکر ونظر کی سطح پر جس چیز نے مجھے بیحد متاثر کیا وہ تھی حسن عابد کی والہانہ وابستگی۔ سوچتی ہوئی خاموشی، بیحد شفاف اور متوازن قسم کی ترقی پسندی۔ کہیں کوئی جھول نہیں، میل نہیں اور نہ ہی شدت وجارحیت جو کبھی کبھی مجھے راحت سعید میں نظر آتی ہے اور کبھی کبھی محمد علی صدیقی کے عالمانہ دھند میں چھپی دکھائی دیتی ہے۔ شاید اس کے پیچھے بہت سارے اسباب وعوامل کام کر رہے ہیں۔ کچھ تہذیبی پس منظر، چند واقعات وحادثات جو ہر ایک کی زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ہر شخص اور خاص طور پر شاعر۔ فنکار کی اپنی مخصوص افتاد طبع اور نفسیات ہوا کرتی ہے۔ ردوقبول کی عجیب وغریب سطحیں۔ سادگی، خامشی اور بھولپن عموماً شخصیت کا کمزور پہلو سمجھے جاتے ہیں لیکن باطن کی اتھاہ گہرائی اور سنجیدگی ان عناصر میں وہ رنگ بھر دیتے ہیں کہ جس سے نرم وگداز ومعنی خیز شاعری کے انکھوے پھوٹنے لگتے ہیں۔ بقول قمر رئیس ''بھولپن کے ان کے وجود میں کائنات کے تئیں ان کی حیرت اور تجسس کو زندہ رکھا جو شاعری کا جذبۂ محرکہ ہے۔ اور خاموشی اسی سیل حوادث کا پتہ دیتی ہے جس سے ان کی روح

گزری ہے اور جس کو انھوں نے شعروں میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔"

اب جبکہ حسن عابد اس دنیا میں نہیں ہیں اور احسان اتارنے یا جواب دینے کی ساری مشکلات وہ اپنے ساتھ لیتے گئے اور بہت ساری یادیں اور درد ہمارے لئے چھوڑ گئے تو ایسے میں ان کی شخصیت کا بکھان سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس کے کلام کا معروضی تجزیہ کریں اور اس شاعر دانشور حسن عابد کو از سر نو تلاش کریں جس نے اپنی پوری زندگی ترقی پسندی اور ترقی پسند افکار و اقدار کے لئے وقف کر دی بڑے خلوص سے بڑے اہتمام سے۔

حسن عابد ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ کے قریب شہر سیتاپور میں پیدا ہوئے جو اودھ کا حصہ تھا۔ والد سید محمد ساجد زیدی جو مدرس تھے او شاعر بھی لیکن اس کے علاوہ وہ ایک ترقی پسند حساس و فکر کے انسان تھے۔ جاگیردارانہ طرز حیات کے سخت مخالف تھے نیز محنت کی عظمت کے قائل تھے۔ ان کا یہ رویہ بقول حسن عابد:

> "وہ علمائے کرام کی عیش پسندانہ اور جاہ پرستانہ زندگی کے ناقد تھے اور ان میں پائے جانے والے تضادات کو واضح کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے کبھی کسی کتاب کو پڑھنے سے نہیں روکا۔ وہ کہتے تھے کہ آدمی کو مختلف نظریات رکھنے والی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔"

حسن عابد کے چچا سیف شادانی نے بھی متاثر کیا شاعری سے زیادہ انسانی رویے نے کہ وہ انسانوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ باپ چچا کے ان علمی و فکری رویوں کے ساتھ ساتھ پورا گھریلو ماحول جہاں حسرت، فانی، جگر وغیرہ کی غزلیں کم جوش، اختر شیرانی کی نظمیں زیادہ پڑھی جاتیں تبھی تو حسن عابد لاشعوری طور پر لکھتے ہیں:

> "اس طرح ہم چھوٹوں کے ذہن بھی نظموں کی رنگین پھواروں میں نہا گئے۔ میرے والد اقبال کے بہت معترف تھے۔ انھوں نے مجھے بچپن ہی میں علامہ کی نظمیں یاد کرادی تھیں۔"

اس کے باوجود حسن عابد نظم کے شاعر بعد میں احمر سیتاپوری کے نام سے غزل کے شاعر پہلے ہوئے۔ یہ غزلیہ شاعری کی چمکدار رنگین روایت کا اعجاز تھا یا مشاعروں کی مقبولیت لیکن جیسے ہی وہ سیتاپور سے نکل کر لکھنؤ آئے ترقی پسند ادیبوں ودانشوروں سے سابقے ہوئے خاص طور پر احتشام حسین جیسے جید اور پرکشش ترقی پسند اسکالر سے استاد کی طرح قربت نصیب ہوئی تو احمر سیتاپوری تیزی سے حسن عابد میں ڈھلنے لگا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ لکھنؤ آکر بھی احمر اور عابد دونوں کے درمیان کچھ کشمکش تو رہی اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ شخصیت اور شاعری دونوں ہی میکانیکل انداز سے سفر نہیں کرتے اور کرنا بھی نہیں چاہئے۔ لکھنؤ جوان دنوں بقول قمر رئیس:

''لکھنؤ بلکہ سارے شمالی ہند کے نوجوان صاحب اقتدار طاقتوں کے خلاف ہر میدان میں صف آرا تھے۔ ہم لوگ اس صورت حال کے محض تماشائی نہیں تھے بلکہ اس میں شریک تھے۔ اور اس جدوجہد کو آزادی اور انصاف کے لئے بنی نوع انسان کی اجتماعی اور آفاقی جدوجہد کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے تھے۔ ان میں بھی ہم لوگ پابندی سے شریک ہوتے۔ ادبی ونظریاتی مباحث میں حصہ لیتے نئی نئی کتابیں پڑھتے اور ان پر بحث کرتے۔ سرکشی ہمارا شعار تھی اور ہمارے دل ساری دنیا کی انقلابی طاقتوں کے لئے اتحاد اور اخوت کے جذبات سے معمور تھے۔''

حسن عابد کے حوالے سے بھی یہ خوبصورت اور معنی خیز جملے ملاحظہ فرمایئے:

''ان حوصلہ خیز محفلوں اور سرگرمیوں میں حسن عابد بڑی مستعدی اور سنجیدگی سے حصہ لیتے۔ ان کی روشن

آنکھوں میں کچھ انجانی خواہش جھلملاتی نظر آتیں۔''

ایک جملہ اور ہے جو اس وقت کے پرانے لکھنؤ اور پرانی تہذیب کے بارے میں اہمیت رکھتا ہے:

''یہ وہ دور تھا جب قدیم تہذیب کی قندیلیں ابھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پرانے لکھنؤ کی گلیوں میں شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ قدیم رسم و رواج اور تہوار ابھی زندہ تھے اور وہ قدریں بھی سلامت تھیں جن کی نرم گھنی چھاؤں میں ہم لوگ دو گھڑی بیٹھ لیتے تھے۔''

یہ تھے اس دور کے دو مناظر جن کے بیچ احمر اور عابد کے درمیان ہی نہیں تمام نوجوان شعراء اور ادبا کے درمیان ایک کشاکش تھی جو اپنے ساتھ صالح روایات لے کر آئے تھے ان کی پاسداری چاہتے تو تھے لیکن نئے جوشیلے خیالات کی عملداری بھی مسلسل انھیں آواز دیے جا رہی تھی۔ یہ وہی دور تھا جب حسن عابد احمر تو تھے اور روایتی لیکن پر کشش ترنم سے مشاعروں میں غزلیں پڑھتے لیکن اقبال جوش کی نظمیہ شاعری، فیض مجاز کی ترقی پسند شاعری کے اثرات کچھ اس انداز سے پڑ رہے تھے کہ حسن عابد جو نرے شاعر نہ تھے بلکہ مفکر و دانشور بھی تھے اپنی شاعری میں اپنی آواز بلکہ اپنے میں کو تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ محمد علی صدیقی نے اچھی بات لکھی ہے:

''یہی ایک حقیقت کہ وہ اس قدر خوبصور دھنک رنگ روشنیوں کے بیچ میں اپنی مخصوص روشنی اور اپنی ''میں'' پر اصرار کر رہا ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کی علیحدہ علیحدہ ''میں'' کا جواز ہے۔ ہر دور میں بہت سے شعراء اور ادیب بیک وقت لکھتے آئے ہیں۔ لکھ رہے ہیں اور لکھتے چلے جائیں گے۔ چونکہ ان میں ہر فرد اپنی حقیقی میں اور فنی اظہار کی میں کے مابین کامل اتصال کا خواہاں ہوتا

ہے اور یہ وہ دوڑ ہے جس کے بارے میں التباسات
(Illusions) کی پرورش کی جاتی ہے۔"

اب ذرا حسن عابد کے جملے ملاحظہ کیجئے:

"شاعری میرے نزدیک کسی سوئے ہوئے انسان
کی بڑبڑاہٹ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باشعور انسان کا ذریعہ
اظہار ہے۔ اب رہی نثر اور شاعری کی بات تو میں اپنے
آپ کو اس خیال سے متفق پاتا ہوں کہ شاعری
Images کی زبان ہے اور ایک فنکار کی images کا
اس کے ورلڈ ویو World View سے گہرا ناتا ہوتا ہے۔
جب کوئی فنکار یا ادیب یہ کہتا ہے کہ ہم فنکار تو یدیم اور
محبت کے پرچارک ہیں اور یہ کہ ہم تمام انسانوں سے
پیار کرتے ہیں تو اسے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تمام
انسانوں کے دائرہ میں ساؤتھ افریقہ، رہوڈیشیا اور
اسرائیلی نسل پرستی اور ان کے حامی بھی آجاتے ہیں۔ اس
لحاظ سے World View کی صحت کا مسئلہ تمام
فنکاروں کے لئے اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ہر عہد اپنی
برائیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ہم انھیں پہچان کر ان
کے خلاف جنگ میں شرکت کریں گے تو قنوطیت اور
مایوسی کے خیموں کی آگ سرد ہو جائے گی اور امید کی توانا
روشنیوں کا حلقہ ہمارے گرد بہت سے اندھیروں کو دور کر
کے ہمیں نئی کہکشاؤں سے ہمکنار کرے گا اور ان روشن
حلقوں اور کہکشاؤں کی سخت ضرورت ہے۔"

حسن عابد کا پہلا شعری مجموعہ 'سوچ نگر' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ تو بات بھی انھوں

نے اسی دور میں کہی اور لکھی لیکن ۵۰۔۵۵ کے آس پاس کی غزلیں جو لکھنو سیتاپور وغیرہ میں کہی گئیں اور احمر کی خوش بختی کا شکار ہوئیں ان میں خوش فکری اور خوش گفتاری کے عناصر کیا ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے۔ اس کی تصدیق سوچ نگر کی پہلی غزل سے ہوتی ہے۔

ہم تیرگی میں شمع جلائے ہوئے تو ہیں
ہاتھوں میں سرخ جام اٹھائے ہوئے تو ہیں

اس غزل کے دو تین اشعار اور ملاحظہ کیجئے

ضرب حرم نے ذوقِ جنوں کو بڑھا دیا — سینے سے ہم بتوں کو لگائے ہوئے تو ہیں
دنیا کہاں تھی پاس وراثت کے ضمن میں — اک دین تھا سو اس پہ لٹائے ہوئے تو ہیں
کب چوب دار ہوں سر افراز دیکھئے — اس شوخ کی نگاہ میں آئے ہوئے تو ہیں

ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے۔ ان کی کیفیات ہی نہیں لفظیات پر بھی غور کیجئے۔ اگر ایک طرف شوخ نگاہیں، بت، تیرگی وغیرہ ہے تو دوسری طرف شمع، ضرب حرم شوق جنوں اور سب سے بڑھ کر سرخ جام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے صرف مروجہ اصطلاحات ہی کام نہیں کر رہی ہیں بلکہ دبے پاؤں متبدل تصورات بھی داخل ہو رہے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ ایک حساس، سنجیدہ اور بامقصد شاعر کے یہاں کروٹ لینے کو تیار تھے اور حسن عابد اسی احساس کو ایک مخصوص فکری ونظریاتی ترتیب وتنظیم دینے میں مصروف ہوگئے۔ غزل میں تو پھر بھی اس کی تنظیم روایتی اسلوب سے آسانی سے نکل نہیں پاتی لیکن نظموں میں فکروخیال کی یہ آزادی زیادہ آسانی سے بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کسی ترقی پسند ناقد نے یہ بات کہی ہے کہ وسعت جہت کے اعتبار سے جتنی گنجائش نظم میں ہوا کرتی ہے غزل میں اس کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اس سے غزل کی اہمیت میں کمی نہیں آتی۔

'سوچ نگر' کی پہلی نظم 'دوخواب' ہے۔ جس میں ایک خواب محبوب دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے تصورت رومانی اور آسمانی ہیں جن کا زمین سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن شاعر یا عاشق کا خواب زمینی اور حقیقی ہے۔ آخر کے چار مصرے دیکھئے۔

اس زمین کے باسی

خاکداں کے یہ ذرے
آندھیوں کے کاندھے پر
کہکشاں مسافر ہیں

ان چار مصرعوں میں شاعر کی جستجو، خواہش، نظریہ سبھی سمٹ آئے ہیں اور یہ ذرے آگے چل کر مختلف نظموں میں واقعی کہکشاں کی طرح دمکتے نظر آتے ہیں لیکن یہ دمک رومان کے حوالے سے کم حقیقت کے حوالے سے زیادہ ہے کہ نظم میں عقل وخرد کی گرہیں زیادہ کھلتی ہیں۔ سوکی دھارا نہیں بہتی ہے۔ اسی دھارا تحت ہی دہلیز کا پتھر، مندر کا بھگوان، کعبہ کا صنم تو بنتا ہی ہے مزدور کا فن بھی بنتا ہے۔ اور پھر انقلاب دستک دینے لگتا ہے۔

میری آواز کے ساتھ یہ
جلی حرفوں سے
ایک تحریر لکھی تھی
کہ جسے
پڑھنے والوں نے پڑھا
سننے والوں نے سنا
رن پڑا
دفعتاً
زیر زمیں گاؤ کی سینگوں کا توازن بگڑا
زلزلے دوڑ پڑے
طبقے الٹے گئے
پہاڑ گہرائیوں میں گر کر ٹوٹ گئے
اور گہرائیاں ابھر کر پہاڑوں کی جگہ جم گئیں

ظاہر ہے یہ انقلاب حقیقی کم رومانی زیادہ ہے۔ لیکن کوئی بھی حقیقت رومانی تصور کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ حقیقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے خواب کا دیکھا جانا

ضروری ہوا کرتا ہے۔ جو خواب حقیقت سے پرے ہوتے ہیں ان کے مقدر میں اکثر گمراہی ہوتی ہے اور اگر خواب کا تعلق شعوری یا لاشعوری طور پر زیست اور فلسفہ زیست سے ہو تو خواب میں کرب اور درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے ع

یہ مرے خواب مرا درد بڑھاتے کیوں ہیں

اچھی بات یہ ہے کہ حسن عابد کے یہاں یہ درد ہجر و وصال کا نہیں۔ حسن و جمال کا بھی نہیں ہے۔ یہ درد دردِ انسانیت، دردِ معاشرت میں رم کر ایک ایسے کربناک اور خوابناک تصور میں ڈھل جاتے ہیں جہاں شاعر موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی کے درمیان ایک ایسی لکیر کھینچ دیتا ہے جو رومان اور حقیقت ے درمیان، ماضی اور حال کے درمیان، بدحالی اور خوش حالی کے درمیان نہ صف شاعرانہ بلکہ دردمندانہ اور مفکرانہ کیفیت کا اظہاریہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ اظہاریہ اپنی بلاغت و بصیرت کے حوالے سے فلسفہ کا روپ لے لیتا ہے۔ 'یہ خواب ہی تو نہیں' کی اس کیفیت کو آپ کیا کہیں گے۔

چمن سے رخصت ابر بہار ہے شاید
زمین خشک ہے بیوہ کی چھاتیوں کی طرح
فضا میں خاک بسر برگ و بار اڑتے ہیں
ہوائیں چیختی پھرتی ہیں وحشیوں کی طرح
ہر ایک شاخ پہ ویرانیوں کے ڈیرے ہیں
اداسیوں کا ہے مسکن تمام صحن چمن
سپید چہرے ہیں جیسے دھلے ہوئے کپڑے
گلوں پہ خون کی ہلکی سی چھینٹ بھی تو نہیں
یہ بیوگی جو مقدر بنی ہے گلشن کا
یہ دائمی تو نہیں
پلٹ کے آئے گا ابر بہار کا موسم
یہ خواب ہی تو نہیں

اچھی بات یہ ہے کہ حسن عابد نے درد میں تلخی کو کم سے کم رکھا ہے۔ اپنی مخصوص فکر اور اسلوب کے ذریعہ غنائیت پیدا کر دی ہے۔ فکر و فن کا یہی وہ انجذابی مقام ہے جہاں فلسفہ شاعری اور شاعری فلسفہ بننے کو بیقرار رہتی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''زندگی کا ہر لمحہ درد سے عبارت ہے'' تو اس میں یاسیت وقنوطیت کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں بلکہ درد و غم کی وہ دولت ہے جو کبھی میر نے سمیٹا اور اسے نشاطِ غم میں تبدیل کیا۔ غالب نے فلسفۂ غم میں۔ جگر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ۔

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

اور ترقی پسند شاعر نے اسے ایک اور سمت دی۔

پورے کئے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیارا ہر اک غم کو سنوارا

حسن عابد نے درد و غم کی انھیں صحت مند روایات کو گرفت میں لیا اور اپنے مخصوص انداز میں اسے ایک نئی سمت دی۔ یہی نہیں قدم قدم پر وہ اپنے محبوب سے مخاطب بھی ہیں۔ ان کا محبوب محض ہجر و وصال کا محبوب نہیں ہے بلکہ رنج و غم میں برابر سے شریک ہے اور سفر در سفر ان کا ہم خیال بھی اور شاعر کو اس بات پر فخر بھی ہے۔

تم مری ہم خیال تھیں تو مرے ساتھ ساتھ تھیں
آج بھی دل میں سوچ کر فخر سا پا رہا ہوں

اس محبوب سے جب جدا ہوتے ہیں تو زندگی محبوب کا روپ لے لیتی ہے اور جب زندگی محبوبہ کا روپ لے لیتی ہے اور جب زندگی زخم زخم رسنے لگتی ہے تو محبوب کی آغوش میں آکر محبت کی نرمی اور کرختگی سے ایک نئی جنگ شروع کرتے ہیں۔ اس جدوجہد اور جنگ میں یہ تو ہوتا ہی ہے کہ زندگی کی نا جانے کتنی موجوں سے ٹکراتے ہیں اور پھر جیون موج جیسی معرکہ کی نظم وجود میں آتی ہے جس میں صبح، شام، رات سبھی سمٹ آتے ہیں۔ ان سب کے درمیان یار دوست، کافی ہاؤس، میر، غالب، پنڈت، سادھو عالم، فاضل، ملا سبھی آ

جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں نظم بڑی ہوتی جاتی ہے۔ زندگی کی اس کشاکش، تصادم اور جد و جہد میں محبت ہی غالب آتی ہے اور خواب در آتے ہیں۔

یہ شب و روز کا برنامہ
اس جیون موج کا تھا جس نے
اس چپنا ساگر میں آ کر
اک پریم کی ناؤ سجائی تھی

لیکن یہ سپنا سپنا تھا
اس جیون موج کی سوچوں کا
جو اس چپنا کے ساگر میں
خود ایک مہان کلیسا تھا
اک سندر سندر سپنا تھا

کوئی ان نظموں کو منفی انداز میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ بعض غزلیں بھی اس کی زد میں آ سکتی ہیں۔ لیکن شاعر تو شاعر ہے اور فلسفی تو فلسفی۔ شاعری کو دانشوری کی آنکڑوں میں فٹ کر کے دیکھا جانا مناسب نہیں ہوا کرتا۔ شاعری میں تخیل و وجدان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے اور شاعر کا پرواز تخیل کب کس وقت کس موڑ میں کیا رخ لے لے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ حسن عابد بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں لیکن ان کی یہ محبت محض گوشت پوست کی کسی ایک فرد کے ساتھ نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لئے ہے پوری کائنات سے ہے۔ وہ انسان اور انسانیت دونوں طرح کی محبتوں کو شیر و شکر کر دینا چاہتے ہیں اس لئے کبھی کبھی محبوب سے سرگوشی و رازداری کی بات کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو شاید ایک ترقی پسند نقطۂ نظر سے مناسب نہ لگے۔ لیکن ایک شاعر ہمہ وقت صرف ترقی پسند مفکر ہی نہیں ہوتا وہ عاشق بھی ہوتا ہے اور عاشق اپنے معشوق سے سچی محبت نہیں کر سکتا تو وہ دنیا سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ایک منزل وہ بھی آتی ہے جب عاشق صوفی اور درویش بھی ہو جاتا

ہے۔ حسن عابد میں اگر یہ درویشانہ وقلندرانہ جذبہ نہ ہوتا تو کیا ایسی غزلیں وہ کہہ پاتے۔

وہ خدا لوگ بندگانِ خدا — اور مجھے بندگی پسند نہیں
کیا کہوں زندگی کے بارے میں — مجھ کو یہ زندگی پسند نہیں
ڈوب مرتے ہیں لوگ عزت میں — پر مجھے خودکشی پسند نہیں
کیا زمانہ کہ اس زمانے میں — آدمی آدمی پسند نہیں

کبھی کبھی اس رنگ کے اشعار۔

آشفتگی جاں کے سوا اور کیا ملا
تجھ سے بچھڑ کے جانِ وفا اور کیا ملا
اک رنگ تھا کہ جس میں نہائے ہوئے تھے ہم
یہ رنگ جب چھٹا تو بھلا اور کیا ملا

اور یہ بھی تیور دیکھیے۔

ذرہ تیرہ کو ہم لولوئے تاباں کیوں کہیں
پتھروں کو جوہری لعل بدخشاں کیوں کہیں
جب چمن کی ہر روش پر خاک اڑتی ہو تو پھر
خار کو گل برگ سوزاں کو گلستاں کیوں کہیں

ان اشعار میں پوشیدہ سماجی اور سیاسی رمزیت کو بھی ملاحظہ کیجیے۔

بھیس میں شکرے کبوتر کے ہیں مسجد میں تمام
اب اسے دار الاماں ہم اہلِ ایماں کیوں کہیں
جن کے ہاتھوں خانہ بربادی کے سب ساماں ہوئے
ہم انھیں ٹوٹے ہوئے گھر کا نگہباں کیوں کہیں

ایک رنگ یہ بھی۔

کس قدر تیز جنگ جاری ہے
ہر طرف سے دھوئیں کا ابر محیط

اور بھی رنگ ہیں حسن عابد کی شاعری میں جو سچا ایمان، جاگتا پانی، کربلا، کوڑے، پیکار، کھ جاو غیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ان نظموں میں سچ اور جھوٹ، طاقت اور کمزور اور جابر اور مجبور وغیرہ کے درمیان کی ساری کیفیتیں نئے انداز اور نئے رخ سے جلوہ گر نظر آتی ہیں اور شاعر کا نقطۂ نظر بھی واضح کرتی ہیں۔ایک دو مصرعوں سے بھی ان کی وضاحت ہوتی ہے۔

ہم جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں

کربلا میرے بڑوں کی عظمت
جرأت انکار کا روشن پیکر

یہ مجمع میرا مجمع ہے
یہ نعرے میرے نعرے ہیں
جو باتیں جھوٹی ہوتی ہیں
ان باتوں سے انکار کرو

جنون آدم
شعور برہم
زمیں کے سیاہ ذرے
فضا میں اڑتے سیہ شرارے

کوئی سوچے تو بہ یہ کہہ سکتا ہے کہ حسن عابد کی شعری کائنات میں شعر وسخن کی جتنی شمعیں اور ترقی پسند فکر کی جتنی لویں ٹمٹمارہی ہیں ان میں نئی روشنی کیا ہے۔یا نیا پن کیا ہے۔جس کے زعم میں وہ خود بھی کہتے ہیں کہ میں نئے موسموں کا شاعر ہوں اور ممتاز نقاد محمد علی صدیقی نے بھی انھیں نئے موسموں کا شاعر کہا ہے۔کچھ مثالیں میں مضمون کی ابتدا میں دے چکا ہوں انھیں دہرانا نہیں چاہوں گا البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ شاعری یا زندگی میں سب کچھ اچانک نیا نیا سا ہو جائے ایسا ممکن نہیں۔شاعری میں تبدیلیاں زندگی کی طرح دبے پاؤں داخل ہوتی ہیں۔حساس وسنجیدہ شاعر انھیں اپنی فکر کی تازگی اور لب ولہجہ کی ندرت سے بھی

نیا پن پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی کی شاعری میں ماضی کا کرب حال کے مسائل میں مدغم ہو کر شاعری کا ایک نیا روپ لے رہا ہے، اگر صدیوں کے رنج و غم کسی ایک شاعر کے یہاں نئی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی آگہی عرفان ذات و کائنات کا روپ لے کر نشاطیہ کیفیت میں ڈھل رہی ہے تو پھر کچھ نہ کچھ نیا نیا سا تو ہوگا۔ شعر و سخن کی یہ وہ منزل ہے جو آسانی سے شاعر کے ہاتھ نہیں لگتی پھر کسی ایک مجموعہ کے ذریعہ تو یہ ممکن نہیں۔ اسی لئے سوچ نگر کے بعد جب ان کا دوسرا مجموعہ 'رنگ لایا ہے جنوں' منظر عام پر آتا ہے تو بہت بہت کچھ بدلا بدلا سا ہوتا ہے بقول قمر رئیس:

> ''حسن عابد کے پہلے مجموعہ سوچ نگر میں خوبصورت
> اور حیات بخش ماضی یادوں کے ریشمی پردوں سے جھ نکتا
> تھا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ماضی کی ساری
> توانائیوں کو مستقبل کی تعمیر میں صرف کر دیا۔ ان کی اپنی
> شناخت جو ماضی سے تھی اب حال بلکہ مستقبل کے گہوارہ
> میں نیا روپ اختیار کر چکی ہے۔''

اسی لئے 'سرگوشیاں'، 'نگارِ صبح'، 'ہچکیاں' جیسی خوبصورت نظمیں وجود میں آتی ہیں اور آگے بڑھ کر نثری نظم کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔

حسن عابد کے مکمل تخلیقی سفر کا جائزہ لینے کے لئے سنجیدگی اور گہرائی سے ان کے مسلسل شعری سفر کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون کا انحصار 'سوچ نگر' تک محدود ہے۔ یہ مضمون جائزہ کم خراج زیادہ ہے جو اپنے محبوب شاعر کو پیش کرنے کی غرض سے محبت میں لکھا گیا ہے تاکہ اس کی محفل میں شریک ہو سکوں جو ہمیشہ اپنی محفل میں شریک کرتا رہا ہے۔ اپنی محبت سے ہم سب کو گھائل کرتا رہا ہے۔

اس میں کچھ ہے جو بس اسی میں ہے
ہم تو کیا سب اسی کے گھائل ہیں

□□□

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

پروفیسر نیر مسعود یوں تو ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں لیکن جدید ادب میں ان کی شہرت ایک جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کے افسانوں کو لے کر اگر ایک حلقہ اپنی نافہمی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے تو دوسرا انھیں اس عہد کا سب سے منفرد مختلف اور بڑا افسانہ نگار ماننے اور منوانے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کا سیمینار تھا جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے نیر مسعود کی افسانہ نگاری پر ایک مقالہ پڑھا اور انھیں اس عہد کا بیحد اہم اور بڑا افسانہ نگار قرار دیا۔ اسی محفل میں افسانہ نگار ساجد رشید بھی موجود تھے، فوراً کھڑے ہوئے اور شدت سے اعتراض کرتے ہوئے بولے ''ایک مہمل اور ناقابل فہم افسانہ نگار کو آپ نے اس عہد کا سب سے بڑا افسانہ نگار ثابت کر دیا۔ یہ کام اردو کا ایک پروفیسر ہی کر سکتا ہے۔'' محفل کچھ بگڑی لیکن گوپی چند نارنگ کی وجہ سے سنبھل گئی۔ اس امر کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں جب بھی خود نیر مسعود سے گفتگو کی گئی یا کوئی انٹرویو لیا گیا وہ ہمیشہ گول مول باتیں کرتے۔ ٹال جاتے۔ آپ لوگ سمجھئے۔ مجھے تو جو کچھ لکھنا تھا لکھ گیا۔ کہیں یہ کہہ دیا کہ کہانیاں مجھے خواب میں آتی ہیں۔ جس طرح سے آتی ہیں میں اسی طرح لکھ دیتا ہوں۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

> ''میں موضوع کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کہانیاں مبہم ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہانی میں آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ اس کو چاہے میری کمزوری سمجھ لیجئے کہ موضوع بنا کر کہانی نہیں لکھ پاتا۔''

ایک جواب میں اور کہتے ہیں:

> ''میں جو لکھ رہا ہوں بس لکھ رہا ہوں۔ ارتقا سمجھیں یا

زوال۔ یہ تو قاری پر ہے۔ اگر قاری باذوق ہے تو اس کا
جو احساس ہوگا زیادہ صحیح ہوگا۔ میں نہ قاری کو خوش کرنے
کے لئے لکھتا ہوں نہ ناراض۔ میں اتنی چیزیں نہیں
سوچتا۔ افسانے میں پھر بھی دو تین تہیں ہو جاتی ہیں۔
اب اس کو زوال کہیے یا ارتقاء۔'' جولائی آجکل ۲۰۰۸ء

کل ملا کر یہ طے ہوا کہ نیر مسعود کے افسانوں میں پُراسرایت رہے۔ ایک گنجلک فضا ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت خود ان کی شخصیت میں ہے۔ اعتماد کی کمی رہتی ہے۔ اپنی پہلی کہانی کے بارے میں ایک انٹرویو کے جواب میں کہتے ہیں:

''ہاں اعتماد کی کمی ہے۔ نصرت جو میری پہلی کہانی
ہے تو ایک فرضی نام سے فاروقی صاحب کو دی۔ انھوں
نے پسند کی اور کہا کہ چھاپ دیں گے۔ مصنف کون ہے
پوچھا تو میں نے کہا پتہ نہیں 'زویانج' بتایا تو انھوں نے کہا
یہ تو پولینڈ کا سا نام ہے۔ لیکن پولینڈ کی کہانیوں کا انداز
نہیں ہے۔ تب میں نے بتایا کہ میں نے ہی لکھی ہے۔
شروع میں پہلی کہانی سے اعتماد کم تھا ڈر تھا کہ شاید اچھی
نہ ہو، فاروقی صاحب ناپسند نہ کریں تو اسے کہا کہ یہ
دوسرے کی لکھی ہے۔''

یہ کام نیر مسعود کرتے رہے ہیں۔ فاروقی صاحب بھی کرتے رہے ہیں۔ پتہ نہیں کس نے کس سے اثر لیا۔

خیر یہ باتیں ضمنی اور معمولی ہیں اور بہت پہلے کی ہیں۔ لیکن یہ بات تو آج بھی ہے کہ نیر مسعود کم بولتے ہیں، کم کھلتے ہیں۔ دھیرے دھیرے بولتے ہیں اور دھیرے دھیرے کھلتے ہیں۔ اسی لئے ان کو جرمن افسانہ نگار کا فن بہت پسند ہے۔ جن کے افسانوں کا ترجمہ بعنوان ''کافکا کے افسانے'' ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ جس کے مقدمے کی ابتدا ان

جملوں سے ہوتی ہے:

> ''۳؍جون ۱۹۲۴ء کو جب فرانز کافکا کی وفات ہوئی تو اسے کوئی بڑا ادبی سانحہ نہیں سمجھا گیا۔ وہ اس وقت تک جرمن کا ایک غیر معروف سا افسانہ نگار تھا جس کی تحریریں اپنے نہایت صاف بیانیہ انداز کے باوجود مفاہیم کیا عتبار سے ابہام کی حد تک مبہم تھیں..... اس وقت کافکا کو داستافیسکی کی طرح ادبیات میں پیچیدہ ترین دماغ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کی مذہبی، روحانی، صوفیانہ، فلسفیانہ، مابعد الطبعیاتی، سماجی، اخلاقی، نفسیاتی، جنسی تاویلیں کی جارہی ہیں اور اس کی تحریروں میں ہر تاویل کا جواز موجود ہے۔ خود کافکا ان تحریروں کو اپنی خواب نما باطنی زندگی کی عکاسی قرر دیتا ہے اور تاویلیں اب تک اس باطنی زندگی کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکی ہیں۔ اتنا وابستہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کافکا کی یہ باطنی زندگی اس کی ظاہری زندگی سے مختلف تھی۔''

اس حد تک تو نہیں لیکن نیر مسعود کی شخصیت میں بھی کئی قسم کے دھارے ملتے ہیں۔ شاید یہاں خارج اور باطن کے مسائل کم ہیں۔ تہذیب، ثقافت اور معاشرت کے زیادہ ہیں۔ سماج اور سیاست کے بھی ہوں گے کہ ان کے بغیر تو تہذیب بھی رنگ نہیں بدلتی۔ المیہ اور طربیہ بھی یہیں سے جنم لیتے ہیں۔ نیر مسعود کے یہاں ایک المیہ ہے تہذیب اودھ کے زوال کا۔ ایک طربیہ ہے اپنے خاندان کے کمال اور جلال کا۔ اور جمال ہے اردو، فارسی اور عربی کا ایران و عرب کا، قدیم و جدید کا۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ جدید افسانوں میں ہلچل مچانے والا یہ افسانہ نگار قدامت اور کلاسکیت سے کس قدر گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ داستانوں کے درمیان کتنی گہری اور لمبی سانسیں لیتا ہے۔ لکھنؤ پر جان دینے والا اور تہذیب

اودھ میں سانس لینے والے اس فنکار کا تعلق الہ آباد کی صوفیانہ تہذیب سے بھی رہا ہے۔ فارسی ادب میں اپنی معتبر شناخت رکھنے والے اس اسکالر نے اردو میں ڈی فل کی ہے۔ اور وہ بھی الہ آباد یونیورسٹی سے۔ ہے نا عجیب بات کہ ایم اے فارسی سے اور ڈی فل اردو سے اور وہ بھی ایسے ویسے پر نہیں رجب علی بیگ سرور پر۔ حیات اور کارناموں پر جس کا صرف نام لیتے ہی آج کے غیر مسرور طلبا کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں چہ جائکہ فسانہ عجائب کا مطالعہ۔ اس مقالے کے بارے میں خود نیر مسعود لکھتے ہیں:

> "نومبر ۱۹۵۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جناب مسیح الزماں کے زیر نگرانی میں نے مرزا رجب علی بیگ سرور اور ان کے قلمی آثار پر کام شروع کیا۔ ۱۹۶۴ء کے اواخر میں یہ تحقیقی مقالہ مکمل ہوا۔ اور دسمبر ۱۹۶۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اس پر ڈی فل کی سند دی۔ اب اسے الہ آباد یونیورسٹی میگزین کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔"

اس مقالے کی تکمیل میں سب سے زیادہ کارآمد معاونت نیر مسعود کے والد اور ممتاز ادیب و محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے کی۔ یہ اعتراف نیر صاحب کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کا ذخیرۂ کتب نیر صاحب کے لئے خزینۂ پُراسرار ثابت ہوا۔ وہ خزینہ جہاں سے سرور تو نکلے ہی کافور بھی نکلا۔ مینا بھی نکلی اور سیما بھی۔ اس لئے کہ وہ صرف ایک کتب خانہ نہ تھا بلکہ تہذیب کا خزینہ بھی تھا۔ اور گم ہوتی ہوئی تہذیب کا ایک ایسا دفینہ بھی کہ جہاں ثقافت و معاشرت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ یہ اکھڑی سانسیں نیر مسعود کو لرزا گئیں۔ یہی لرزش اور ارتعاش اپنے ایک مخصوص اسلوب اور رنگ میں نیر مسعود کے افسانوں میں لاشعوری طور پر ڈھل گئے۔ بس اس کرب اور رنگ کو پکڑنے کی ضرورت ہے کہ زوال کو کھلے عام پیش کرنا تہذیب انسانیت کے خلاف تو ہے ہی شاید تہذیب ادب کے خلاف بھی ہے۔ بہرحال یہ باتیں اختلافی ہوسکتی ہیں، اتفاقی بھی اور شاید امکانی بھی۔

نیر مسعود نے جب رجب علی بیگ سرور پر نہ صرف غیر معمولی مقالہ لکھا۔ سند؛ لی استاد ہوئے بلکہ فنکار بھی ہوئے۔ کہ نیر مسعود جیسی رنگ دار آبدار شخصیت محض تحقیق کے لیے نہیں بنی تھی۔ ان کے اندر ایک فنکار ہے۔ ایک مصور بھی۔ یہاں تک کہ ایک جلد ساز بھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ قیمتی کتابوں کی جلد سازی وہ خود کرتے ہیں۔ شادی کے دعوت ناموں کے رنگ برنگے ٹکڑوں سے سجاتے ہیں اور اپنی مخصوص تحریر و دستخط سے اسے ایک عجیب و غریب لیکن متاثر کن شکل دے دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی دستخط کو بغور دیکھا ہے انھیں اندازہ ہوگا ان کی دستخط دست + خط کم ہے ایسا زیادہ لگتا ہے خزینۂ ادب کے کسی کونے سے ایک مخمور کن کھجور رینگتا ہوا ان کی کتاب پر پھر ان کے نصاب پر اور سب سے آخر میں ان کے اعصاب پر اپنے پنجے گاڑ گیا ہے۔ ''سپردم بہ تو مایہ خویش را'' کے مصداق میں کبھی کبھی وہ خود بھی....

اب ذرا ان کی دوسری کتابیں مرثیہ خوانی کا فن، انیس وغیرہ پڑھیے۔ نیر مسعود کی ایک دوسری بھاری بھرکم عالمانہ، محققانہ اور نہ جانے کون کون سی آنہ کی تصویر ابھرتی ہے۔ کیا الگ تھلگ قسم کی کتابیں ہیں جس میں نیر تو جگمگا رہا ہے ادیبانہ خون بھی دوڑ رہا ہے اور وراثت بھی رقص کناں ہے۔ پورا اور پرانا لکھنؤ، تہذیب و تاریخ، مرثیہ، قصیدہ سبھی کچھ سمٹ آیا ہے۔ ایسی تہذیب، ایسی تحقیق کہ رشید حسن خان جیسے غیر معمولی کے محقق سر دھنتے تھے اور کہتے تھے کہ لکھنؤ اور نیر مسعود، نیر مسعود اور لکھنؤ ایک جان اور دو قالب ہو گئے۔ شرافت اور علم شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ لکھنؤ جاتے تو نیر مسعود کے ادبستان میں ٹھہرتے۔ دن میں نیر سے ملتے اور رات میں روح انیس کے خالق روح ادیب سے ملاقات ہوتی۔ مبادیات تحقیق پر بحث ہوتی۔ مسعود ادیب سید ضرور تھے لیکن تحقیق کے ضمن میں خان ہو جاتے اور ذرا بھی مروت نہ کرتے اور خاں صاحب دنیاوی معاملات میں تو ضرور خان تھے لیکن معاملات تحقیق میں ان کی سیادت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ جب تک مسعود ادیب زندہ رہے صحت مند رہے۔ لکھنؤ بھی زندہ رہا اور ادب بھی۔ رخصت ہوئے تو بہت سارے بار نیر مسعود کے کندھے پر چھوڑ گئے۔ لیکن نیر مسعود تو پیدائشی دبلے اور لمبے تھے پھر بھی وراثت

کو سنبھالا اور خوب سنبھالا۔ لیکن اب کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک خیال ہے کہ محض ان کی کمزوری کی وجہ سے لکھنؤ بھی کمزور ہو گیا ہے۔ لکڑی کے سہارے چل رہا ہے جیسے نیر مسعود چل رہے ہیں۔ لیکن میں تو دیکھ رہا ہوں کہ شارب رودولوی، محمود الحسن رضوی، عابد سہیل وغیرہ بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ لکھنؤ کو تو کمزور ہونا ہی تھا۔ کتاب، کہانی اور جوانی کا کیا ٹھکانہ۔ کب گلزار نسیم کے پھول کی طرح غائب ہو جائیں اور ہم کہہ اٹھیں۔

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

ہے! ہے! مرا پھول لے گیا کون　　ہے! ہے! مجھے خار دے گیا کون

اور یہ شعر بھی

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے　　جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

نیر مسعود تہذیب اودھ کے گل ہوتے ہوئے چراغ کی آخری لو ہیں۔ ایک پہچان اور ایک دبستان۔ ادبستان میں اتنا تو ہونا ہی تھا۔

عالم تو اور بھی ہیں لیکن نیر مسعود کی علمیت میں خاندانی شرافت، اودھ کی تہذیبی حلاوت، تاریخ و تہذیب کی حرارت، وراثت، محبت و شفقت اور سب سے آخر میں جدیدیت کا ایسا جادو چڑھ گیا ہے کہ وہ عام انسانوں اور پڑھنے والوں کی گرفت سے باہر ہو گئے ہیں اور سب جاہل ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند بالعموم اور الہ آباد والے بالخصوص۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جس کی علمیت و شخصیت میں اتنی جہت اور اس قدر وسعت ہے اس کے افسانوں میں ایسی پراسرایت کیوں؟ یہ مسائل بھی اتنی آسانی سے حل ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ نیر مسعود بھی نہیں چاہتے اور جدیدیت بھی نہیں چاہتی کہ یہ حل ہو جائیں۔ جیسے فسانۂ عجائب میں کہانی در کہانی الجھتی چلی جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ فن انھوں نے وہیں سے سیکھا ہو۔ بہر حال ان کے منفرد، ممتاز اور لائق فائق ہونے میں کسے شبہ۔

میں کئی ذاتی حوالوں سے ان کے قریب رہا ہوں۔ بباطن اتنا پیچیدہ دکھائی دینے والا بظاہر اس قدر سادہ، شفاف اور مہربان شخص ہے کہ آپ ان سے مل کر حیران ہو جائیں گے اور کبھی کبھی پریشان بھی۔ نیر مسعود کے استاد مسیح الزماں میرے بھی استاد رہے ہیں۔ نیر

مسعود کے والد پروفیسر مسعود ادیب نے میرے تحقیقی مقالے سے متعلق غیر معمولی رہنمائی فرمائی تھی۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اپنے مقالے سے متعلق تبادلہ خیال کر نے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کے گراں قدر مشورے بھی ملے ہیں۔ ان کے بھائیوں (انور مسعود، اظہر مسعود) سے بھی ملاقاتیں ہیں۔ اور بھی حوالے ہیں۔ نزدیکیاں ہیں، بس دوریاں ہیں تو نظریاتی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا احترام وعزت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ کوئی یہ بات سمجھ لے۔ سیکھ لے تو یہ غیر ضروری اور غیر اخلاقی محاذ آرائی سے کوسوں دور ہو جائے اور نیر مسعود کے قریب ہو جائے۔ اور نیر بھی سراج مبین کی طرح جگمگا اٹھے۔

میں ان کی خوبی صحت اور درازی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں کہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

❑❑❑

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

گزشتہ دنوں اردو دنیا سے کئی بڑے لوگ رخصت ہوئے۔ ان میں ایک نام پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا بھی ہے۔ جس دن لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا اسی دن کسی مخلص نے موبائل پر اطلاع دی جو انگریزی میں تھی، جملہ کچھ یوں تھا:

"Prof. Malik Zada is no more. He was hospitalized since few days. He is the foundation stone of compare of Mushaira."

ملک زادہ صاحب کی رحلت کا غم فطری تھا۔ ایک جھٹکا تو لگا دل و دماغ جب ندا فاضلی، زبیر رضوی، عابد سہیل کے بچھڑنے کا غم برداشت کر چکے تھے جن کی عمریں ملک زادہ سے کم تھیں تو ملک زادہ کی طویل عمر اور مہلک بیماری کا مجھے علم تھا اور ایک طرح سے میں اس خبر کو سننے کے لئے تیار ہی تھا۔ بہر حال تیس چالیس برس کے ماضی کے اوراق ایک دم سے پھڑ پھڑانے لگے کہ جب ہم لوگ نئے نئے میدان ادب میں داخل ہوئے تھے۔ مشاعرہ سننے کا جنون تھا۔ دور دور تک مشاعرہ سننے جاتے اس وقت مشاعرے کی دنیا میں انور مرزاپوری، فنا کانپوری، دل لکھنوی، بیکل اتساہی، خاموش غازی پوری، شمیم جے پوری، راز الہ آبادی، نذیر بنارسی وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ ملک زادہ صاحب کو بھی شہرت حاصل تھی یہ الگ بات ہے کہ ملک زادہ کی حیثیت شاعر کی کم مشاعرہ کے ناظم کی زیادہ تھی۔ ایک نئی روایت دنیائے مشاعرے میں قائم ہوئی تھی ورنہ اس سے قبل عام طور پر صدر مشاعرہ ہی شاعر کو مدعو کیا کرتا تھا جس میں تعارف کم ہوتا تھا تہذیب زیادہ ہوتی تھی، پھر یہ تعارفی انداز یا سلسلہ جیسے جیسے بڑھتا گیا تہذیب کا دامن تنگ ہوتا گیا۔ لیکن ملک زادہ صاحب کا انداز، اسلوب، عزت افزائی، خوردنوازی کے سلسلے غزل کے مصرعے لگتے تھے۔ تہذیب کے دریچے، اول تو وہ خود عمدہ شاعر تھے، دوئم یہ کہ وہ ایک پڑھے لکھے انسان تھے جو تہذیب شاعری سے لے کر تہذیب مشاعرہ کے ادب و آداب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اس کے

علاوہ بھی وہ بہت کچھ اور تھے جس پر میں ابھی گفتگو کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ باقاعدہ ایک اہم کام کے طور پر نظامتِ مشاعرہ کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور کس نے اس کی داغ بیل ڈالی لیکن ہم لوگوں نے جب مشاعرہ سننے شروع کیے تو ملک زادہ کی حکمرانی تھی کئی اعتبار سے۔ ہم ان سے بیحد متاثر تھے اکثر چھوٹی موٹی شعری نشستوں میں ہم ان کے ہی انداز کی نظامت کرتے۔ جب آگرے میں تھا تو دو ایک بڑے مشاعروں کی نظامت بھی کی۔ بہر حال عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ ملک زادہ نے ناظمِ مشاعرہ کے طور پر عالمی سطح پر ایک غیر معمولی شناخت قائم کی اور اسے ایک معیار و وقار اور فن کا درجہ دیا۔ دیکھیے ان کے بیٹے ملک زادہ جاوید نے ایوان اردو جون ۲۰۱۶ میں شامل ایک مضمون میں لکھا:

> ''خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اپنے کارناموں اور رویّوں سے عوام اور خواص کے دلوں میں اپنی ایک مستقل جگہ بنائی۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ اردو زبان کی نئی بستیوں تک مشاعروں کے حوالے سے پہنچے اور بیرون ممالک میں جا کر اپنی نظامت سے اردو عوام و خواص کو متاثر کیا۔'' (ص ۳۶)

آجکل جون ۲۰۱۶ میں بھی ملک زادہ پر کئی مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں سے ایک مضمون کا عنوان ہی ہے 'ناظم مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد' اور جو مجھے بعد موت انگریزی میں اطلاع ملی اس میں بھی مرحوم کو بانی ناظم مشاعرہ کہا گیا۔ مجھے ان القاب و آداب پر اعتراض تو نہیں کیونکہ میں خود بچاسوں مشاعروں میں ان کی پر وقار نظامت کے جوہر دیکھتا اور سنتا آیا ہوں، متاثر رہا ہوں اور کبھی کبھی تقلید بھی کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں ان کو قریب سے جانتا ہوں، ان کی صحبت میں ان کے دیگر علمی و ادبی کارناموں سے بھی واقف ہوں اور کم و بیش ان کی مکمل علمی و ادبی شخصیت سے واقف ہوں جن سے عوام تقریباً ناواقف ہیں، اس لئے مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ محض ناظم مشاعرہ تھے۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے، اردو کے پروفیسر تھے لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو کے استاد تھے۔ ایک

اچھے نثر نگار، ادیب و نقاد تھے۔ ایک بڑے دانشور اسکالر تھے اور بھی بہت کچھ تھے لیکن مشاعروں کی عوامی پسندیدگی اور عالمی مقبولیت نے ان کے ان اوصاف ومحاسن کو پس پشت ڈال دیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ مشاعروں کی بے مثال نظامت نے مشاعرے کی تہذیبی روایات کو تو بہت کچھ دیا لیکن انہیں مشاعروں نے ان سے بہت کچھ چھین بھی لیا۔ ایک بار لکھنؤ کی کسی محفل میں میں نے دبے الفاظ میں کہا کہ ''میں نے آپ کی ابوالکلام آزاد والی کتاب پڑھی ہے بہت عمدہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے کچھ نہیں لکھا۔''

بولے ''مشاعرے کی مصروفیات نے لکھنے نہیں دیا۔''

''اس سے تو آپ کو نقصان پہنچا۔'' میں نے عرض کیا۔

''ہاں ہو سکتا ہے کہ پہنچا ہو لیکن مشاعروں کو تو فائدہ پہنچا۔ مشاعروں کو عوامی مقبولیت دلوانے میں ہو سکتا ہے کہ اس خاکسار کی کوئی خدمت ہو۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے یہ غیر معمولی تاریخی کام انجام دیا لیکن ادب وتنقید کو تو نقصان پہنچا۔''

''دیکھیے فاطمی صاحب! ادب وتنقید میں جو کام میں نہیں کر سکا وہ تو آپ بھی کر سکتے ہیں لیکن جو کام میں کر گیا وہ شاید آپ نہیں کر سکتے۔ پھر بھی آپ کی بات سے مجھے زیادہ اختلاف نہیں۔''

میں احتراماً چپ ہو گیا۔ الہ آباد میں تھا، ان دنوں ریسرچ کر رہا تھا۔ ابن صفی کے ناول خوب پڑھتا تھا۔ نکہت ادارے میں آنا جانا تھا۔ وہیں پتہ چلا کہ اس ادارے سے بھی ملک زادہ کا تعلق تھا۔ جن دنوں تعلیم مکمل کر کے وہ بے روزگار تھے تو وہ الہ آباد آگئے تھے ادارۂ نکہت سے وابستہ ہو کر انھوں نے کئی ناول لکھے تھے۔ جن میں سے ایک کا ذکر خود ان کے بیٹے جاوید نے کیا ہے۔ 'کالج گرل' جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ملک زادہ انگریزی سے ایم۔اے۔ تھے۔ اور کئی سال شبلی کالج اعظم گڑھ میں انگریزی زبان وادب کے استاد بھی

رہے۔اس کے بعد اردو سے ایم.اے.اور پی.ایچ.ڈی.مکمل کی۔ابوالکلام آزاد پر ان کی عمدہ کتاب دراصل تحقیقی مقالہ ہی ہے۔جوانھوں نے پروفیسر محمودالٰہی صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔غرضکہ اعظم گڑھ، گورکھپور، الہ آباد، لکھنؤ کا خمیر، صوبائی وقصباتی تہذیب کے دلکش عناصر ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ وہ ساری دنیا کی سیر کرنے کے باوجود اپنی زبان، اپنی مشرقی تہذیب سے قطعاً الگ نہیں ہوئے تھے۔ان کی دلنواز شخصیت، ان کا طویل قد، شیروانی اور ٹوپی خود اپنے آپ میں ایک تہذیب تھی، ان کا گفتگو کا انداز، اسی تہذیب کی عطر بیزی کرتا تھا جس سے ہم معطر ہو جاتے تھے۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی.فل.کر کے سینٹ جانس کالج، آگرہ میں لکچرر ہو چکا تھا۔شعبہ میں طلباء کی تعداد بے حد کم تھی۔آگرہ جو کبھی اکبرآباد تھا اب متھرا کلچر میں ڈوب کر اردو زبان وادب سے بہت دور ہو چکا تھا۔میرے لئے درس وتدریس کو لے کر بڑی پریشانیاں تھیں۔یہ باتیں جب میں نے اردو اکادمی کے ایک جلسے میں رکھیں تو ملک زادہ صاحب نے کہا ماضی میں تمھارے کالج میں بڑے اچھے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔تم بھی ایک مشاعرہ کرواور اس روایت کو زندہ کرو۔تمھارے ہی کالج سے مجاز، جذبی، تاباں، آل احمد سرور وغیرہ پڑھ کر نکلے ہیں۔میں نے مشاعرہ کرنے کی ٹھانی اور ملک زادہ صاحب سے وعدہ لیا کہ وہ اس میں ضرور شرکت کریں گے اور دیگر شعرا کو مدعو کروانے میں بھی مدد کریں گے۔انھوں نے اس ضمن میں مدد تو کی اور لکھنؤ سے کئی شعراء کو بھیجا بھی لیکن وعدہ کرنے کے باوجود خود نہیں شرکت کر سکے۔کہیں اور کسی مشاعرے میں چلے گئے۔یہ بات مجھے بری بھی لگی۔بہرحال مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔جذبی، تاباں، شہریار، بشیر بدر، راز الہ آبادی، وغیرہ نے شرکت کی۔نظامت کے فرائض کمال جائسی نے نبھائے۔مشاعرہ کی کامیابی نے شعبۂ اردو کا بھرپور تعارف کرایا اور دوسرے سال سے ہی طلباء کی اچھی تعداد ہو گئی۔میں آگرہ میں تین سال رہا (1980-1983) ان تین سالوں میں دو قومی مشاعرے اور مذاکرے کرائے جو کامیاب رہے جس کی وجہ سے میں اپنے مقاصد میں بھی کامیاب رہا۔آگرے میں تین سال کے

قیام کے درمیان میں نے نظیر اکبر آبادی کو خوب پڑھا۔ ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں کو بھی جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ نظیر کی عوامی نظموں کا جادو اس قدر پر اثر اور دیرپا ہے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ لوگ اسی دائرے میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں، غزلوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہ کیفیت صرف نظیر کے ساتھ ہی نہیں اکبر اور اقبال کے ساتھ بھی ہے۔ آگرے کے قیام کے دوران میں نے دیوان نظیر کا وہ نایاب نسخہ بھی تلاش کیا جسے کبھی فرحت اللہ بیگ نے تلاش کر کے ترتیب دیا تھا۔ جواب نایاب ہے۔ میں نے اس نسخہ کو ممتاز محقق رشید حسن خاں کو دکھایا، وہ خوش ہوئے اور مشورہ دیا کہ تم پروفیسر محمود الہی سے ملو، جو ان دنوں اردو اکادمی کے چیئرمین تھے۔ اور ان سے اس کی اشاعت کی بات کرو۔ میں بھی ان سے بات کروں گا۔ چنانچہ خاں صاحب کی ہدایت کے مطابق میں محمود الٰہی صاحب سے ملا۔ محمود الٰہی صاحب یوں بھی مجھ سے شفقت فرماتے تھے اور آگرے کی نمائندگی کرنے کے لئے مجھے اکادمی کا ممبر بھی بنا رکھا تھا۔ محمود الٰہی صاحب نے دیوان نظیر دیکھا تو خوش ہوئے، وہ تحقیق کے مرد میداں تھے۔ دیوان کے بغور دیکھنے کے بعد کہا کہ ''اسے بہت پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شایع کیا تھا اس لئے اس کو شائع کرنے کا حق پہلے انجمن کو ہے، تم خلیق انجم سے بات کرو۔'' میں قدرے مایوس ہوا۔ مجھے مایوس دیکھ کر بولے ''اچھا تو تم یہ کرو کہ نظیر کی غزلوں کا ایک انتخاب کر دو اور اس پر ایک اچھا سا مقدمہ لکھو، میں اسے اکادمی کی طرف سے شائع کر دوں گا۔ میں خوش ہوا اور اکادمی کی طرف سے اطلاع نامہ یا اقرار نامہ کا انتظار کرنے لگا، کچھ ہی دنوں میں مجھے پتہ چلا کہ غزلیات نظیر اکبر آبادی کے انتخاب کی ذمہ داری پروفیسر ملک زادہ منظور صاحب کو دے دی گئی۔ میں حیران ہوا۔ میں نے ملک زادہ صاحب سے تو کوئی بات نہیں کی۔ البتہ محمود الٰہی صاحب سے ضرور گفتگو کی، وہ بولے بعد میں مجھے احساس ہوا کہ تم سے میں نثر کے مضامین کا انتخاب کرواؤں اس لئے یہ کام میں نے ملک زادہ صاحب کو سونپ دیا ہے۔ یہ بات مجھے ناگوار گزری لیکن صبر کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ ان دنوں محمود الٰہی صاحب کے ستارے بلند تھے اور ان کی شاگرد نوازی دور دور تک شہرت رکھتی تھی۔ میں

نے اس کی شکایت اپنے دوست مرحوم افغان اللہ سے کی تو انھوں نے میری دوستانہ دلجوئی میں بہت ساری باتیں کیں جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہوگا۔ جلد ہی مجھے انتخاب مضامین شرر کا دفتری پروانہ مل گیا اور میں بہل گیا۔ حالانکہ میں نے دیوان نظیر پر اچھا خاصہ ہوم ورک کرلیا تھا اور حضرت میکش اکبرآبادی کے تعاون سے غزلوں کا انتخاب بھی کرلیا تھا۔ ملک زادہ صاحب کا یہ انتخاب ۱۹۸۳ میں شائع ہوا۔ میرا خیال تھا کہ مشاعروں کی دنیا میں غرق ملک زادہ کو کب فرصت ملے گی یہ کام کرنے کی اور کسی طرح کر بھی گئے تو اس کا معیار کیا ہوگا خصوصاً معیارِ انتخاب۔ لیکن جب میں نے ان کا مقدمہ پڑھا تو حیران رہ گیا۔ تقریباً! پچیس صفحات پر مشتمل ایسا سجا ہوا پر مغز اور بلیغ مقدمہ میں ان دنوں تو کیا آج بھی نہیں لکھ سکتا۔ حالانہ آج میں اس مقدمے کو پھر سے پڑھتا ہوں تو اختلاف کے کئی پہلو نکل آتے ہیں اس لئے کہ غزلیاتِ نظیر کی بعض نزاکتوں اور منفرد اسلوب کو جس طرح میں دیکھتا ہوں ملک زادہ صاحب کے یہاں وہ عناصر نظر نہیں آئے۔ اس سے ملک زادہ کی کم علمی یا کم نگاہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ معاملہ زاویہ نظر کا ہے۔ وہ کلاسیکی مزاج کے شاعر و دانشور تھے۔ غزل کی تہذیبی روایت کے دلدادہ۔ انھوں نے اس کو مخصوص دہلوی سیاق و سباق میں جانچا پرکھا۔ محمد حسین آزاد کے آب حیات کے تناظر میں دیکھا۔ جبکہ میں ان تناظرات کے ساتھ ساتھ عوامی شاعری کی شعریات و جمالیات کو بھی شامل کر کے دیکھتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہماری شعری جمالیات و شعریات عشقیہ شاعری پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس میں عمومیت اور عوامیت کا دخل کم سے کم ہے۔ اسی لئے شیفتہ نے نظیر کو سوقیانہ شاعر کہا اور ان کی غزلیں بھی اسی لپیٹ میں آگئیں۔ ملک زادہ صاحب بھی اسی لپیٹ میں آگئے جس کا اعتراف ایک گفتگو میں مجھ سے کیا۔ یہ ان کا بڑکپن تھا۔

ایک بار لکھنؤ میں بی والی آسی کی دکان پر جوش ملیح آبادی کا ذکر نکلا۔ عرفان صدیقی جیسا نازک غزل کا شاعر جوش جیسے بلند آہنگ نظم کے شاعر کو کیا پسند کرتا۔ ملک زادہ صاحب جوش کی حمایت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ جوش اصلاً نظم کے شاعر ہیں انھیں لکھنوی غزل کے تناظر میں جانچنا مناسب نہیں۔ ملک زادہ صاحب نے یہ بھی کہا کہ جوش

کے یہاں پہلی بار ہندوستانی تشبیہات کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ جامن، پیپل، نم کولی، دونا وغیرہ یہ سب جوش کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ میں نے ادب سے کہا جوش کے یہاں یقیناً یہ سب کچھ ہیں لیکن پہلی بار ان زمینی و ہندوستانی تشبیہات کا استعمال نظیر کے یہاں ملتا ہے۔ جوش کے یہاں تو نظموں میں ہے لیکن نظیر نے تو غزلوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور پھر میں نے ہمت کر کے کہا ''آپ نے تو نظیر کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے اسے دیکھا ہوگا۔ لیکن واہ رے ملک زادہ، میرے قریب آئے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے بولے ''بھائی میں اس پہلو کو نظر انداز کر گیا۔ یہ تو ایک اچھا موضوع ہے تم تو آگرے میں رہے ہو نظیر پر کام کیا ہے کیوں نہیں لکھتے، بہت اچھا کام ہوگا۔'' ملک زادہ صاحب کا شفقت بھرا وہ لمس، پیار بھرا انداز میں آج تک نہیں بھولا ہوں، اسی طرح محمود الٰہی نے جب انتخاب شرر شائع کیا اور شاباشی دی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ سب بڑے لوگ تھے چھوٹوں کی محنت اور کامیابی سے خوش ہوتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اب تو لوگوں نے خوش ہونا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اردو کے پروفیسروں نے بطور خاص۔ جیسے ان کو ذہنی قبض ہو گیا ہے۔ اسی لئے ان کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آپاتی۔ ملک زادہ، محمود الٰہی، شبیہ الحسن، عابد سہیل یہ سب مسکراتے ہوئے لوگ تھے۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ 1990 اور 2010 کے درمیان اردو میں متعدد عمدہ خود نوشت سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ جن پر تبصرے، تذکرے بھی ہوتے رہے، انھیں دنوں ملک زادہ صاحب نے بتایا کہ وہ بھی اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ کچھ قسطیں شائع بھی ہوئیں۔ میں نے ان دنوں بعض اہم سوانح عمریوں کو پڑھا اور بعض پر لکھا بھی۔ چنانچہ میں نے ملک زادہ صاحب سے عرض کیا کہ جب کتاب آجائے تو ایک نسخہ ضرور عنایت کیجئے گا۔ اور وہی ہوا جب 2004 میں بڑے اہتمام و احتشام کے ساتھ ان کی آپ بیتی بعنوان رقص شرر شائع ہوئی تو پوری اردو دنیا میں اس کا بھرپور استقبال ہوا۔ استقبال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک زادہ صاحب کھرے عالم نہ تھے بلکہ عالم باعمل تھے۔ ساری اردو دنیا اس کی دسترس میں تھی۔ بے پناہ مشاہدات و تجربات تھے مشاعرے کی دنیا کے بطور خاص۔ ایسے

انسان کی آپ بیتی زیادہ باعمل و بااثر ہوا کرتی ہے۔ جو انسان صرف کتابوں میں ڈوبا رہتا ہے وہ کتاب تو لکھ سکتا ہے لیکن حیات نہیں۔ دماغ کی بات تو کر سکتا ہے دل کی بات نہیں۔ جبکہ نظیر اکبرآبادی کا کہنا ہے

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

'رقص شرر' شائع ہوئی اور خوب مقبول ہوئی۔ ملک زادہ صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ کتاب آ گئی ہے بھیجوں یا تم لکھنؤ آؤ گے۔ میں نے لکھنؤ آنے کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ جلد ہی لکھنؤ کا سفر ہوا اور ملاقات ہوئی تو کتاب ہاتھ آئی۔ میں نے پہلی فرصت میں پوری کتاب پڑھ ڈالی اور نوٹس بناتا رہا۔ کئی سوالات بھی قائم ہوئے۔ سب سے پہلا سوال تو عنوان کو لے کر ہی تھا کہ اس کا نام رقص شرر کیوں ہے۔ اس عنوان کے کیا معنی نکلتے ہیں۔ اور میں نے لکھنؤ جا کر دانش محل میں بیٹھ کر کئی سوالات اور خیالات داغ دیئے۔ رقص شرر کے عنوان کے بارے میں ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ نام انھیں شاعرانہ لگا، اچھا لگا بس اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں۔ ان کی سادگی اچھی لگی اور مجھے بھی احساس ہوا کہ ملک زادہ بنیادی طور پر شاعر ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری کم پڑھی اور سنی گئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے یہاں شرر، شعلہ، شرر باری، گردشِ ماہ و سال، دیر و حرم، حکایات خونچکاں، مقتل جاں وغیرہ کی لفظیات ان کے اس کلاسیکی مزاج کی نشاندہی کرتی ہیں جو قدیم غزلیہ شاعری کی تہذیب و تحریم ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا شاگرد، گورکھپور اور اعظم گڑھ کا باسی اور لکھنؤ کا نواسی تمام تر ترقی پسندی اور روشن خیالی کے باوجود اپنی محبوب روایات سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکا۔ رقص شرر کا عنوان صرف ایک اتفاقی عنوان نہ تھا۔ بلکہ ان کی مزاجی کیفیت کا ترجمان تھا۔ جب یہ بات میں نے ان سے کہی تو بڑے پیار سے بولے "یہ سب میں نے شعوری طور پر نہیں کیا۔ لاشعوری طور پر ایسا ہو گیا۔" "ادب میں الفاظ، جذبات اور دونوں کا برملا تخلیقی اظہار اکثر لاشعوری ہی ہوتا ہے۔" میں نے عرض کیا۔ لیکن میرے اگلے الزامات سے وہ اتفاق نہ کر سکے۔ جب میں نے یہ کہا کہ "آپ کی یہ کتاب

آپ بیتی تو ہے لیکن اس سے زیادہ یادداشتیں ہیں۔، واقعہ نگاری ہے اور کہیں کہیں شخصیت نگاری بھی۔ دوسروں کا ذکر زیادہ ہے آپ اپنا ذکر وہیں کرتے ہیں جہاں آباو اجداد کا ذکر ہے، تعلیم وتربیت کا ذکر ہے۔ انعامات واعزازات، ضیافت اور پذیرائی کا ذکر ہے۔ لیکن اس سے تو آپ بیتی نہیں بنتی۔" وہ چونکے پھر بولے " بھائی فاطمی میاں آپ بیتی تو یادداشتوں کی بنیاد پر ہی لکھی جاتی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ محض یادداشتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنا ذکر کب تک اور کہاں تک کریں گے اپنے عہد واحباب کا ذکر تو آئے گا ہی۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی ترشی تھی جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پا رہی تھی۔ مجھے ان کی بزرگی اور سنجیدگی کا خیال آیا تو میں نے بھی پوری سنجیدگی سے عرض کیا۔ " آپ بیتی لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ بیتی کو محض واقعات وکردار کی کھتونی بنا دینا ہی اچھا کام نہیں۔ ایک عمدہ انسان اور کامیاب شاعر وادیب کی زندگی میں سیکڑوں ہزاروں انسان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ان سب کی بھیڑ لگانا آپ بیتی نہیں۔ ان واقعات میں سے کون سا واقعہ، کون سا کردار، کون سی کتاب آپ کے دل ودماغ کو متاثر کرتے ہیں، آپ کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں قلب ماہیت کرتے ہیں سوانح نگار ان کا انتخاب کرتا ہے۔ اس موڑ اور اس راہ کا ذکر کرتا ہے جس پر چل کر وہ آج اس منزل تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ خارج سے زیادہ باطن کی بات کرتا ہے۔ اندرون کی خوابیدہ وپوشیدہ آرزوؤں و تمناؤں کا ذکر کرتا ہے جو پوری ہوئیں یا پوری ہونے سے رہ گئیں۔ حیات وکائنات کا تجربہ وفلسفہ پیش کرتا ہے محض واقعہ نہیں۔"

وہ اپنی ٹھڈی پر ہاتھ رکھے ایک معصوم وسنجیدہ طالب علم کی طرح مجھ حقیر کی گفتگو سنتے رہے اور جب میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک شخص جہاں میں ورق ناخواندہ

ایک اچھی آپ بیتی ورق ناخواندہ کو خواندہ میں بدلتی ہے اور بقول ساحر ؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

آپ بیتی میں لوٹایا ہی نہیں جاتا بلکہ ہم سفر اور ہم نظر بھی بنایا جاتا ہے۔ آپ کی کتاب بیحد عمدہ، پر لطف اور معلوماتی تو ہے لیکن ان سب میں خارجیت زیادہ ہے داخلیت کم، حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھیں مقدمہ لکھنے میں اتنی دشواری پیش نہیں آئی جتنی کہ یادگار غالب اور حیات جاوید لکھنے میں۔ جبکہ حالی اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی سوانح لکھ رہے تھے۔'' میں کچھ اور بولتا اس لئے کہ پورا ہوم ورک کر کے گیا تھا لیکن مجھے لگا کہ ملک زادہ صاحب بے کیف ہو رہے ہیں، اسی بے کیفی میں وہ بولے ''تو پھر اس کتاب کو آپ کس خانے میں رکھیں گے۔'' میں نے پورے احترام واخلاص سے کہا ''ضروری نہیں کہ ہر کتاب کی خانہ بندی کر دی جائے۔ آخر آب حیات کو آپ کس خانے میں رکھیں گے۔ سجاد ظہیر کی روشنائی کو کہاں فٹ کریں گے۔ کتاب اچھی ہے تو سب کچھ اچھا ہے۔ اور آپ کی کتاب اچھی ہے۔'' ملک زادہ صاحب مزید الجھتے ہوئے بولے ''تو پھر آپ کا اعتراض کیا ہے'' میرا اعتراض تو نہیں بس ایک خیال ہے اس لئے کہ آپ نے سرورق پر ہی عنوان کے ٹھیک نیچے خود نوشت لکھ دیا ہے اور اب نئی تنقید نے جس طرح غیر افسانوی ادب، جس میں خود نوشت سوانح عمری بھی شامل ہے اس کی جو تعریف کی ہے اس پر گفتگو تو ضروری ہے۔ بس میں نے گفتگو ہی کی ہے ورنہ کتاب کا دائرۂ عمل اس قدر وسیع ہے اور اس کی مدت اتنی طویل ہے کہ پوری ایک تاریخ، تہذیب اور عہد کو سمیٹ لیا ہے۔ آپ نے اپنی ذات سے ہٹ کر بہت سارے سماجی، تہذیبی اور سیاسی مسائل بھی اٹھائے ہیں خاص طور پر اردو کے مسائل جو اکثر اردو کے پروفیسروں کے یہاں ندارد رہتے ہیں۔ وہ اس کو کوئی مسئلہ ہی نہیں سمجھتے۔ میں نے سوچا کہ گفتگو میں توازن لایا جائے اور میری یہ کوشش کارگر بھی ہوئی۔ بولے ''اس مسئلہ پر میں نے اس کتاب میں آپ کا بھی ایک خط شائع کیا ہے آپ نے بڑی بے باکی سے اس کانفرنس کے بارے میں لکھا تھا اسی لئے میں نے اس خط کو کتاب میں شامل کیا۔''

''اس گفتگو کو بھی بے باکی پر محمول کیجئے اور دل کی کتاب میں نوٹ کر لیجئے۔'' وہ مسکرائے بھائی تم لوگ تنقید لکھتے ہو، آسمان پر اڑتے ہو، میں تو زمین کا آدمی ہوں، عام

آدمی کا شاعر ہوں، مشاعرے کا شاعر ہوں۔''

''میں بھی زمین کا آدمی ہوں، ترقی پسند ادیب ہوں تبھی تو نظیر کو پسند کرتا ہوں اور آپ کو بھی۔ میں آپ کی خدمات کو کسی بڑے نقاد کی علمی خدمات سے زیادہ بہتر مانتا ہوں۔ آپ نے جس طرح اردو شاعری کو عوام کی سطح پر مقبول کیا اور اب رابطہ کمیٹی کے ذریعہ اردو زبان کی خدمات انجام دے رہے ہیں اردو کا کون پروفیسر یہ کام کر رہا ہے۔ اسی لکھنؤ میں آپ نے اردو زبان کے مسائل کو لے کر اتنی بڑی کانفرنس کی۔ بیچارے رام لعل نے آپ کی مدد کی لیکن لکھنؤ کا کوئی پروفیسر جو سب آپ کے دوست ہیں کس نے آپ کا ساتھ دیا، شرکت تک نہیں کی۔''

''یہ سوال آپ نے اپنے خط میں اٹھایا ہے۔ چھوڑیئے، جانے دیجیے سب اپنے احباب ہیں۔'' وہ جز بز ہوئے۔

میں نے محسوس کیا وہ بات کو بدلنا چاہ رہے ہیں کہ ذکر دوستوں کا نکل پڑا ہے میں نے بھی رخ بدل دیا اس لئے کہ یہ سب میرے بھی دوست ہیں۔ بزرگ دوست۔ لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ ملک زادہ ان معنوں میں خوش ہوئے کہ اس طرز پر ان کی کتاب پر کسی نے گفتگو نہیں کی۔ سب تعریف ہی کرتے رہے بعض نے بغیر پڑھے ہی تعریف کی۔ اردو میں کذب ومکر کی یہ روایت بہت قدیم ہے۔ جو آج بھی بڑے اہتمام سے جاری وساری ہے۔

بات اردو کانفرنس یا رابطہ کمیٹی کی نکل آئی ہے تو اس سلسلے میں اتنا ہی عرض کرتا چلوں جو میری براہ راست ملک زادہ صاحب سے گفتگو ہوئی جب وہ اکادمی یا فخر الدین کمیٹی کے صدر یا چیئرمین تھے۔ رابطہ کمیٹی کی کوششوں کو وہ بہت کامیاب نہیں بنا سکے اردو والوں کی بے حسی آڑے آئی جس کا شکوہ انھیں تھا لیکن وہ بڑے صبر وتحمل کے انسان تھے۔ اپنے دل کا درد اور دوستوں کے دیئے ہوئے زخموں کا ذکر نہ کے برابر کرتے۔

ایک بار لکھنؤ گیا تو میرے دوست اور ممتاز فکشن نگار غضنفر ان دنوں لکھنؤ میں ہی تھے۔ پتہ چلا کہ ملک زادہ صاحب کے گھر پر ایک نشست ہے جس میں غضنفر افسانہ پڑھیں

گے۔ میں ان کے نئے گھر سے واقف نہ تھا، جب وہ نخاس میں رہتے تھے تو اکثر جانا ہوتا تھا بہر حال میں غضنفر کے ساتھ اندرا نگر والے گھر پہنچا تو مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

''بھائی آپ خوب آئے اب تو محفل خوب جمے گی۔ غضنفر آپ کے دوست ہیں، آپ ہی ان کا تعارف کرائیے گا۔'' اور میں نے تعارف کرایا ایک ایک چیز بتائی اور ان کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے نئے افسانے کے رجحانات پر بھی گفتگو کی۔ چائے کا دور کا چلا، وہ خوش ہوتے رہے کہ ان کے گھر پر چند فکشن لکھنے والے فکشن پر نظر رکھنے والے موجود تھے۔ انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ اردو کے نئے فکشن سے زیادہ واقف نہیں۔ یوں بھی وہ شاعری کی دنیا کے ملک زادہ تھے بلکہ شہنشاہ، لیکن نئے لوگوں، افسانہ نگاروں سے ان کی محبت و شفقت قابل دید تھی۔ حالانکہ انھوں نے خود بھی ناول لکھا لیکن ایک خیال ہے کہ وہ ناول نگاری کا رومانی دور تھا، روایتی بھی لیکن اب فکشن اور خاص طور پر نیا فکشن بہت آگے نکل چکا ہے۔ اس سفر میں دوسرے دن ہم پھر ملے۔ مقام یاد نہیں لیکن گفتگو ضرور یاد ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی جرأت و ہمت کو سمیٹتے ہوئے کہا تھا'' آپ ان دنوں اکادمی کے چیئرمین ہیں اور اکادمی بالکل خاموش ایسا کیوں؟''

''کوئی بجٹ ہی نہیں ہے، کوئی سنتا بھی نہیں، کسی کو دلچسپی بھی نہیں ہے، بڑا بُرا حال ہے۔''

''تو پھر آپ احتجاجاً اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ بلا وجہ کیوں چیئرمین کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔'' میں نے عرض کیا۔

''بھائی گاڑی تو ٹلی ہوئی ہے۔ اکادمی کا کام ہو یا نہ ہو ان کا کام تو چل رہا ہے۔''

ایک افسانہ نگار نے طنز کیا لیکن ملک زادہ صاحب ناراض نہیں ہوئے بلکہ پورے تحمل کے ساتھ کہا'' کئی بار سوچا کہ استعفیٰ دے دوں ضمیر پر ایک بوجھ سا ہے۔ لیکن بعض احباب نے روک بھی رکھا ہے۔''

''جو احباب اس طرح کے مشورے دے رہے ہیں، وہ احباب نہیں ہیں۔ آپ کو خود سوچنا چاہئے کہ اردو کی اتنی بڑی تحریک چلانے والا ملک زادہ آج اردو کے ایک

ادارے میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔" میری یہ بات بھی تلخ تھی لیکن اس کو بھی خاموشی سے سنا اور اعتراف کیا۔ "ہاں میری یہ غلطی ہے لیکن فاطمی میاں کچھ مروتیں ہیں مجھ سے بے مروتی نہیں ہوتی، کچھ معاملات میں میں کمزور واقع ہوا ہوں۔"

"میرے تعلق سے آپ نے کبھی مروت نہیں کی۔ آگرے کے مشاعرے میں بلایا آپ نہیں آئے۔ الہ آباد کی تقریبات میں بلایا نہیں آئے۔ ابھی حال میں وامق جونپوری سے متعلق مذاکرے اور مشاعرے میں بلایا اور آپ نے آنے کا وعدہ بھی کیا لیکن نہیں آئے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمھارا گنہ گار ہوں، تم نے کئی بار یاد کیا لیکن میں کہیں نہ کہیں پھنستا چلا گیا۔ بھائی میں تم سے واقعی شرمندہ ہوں۔" وہ بچوں کی طرح صفائی دیتے رہے اور مجھے یہ احساس شرمندہ کرتا رہا کہ باپ کی عمر کے ملک زادہ بچے کی طرح معصوم لگ رہے تھے۔ وہ ایک عمدہ شاعر اور اچھے اسکالر کے ساتھ ساتھ سادہ لوح انسان تھے۔ کہیں کہیں کمزور انسان بھی۔ گھریلو معاملات میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مشاعرے کی زندگی اور سیاسی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوریاں رہیں لیکن میں سمجھتا ہوں ان کمزوریوں میں مروت و شرافت کا دخل زیادہ تھا۔ سیاست و مصلحت کم۔ آج لوگ اسی مروت، محبت اور شرافت کو زیادہ یاد کر رہے ہیں اس لئے کہ یہ چیزیں دیرپا ہوا کرتی ہیں۔ یوں بھی بڑے سے بڑا انسان، کمزور انسان بھی ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان ہے فرشتہ نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ انسان بنا رہے کیونکہ انسانیت کا رشتہ انسان سے ہی ہوتا ہے آدمی سے نہیں۔ غالب نے کہا تھا؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ملک زادہ تو صرف انسان نہیں اچھے انسان تھے۔ کچھ معاملات میں بے نیاز، فقیر اور درویش۔ ان کی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد دوسری بار 1978 میں شائع ہوئی تھی۔ میں ذاتی طور پر اسے آزاد پر لکھی گئی چند اچھی کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔ آج وہ کتاب بازار میں نہیں ہے۔ نایاب ہے، لیکن ملک زادہ صاحب نے اتنی اچھی کتاب کو از سر نو شائع

کروانے کی فکر نہیں کی۔ تھوڑی قلندری، زیادہ مصروفیت ان کی زندگی میں ایسی سایہ فگن رہی کہ انھوں نے اپنا تنقیدی سفر قربان کر دیا۔ ورنہ ان کے اندر ایک بے حد اچھے نثر نگار، ناقد و محقق ہونے کے پورے آثار تھے اور وہ تھے بھی جب جب مواقع ملے انھوں نے اپنے جوہر دکھائے بھی لیکن افسوس کہ تقریباً ۶۵ سالہ ادبی سفر میں وہ صرف دو اہم کتابیں ابوالکلام آزاد اور رقص شرر ہی دے پائے۔ کچھ اور ترتیبی کام۔ کچھ شعری مجموعے بھی لیکن وہ ان کی شہرت نظامت کے آگے پس منظر میں چلے گئے۔ آج کل کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے اپنے اداریے میں لکھا ہے:

> ''ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ناظم مشاعرہ اور شاعر۔ سرسری طور پر اگر دیکھیں تو وہ دونوں حیثیتوں میں کامیاب ہیں۔ لیکن یہ صرف کہنے کی بات ہے اور مرحوم شاعر ملک زادہ منظور کے تئیں ایک رعایت ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے اندر کی غالب شخصیت ناظم مشاعرہ نے ان کے اندر کی دیگر تمام حیثیتوں بشمول شاعر نگل گیا تھا یا دبا دیا تھا۔''

(اداریہ آج کل جون 2016 ص4)

جب ان کی شاعری کے بارے میں عام رائے یہ ہے تو چہ جائیکہ نثر نگاری۔ وہ ایک بہت اچھے نثر نگار، ناقد اور محقق تھے لیکن مشاعرے کی عوامی مقبولیت، شہرت، دولت اور مصروفیت نے انھیں مہلت ہی نہ دی۔ اور یہ راستہ تو انھوں نے خود ہی چنا تھا۔ اس کا وہ اعتراف بھی کرتے تھے۔ لیکن جو کام وہ کر گئے اس سے وہ مطمئن بھی تھے اور کہتے تھے کہ یہ کام کوئی دوسرا ادیب و ناقد نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہ سچ ہو۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے یہ قلق رہا اس لئے کہ مجھے یہ احساس تھا کہ مشاعرے کے نظامت میں فنکاری تو ہو سکتی ہے لیکن دانشوری کے امکانات کم سے کم، خصوصاً آج کے مشاعرے۔ اس کا ملک زادہ صاحب کو بھی قلق تھا کہ آج کے مشاعرے کے مقابلے بہت بدل گئے ہیں کچھ زیادہ ہی کمرشیئل ہو گئے ہیں۔

ایک بار لکھنؤ کی کسی تنظیم نے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی یاد میں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا۔ مجھے بھی الہ آباد سے بلایا گیا۔ میں لکھنؤ پہنچا تو جلسہ پریس کلب میں تھا۔ پورے جلسے میں صرف ۲۰۔۲۵ لوگ ہی تھے۔ ملک زادہ صاحب صدارت کر رہے تھے، مجھ سے رہا نہ گیا میں نے اپنی تقریر میں کہہ دیا کہ جس ادیب نے لکھنؤ میں پچاس سال تک حکومت کی ہو آج اس کے یادگاری جلسہ میں پچاس لوگ بھی نہیں۔ تقریر اچھی ہوگئی تھی۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پہلے تو ملک زادہ صاحب نے میری تعریف کی، کھلے دل سے تعریف کی اس کے بعد لکھنؤ، والیان لکھنؤ اور نورالحسن ہاشمی کی علمی و ادبی خدمات پر غیر معمولی تقریر کی جس میں حقیقت کے ساتھ عزت و عقیدت بھی شامل تھی۔ اسی طرح سے جب وہ مجنوں گورکھپوری، یہاں تک کہ محمود الٰہی کا ذکر کرتے تو ایک خاص قسم کا اخلاق واحترام ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگتا۔ اس کا اظہار ان کی کتاب رقص شرر میں بھی ہوا ہے۔

باتیں تو اور بھی ہیں، ملاقاتیں بھی اور، لیکن قصہ مختصر کرتے ہوئے بلاشبہ یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اپنی غیر معمولی عوامی مقبولیت کے باوجود انھوں نے کبھی تہذیب، سنجیدگی اور معیار کا دامن نہیں چھوڑا۔ اردو زبان، اردو تہذیب سے ان کا پیار، جذباتی وابستگی غیر معمولی تھی۔ اردو مشاعرہ، اردو رابطہ، اردو جلسہ نے انھیں سر سے پیر تک اردو بنا دیا تھا۔ وہ سراپا اردو تہذیب تھے۔ ان سے ملئے تو لگتا تھا کہ ہم اردو شاعری کے محبوب سے مل رہے ہیں۔ پرانی تہذیب کے پروردہ، تربیت یافتہ کسی عاشق سے مل رہے ہیں۔ مشاعرے اب بھی ہوتے ہیں، ناظم مشاعرہ بھی ایک سے ایک ہیں، لیکن ملک زادہ اپنے فن کے موجد تھے اور خاتم بھی۔ ان کے چلے جانے سے اردو مشاعرے اور اردو تہذیب کا ایک دور رخصت ہوگیا۔ جگر کے شعر پر مضمون ختم کرتا ہوں۔

جان کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

□□□

یوسف سرمست: چند یادیں۔ چند باتیں

یادش بخیر! یہ ۱۹۷۵ء کے آس پاس کی بات ہے جب میں تازہ تازہ ایم.اے. (اردو) پاس کر کے نکلا تھا اور پی.ایچ.ڈی. کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی داخلہ کمیٹی نے جب مجھے "عبدالحلیم شرر: بحیثیت ناول نگار" کا موضوع برائے تحقیق تجویز کیا تو میرے سامنے تحقیق کی دنیا بالکل کوری بلکہ اندھیری تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سناپسس (Synopsis) کیا چیز ہوتی ہے۔ خیر یہ مسئلہ تو استاذی پروفیسر سید محمد عقیل نے حل کیا اور موضوع کو ابواب میں تقسیم کیا۔ ابواب کی تقسیم سے ظاہری صورت کچھ واضح ضرور ہوئی لیکن یہ مسئلہ تو ہنوز برقرار تھا کہ ان ابواب کو کیسے سمجھا اور کس طرح لکھا جائے گا۔ استاد محترم سید محمد عقیل صاحب بڑے نقاد ضرور تھے اور ان کی نگرانی میں ڈیڑھ دو درجن تحقیقی مقالے ضرور لکھے جا چکے تھے لیکن وہ بنیادی طور پر شعر و شاعری کے نقاد ہیں اور شعریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اور تقریباً سارے تحقیقی مقالات کا تعلق بھی شاعری سے ہی تھا۔ غالباً پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ مجھے اور میرے ساتھ دو اور ساتھیوں (فخرالکریم اور محمد اشتیاق) کو فکشن سے متعلق موضوعات دیئے گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے یہ احباب بھی ابتدا میری طرح کچھ پریشان سے تھے۔ ٹھیک انھیں پریشانیوں کے دنوں میں الہ آباد سے باہر جن دو بڑے نقادوں نے ہم لوگوں کی بالخصوص میری دل سے، دماغ سے رہنمائی کی ان میں پہلے پروفیسر قمر رئیس تھے، دوسرے پروفیسر یوسف سرمست تھے۔ وارث علوی بھی فکشن سے متعلق بہت لکھ رہے تھے لیکن اس وقت تک ان کے مضامین زیادہ تھے۔ پھر اس زمانے میں جدیدیت کا کچھ ایسا زور بلکہ شور تھا کہ اس بے ہنگم شور میں ہم نوجوان کیا سوچ پاتے کیا سمجھ پاتے۔ ویسے بھی ہم ترقی پسند حلقے سے وابستہ ہو چکے تھے۔ وارث علوی بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمارے حلقے سے باہر کے ہیں، بعد کے برسوں میں یہ بات غلط ثابت ہوئی اور ہمارے ان سے بھی عمدہ تعلقات قائم

ہوئے اور ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا، سمجھا۔ تو اس وقت فکشن کی تحقیق وتنقید کی رو سے قمر رئیس اور یوسف سرمست۔ قمر صاحب کی پریم چند سے متعلق کتاب اور یوسف سرمست کی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء) کے ان دنوں بڑے چرچے تھے۔ قمر رئیس دہلی میں قریب تھے اور بیحد فعال و متحرک تھے۔ اس لئے ان سے جلدی جلدی ملاقاتیں ہوئیں۔ انھیں دنوں قمر رئیس صاحب نے اپنی ذاتی لائبریری سے یوسف سرمست کی کتاب مجھے دی جو میں نے ان کو واپس نہیں کی۔ حالانکہ میں نے بعد میں لکھنؤ سے خریدی، پڑھی اور یہ کتاب مجھے اس قدر پسند آئی کہ اب تک اس کے جتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں وہ سب کے سب میرے پاس موجود ہیں۔ یہ میری کمزوری رہی ہے کہ جو کتاب مجھے ضرورت سے زیادہ پسند آتی ہے اس کے پرانے نئے بھی ایڈیشن جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری انھیں مجنونانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ قمر رئیس کی پریم چند والی کتاب، سجاد ظہیر کی روشنائی، علی سردار جعفری کی ترقی پسند ادب، لکھنؤ کی پانچ راتیں، وارث علوی کی تقریباً تمام پرانی و نئی کتابیں، احتشام حسین و محمد حسن کی تقریباً تمام کتابیں، فراق گورکھپوری کی کتاب ''اردو کی عشقیہ شاعری'' کا پرانا و نیا ایڈیشن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ میرے پاس موجود و محفوظ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں قاری کی پسند و ناپسند بہر حال کام کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پسندیدہ کتابوں کے علاوہ ناپسندیدہ کتابوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ میرے کتب خانے میں موجود ہے کہ نہ جانے کب کہاں اور کیسا مورچہ سنبھالنا پڑ جائے۔ بہر حال یوسف سرمست کی کتاب کا ایک ایک ورق میں دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ چاٹنے کا یہ عمل میرے شوق سے زیادہ میری ضرورت کا حصہ تھا اور اندھیرے میں روشنی کی تلاش بھی۔ اور اس تلاش نے واقعی روشنی دی اور میرے راستوں کو آسان کیا۔ اس لئے کہ ان کتابوں سے قبل اردو میں ناول سے متعلق جو کتابیں موجود تھیں ان میں علی عباس حسینی، سہیل بخاری، احسن فاروقی کی خاص تھی۔ لیکن ان کتابوں کی ابتدائی اہمیت کے باوجود گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان میں روایتی مدرسانہ انداز کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس لئے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن یوسف سرمست نے غالباً پہلی

بار نہ صرف تحقیق کا بلکہ تنقید کا حق ادا کیا ہے اور فکشن کے فن کو نہایت عرق ریزی کے ساتھ اور منطقی انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی استاد اور اس وقت کی مشہور ادیبہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ پیش لفظ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئیں:

> ''زیر نظر تصنیف میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے بیسویں صدی کے اردو ناولوں پر محققانہ نظر ڈالی ہے اور صحیح معنوں میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے.... زیر نظر تصنیف میں سب سے قابل قدر حصہ معاصر کارناموں کا تنقیدی جائزہ اور اردو ناول کی تکنیک پر مغربی ناول بالخصوص انگریزی ناول کی تکنیک کے اثرات کا مطالعہ ہے.... ان کی یہ سعی و کاوش قابل داد ہے۔ اس تصنیف کی حیثیت اردو ناول کی ارتقا کے لئے سنگ میل کی سی ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو ناول نے کتنا سفر طے کیا ہے اور کتنا طے کرنا باقی ہے۔''

مجھے یاد ہے کہ کم و بیش اسی نوعیت کے توصیفی جملے مقتدر اور مستند ادیب رشید احمد صدیقی نے قمر رئیس کی پریم چند والی کتاب پر لکھے تھے۔ جبکہ وہ نہ پریم چند کے زیادہ قائل تھے اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کے۔ لیکن اچھا اور عمدہ کام تو سچ اگلوا ہی لیتا ہے۔ خیر یہ تو بڑے اور محترم ادیب تھے لیکن کسی نوجوان ادیب کا پورے اعتماد اور جرأت کے ساتھ یہ کہنا کہ:

> ''ان تینوں کتابوں (علی عباس حسینی، احسن فاروقی اور سہیل بخاری کی کتابیں) میں جو بات بری طرح کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتابیں مختلف ناول نگاروں پر تنقیدی انشائیوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کتابوں میں بیسویں صدی کی ناول نگاری کے مخصوص رجحانات، بیسویں صدی کی ناول نگاری کی امتیازی خصوصیات،

جدید ناول نگاری کا تدریجی ارتقاء، ہیئت اور مواد کی تبدیلی۔ ان تبدیلیوں کو پیدا کرنے والے اہم محرکات کا قطعی کوئی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ راقم نے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر بیسویں صدی کی ناول نگاری کا مکمل جائزہ لینے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔" (حرف آغاز)

اور یہ بات بالکل درست ہے کہ اس کتاب میں ناول کے سماجی محرکات پر تو تفصیلی گفتگو ملتی ہی ہے نیز تنقیدی، ہیئتی اور فنی گفتگو بھی خوب خوب ملتی ہے۔ میری نظر میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں شعور کی رو کو نہایت تفصیل سے برتا گیا ہے اور ناول لندن کی ایک رات اور عزیز احمد کے بعض ناولوں پر ناقدانہ و عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ ایسی تفصیلی، مربوط اور علمی گفتگو تو وارث علوی اور شمیم حنفی کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ قمر رئیس نے پریم چند پر بے مثال کتاب ضرور لکھی لیکن وہ بھی پریم چند اور عہد پریم چند تک ہی محدود ہے۔ اگرچہ ان کا مطالعہ و تجزیہ بیحد معروضی اور منطقی ہے نیز بھرپور سماجی اور تہذیبی بھی۔ تاہم یہ کتاب بھی پوری صدی کا احاطہ نہیں کرتی۔ یہ موضوع کی مجبوری تھی قمر رئیس کی نہیں۔

بہر حال یوسف سرمست کی اس مفصل اور موثر کتاب پڑھنے اور اس میں ان کی پرکشش تصویر دیکھنے، متاثر ہونے کے بعد ان سے ملنے کی خواہش کا بیدار ہونا فطری تھا۔ لیکن اس وقت بھی حیدرآباد دکن جانا غیر ملک جانے کے برابر سمجھا جاتا تھا اور دکن والے بھی شمال کو کوئی دوسرا ملک سمجھتے تھے۔ اور یہ دوسراپن یا پرایاپن کسی نہ کسی شکل میں ہنوز برقرار ہے۔ حیدرآباد جانا، چارمینار دیکھنا یا سالار جنگ میوزیم کو دیکھنا خواب سا لگتا تھا۔ چارمینار جیسے پیرس کا ایفل ٹاور ہو۔ انھیں برسوں میں حیدرآباد میں ایک نئی مرکزی یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس میں شعبۂ اردو کا قیام بھی عمل میں آیا۔ کچھ اسامیوں کا اشتہار شائع ہوا تو استاذی عقیل صاحب نے کہا کہ درخواست دے دو۔ حالانکہ مجھے تکلف تھا اس لئے کہ ابھی میں تحقیقی مراحل سے گزر رہا تھا اور مجھے ڈی فل کی ڈگری نہیں ملی تھی۔ اس لئے مجھے ہچکچاہٹ تھی۔ لیکن استاد کے حکم کی تعمیل، حیدرآباد گھومنے کی خواہش اور اقبال متین اور

یوسف سرمست سے ملنے کی آرزو نے مجھے سفردکن کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ حیدرآباد میں میرے مراسم صرف اقبال متین سے تھے۔ ان سے قمر رئیس کے ذریعہ دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ صوفی منش سنگم دیکھنے کی خواہش میں ایک بار الہ آباد آچکے تھے اور میرے غریب خانے پر ہی قیام کیا تھا۔ ان کے ساتھ احمد ہمیش اور احمد یوسف بھی تھے۔ ہم نے ان سب کے اعزاز میں ایک بڑی شام افسانہ کا اہتمام بھی کیا تھا۔ اس کے بعد سے اقبال متین سے بہت اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد میں انھیں کے ساتھ قیام کیا۔ ان کے افراد خاندان بالخصوص بیٹے نوید نے میری بڑی مدد کی تھی۔ وہیں جب اس بات کا علم ہوا کہ یوسف سرمست اقبال متین کے عزیز ہیں تو مجھے مزید مسرت ہوئی اور اس ناتے وہ خود مجھ سے ملنے اور اپنے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی لے جانے کے لئے اقبال متین کے گھر پر آئے۔ جب پہلی بار میں نے ان کو دیکھا تو حیران و پریشان ہو گیا۔ ایک دھکا سا لگا۔ ۵۲۰ صفحات پر لکھی اتنی موٹی کتاب کے مصنف اس قدر دبلے اور منحنی۔ آواز اس سے زیادہ باریک اور منحنی۔ تصویر سے ذرا بھی اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ کوٹ میں ٹائی میں ملبوس بڑے بڑے والوں والی تصویر سے ذرا بھی اندازہ نہ لگ سکا تھا کہ وہ اتنے پستہ قد کمزور اور نازک سے ہوں گے۔ بڑی دیر تک یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی یوسف سرمست ہیں جنھوں نے اتنی عمدہ اور معیاری کتاب لکھی ہے۔ بہرحال تمام تر مایوسیوں کے ساتھ ملاقات ہوئی یا کرنی پڑی۔ اچھی بات یہ تھی اس وقت بھی وہ کوٹ، ٹائی اور اچھے کپڑوں میں تھے اور بظاہر پروفیسر لگ رہے تھے۔ (حالانکہ وہ اس وقت باقاعدہ پروفیسر نہیں تھے) ملاقاتیں ہوئیں اور باتیں بھی پھر انھیں کے ساتھ میں عثمانیہ یونیورسٹی گیا، جہاں ان کی عزت و مقبولیت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ وہ ایک اچھے استاد اور اسکالر تو تھے ہی اچھے خاندان اور اچھے پس منظر کے بھی تھے۔ ان کے والد تمکین سرمست ایک خاندانی معزز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے بھائی قیصر سرمست بہت اچھے آرٹسٹ اور مصور تھے۔ ان کی تحریر میں جادو تھا۔ یوسف سرمست کی کتاب کا سرورق اور حسن کاری انھوں نے ہی کی تھی۔ کچھ ایسی کہ میں کیا بڑے بڑے دھوکہ کھا گئے کہ کتاب کچھ اور ہے مصنف کچھ اور۔

یعنی ظاہری ہیئت میں ایک تضاد تھا جو صرف پہلی ملاقات میں ہی ظاہر ہوتا تھا پھر آپ ان سے ملتے جائیے تو رفتہ رفتہ نہایت سست رفتاری سے وہ بھی کھلیں گے تب اندازہ ہوگا بظاہر کمزور سا دکھائی دینے والا یہ منحنی سا شخص اندر سے کس قدر مضبوط ہے۔ جیسا کہ میرے ساتھ ہوا۔ میں کئی دنوں تک حیدرآباد میں رہا۔ اقبال متین سے گھل مل گیا اس لیے کہ وہ اصلاً فنکار تھے اور اس سے زیادہ ایک دردمند اور ترقی پسند انسان۔ یوسف سرمست ترقی پسند تو تھے لیکن محقق و نقاد بھی تو تھے۔ محقق و ناقد کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ ناقد ہوتے ہیں جو میری طرح علم کم رکھتے ہیں لیکن اظہار علم میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو بھاری بھرکم اور گہرے ہوتے ہیں سنجیدگی اور کم سخنی ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی خوبیاں ان کی شخصیت سے زیادہ ان کے علم و دانش کا حصہ ہوتی ہے۔ یوسف سرمست دوسرے قسم کے ناقدوں میں تھے۔ کم سخنی ان کے طبعی میلان کا حصہ ہوسکتی تھی لیکن علم و شعور نے ایک دبیز سی چادر بھی ڈال دی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب اسی سفر میں کئی ملاقاتوں کے بعد جب وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور عمدہ چائے پلائی، تب میں نے ہمت جٹا کر اپنے تحقیقی موضوع سے متعلق تبادلۂ خیال کیا کہ کہاں سے اور کس طرح سے تھیسس لکھنا شروع کروں اور کیا تلاش کروں اور کس طرح اس تلاش و تحقیق کو پیش کروں۔ تب پہلی مرتبہ انھوں نے اپنی کتاب کا ذکر خود کیا ورنہ بعد کے دنوں میں جب بھی ان کی کتاب کی خوبی اور پسندیدگی کی بات میں کرتا تو وہ اس طرح شرما جاتے جیسے میں شب عروسی کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن ایک منحنی پُر اسرار مسکراہٹ ہونٹوں پر ضرور ابھر آتی جیسے شب وصال کے بعد دوشیزہ کے جمال کی ہوجایا کرتی ہے۔ ایک عمدہ، معیاری اور پانچ سو صفحات کی بھاری بھرکم کتاب لکھنا شب وصال کا سفر ہو یا نہ ہو لیکن محبت و محنت، والہانہ وابستگی اور سپردگی کی دلدوز داستان تو ہوتی ہی ہے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کہ یوسف سرمست نوجوانی میں اتنے دبلے اور کمزور نہ رہے ہوں گے اتنی بھاری اور موٹی کتاب نے ان کو دبلا کر دیا ہے۔ یقین کیجیے جس دبلے پن اور کمزوری نے پہلا عجیب سا تاثر دکھایا وہی اب رفتہ رفتہ قابل تعظیم ہونے لگا تھا۔ جب انھوں نے اپنی کتاب کے حوالے سے یہ رائے دی کہ

عبدالحلیم شرر تاریخی ناول نگار تھے لیکن انھوں نے بعض عمدہ معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں۔ آپ سب سے پہلے ان کے تمام ناولوں کو اکٹھا کیجئے ان کی تعداد سن اشاعت وغیرہ پر گفتگو کیجئے۔ یہ کام اس لئے ضروری ہے کہ ان کے کئی ناول دو دو ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔ وہ ایک مقبول عام قصہ نویس اور ناول نگار تھے۔ ان کی تقلید میں بھی کئی ناول ان کے نام سے لکھے گئے جو واقعتاً ان کے نہیں ہیں۔ آپ کو یہ سب واضح کرنا ہوگا۔ میں یہ سب سن کر حیران سے زیادہ پریشان ہوا کہ اتنے مشکل کام میں کس طرح انجام دوں گا لیکن میری ان مشکلوں کو بھی انھوں نے بعد کی ملاقاتوں اور ٹیلی فون پر گفتگو کر کے کچھ کم کرنے کی بہر حال کوشش کی جس کے لئے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا۔ لیکن اس سے زیادہ میرے لئے وہ باتیں قیمتی تھیں جس کا تعلق تحقیق سے کم تنقید سے زیادہ تھا۔ یعنی پہلے آپ کو معاشرتی اور سماجی ناول اور اس کے بعد تاریخی ناول کے فکر وفن اور ان دونوں کے مابین نازک فرق کو سنجیدگی و باریکی سے سمجھنا ہوگا۔ اور یہ بھی کہ پاپولر (Populer) ناول کچھ اور ہوتے ہیں اور سنجیدہ (Serious) ناول کچھ اور۔ جب میں نے ان دونوں قسم کے ناولوں کے فرق کو بھی پوچھا تب وہ کوٹ ٹائی اور سوٹ میں سے نکل کر کرے پائجامے میں آچکے تھے رلیکس لگ رہے تھے۔ بڑی آسانی سے بولے:

> "دیکھئے فاطمی صاحب! اردو ناول کی تاریخ میں ۱۸۹۹ء کا سال بہت قیمتی ہے۔ اس سال اردو کے دو یادگار ناول شائع ہوئے اول فردوس بریں۔ دوم امراؤ جان ادا۔ لیکن میں امراؤ جان کو ایک سنجیدہ و معیاری ناول تسلیم کرتا ہوں اگر چہ وہ مقبول عام بھی ہوا....."

اور فردوس بریں؟ بے ساختہ پریشانی کے عالم میں میں نے سوال کر دیا۔

> "فردوس بریں میں انشاپردازی زیادہ ہے خیالی باتیں زیادہ ہیں، پھر بھی شرر نے شیخ علی وجودی کا منفی کردار پیش کر کے سماج کے ایک حصہ ایک طبقہ کو اجاگر کیا

ہے۔لیکن میں اسے رومانی ناول زیادہ مانتا ہوں، تاریخی
کم۔.....پھر بھی اس کی اپنی ایک اہمیت تو ہے کہ اردو
ناول میں پہلی بار ایک پاورفل قسم کے ویلین کا کردار ملتا
ہے۔ورنہ مرزا ظاہر دار بیگ کو نذیر احمد نے مسخرہ بنا کر
اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔بہر حال وہ کردار بھی بہت اچھا
ہے۔ضرورت اس بات کی ہے ایسے ابنارمل کرداروں کا
بھی سماجی، فکری اور فنی جائزہ لیا جائے۔''

میں نے ایم اے. میں فردوس بریں پڑھا تھا اور فرقۂ باطنیہ کی وجہ سے میں اسے تاریخی ناول ہی مانتا تھا۔لیکن سرمست صاحب کی اس گفتگو سے جس قدر میں متاثر ہوا اتنا ہی کنفیوز بھی۔اور جب میں نے اپنا یہ کنفیوزن ظاہر کیا تو خفیف سا مسکرائے اور بولے:

''اکثر طلبا کنفیوز ہی رہتے ہیں۔ان کا ذہن صاف
نہیں رہتا کہ ان کی اصل تلاش کیا ہے، منزل مقصود کیا
ہے۔اسی لئے ایک نگراں اور گائڈ ہوتا ہے جو اس کی
رہنمائی کرے لیکن اب تو نگراں حضرات بھی اکثر کنفیوز
دکھائی دیتے ہیں۔''

پھر اچانک انھیں کچھ خیال آیا اور بولے:

''آپ کے نگراں تو عقیل صاحب ہیں وہ ذی علم
انسان ہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔قمر رئیس بھی ایسے نہیں
ہیں۔آپ تو ان کے بہت قریب ہیں۔آپ ان سے بھی
گفتگو کیجئے مجھ سے بہتر باتیں بتائیں گے۔میں نے جو
کچھ بھی سمجھا ہے اور کتاب میں بھی لکھا ہے اس کی روشنی
میں کہہ سکتا ہوں کہ فکشن کی اصل تنقید اردو میں کم لکھی گئی
ہے۔وہ اردو شاعری کی ہی طرح لکھی گئی جبکہ اس کے

تقاضے و مطالبے بیحد الگ ہیں۔"

پھر بہت ساری باتیں ہوئیں جو مجھے اب یاد بھی نہیں ہیں۔ اس وقت تک موبائل وغیرہ نہیں آیا تھا۔ کوئی ریکارڈ بھی نہ تھا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ انھوں نے ہدایت کی تھی کہ سب سے پہلے تاریخی ناول کے فن پر گفتگو کروں کیوں کہ تاریخی ناول کا فن دوسرے قسم کے ناولوں سے بہر حال مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں تاریخ ہوتی ہے اور تاریخ کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے۔ اور فکشن میں اکثر خیالی باتیں در آتی ہیں، تاریخی ناول میں حقیقت اور تخیل کا مشکل ترین امتزاج ہوتا ہے اسی لئے اکثر تاریخی ناول کہانی زیادہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ناول نگار کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ناول لکھ رہا ہے تاریخی کتاب نہیں۔ اس طرح کی عالمانہ باتیں وہ اکثر فون پر، خط میں کہا اور لکھا کرتے تھے۔ انھیں کی تاکید پر میں نے اپنے مقالے کے ایک باب میں تفصیل سے تاریخی ناول کے فکر وفن پر گفتگو کی ہے جس سے میرا ذہن صاف ہوا جس کی وجہ سے میں یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوا کہ شرر کے بظاہر تاریخی ناول واقعی کون سے تاریخی ہیں اور کون زیادہ رومانی۔ اس بحث اور اس باب کو میرے اکسپرٹ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر گیان چند جین نے اس قدر پسند کیا کہ تاکید سے کہا کہ اس باب کو الگ سے کتاب بنا کر پیش کرو، جو میں نے بعد میں کیا اور یہی میری پہلی باضابطہ کتاب تھی۔ جسے بزرگوں نے پسند کیا اور بہار کے کلام حیدری نے تو آہنگ میں تفصیلی تبصرہ بھی کیا۔ اس کتاب کو یوسف سرمست نے بھی پسند کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس میں کچھ اضافے کر کے اردو میں تاریخ ناول نگاری تک پھیلا دو لیکن میں یہ کام نہ کر سکا۔ جس میں سراسر میری تساہلی و نالائقی کا دخل رہا ہے۔ اس لئے کہ شرر کے ناولوں پر روکھی پھیکی تحقیق کر کے میں تھک بلکہ اوب چکا تھا۔ اب میری ہمت نہ تھی کہ پلٹ کر دیکھوں اور خاردار صحرا میں لہولہان ہوں۔ میں سید محمد عقیل، قمر رئیس، محمد حسن، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ سے گھل مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اب میرے سامنے ماضی کے بجائے مستقبل تھا۔ آرزوئیں اور تمنائیں تھیں۔ نیا ادب تھا اور نیا فکشن لیکن یوسف سرمست سے رشتہ محبت کم

نہ ہوا بلکہ رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔

ایک بار جب میں نے اقبال متین کے ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' پر تفصیلی تنقیدی نوعیت کا مضمون لکھا تو یوسف سرمست نے ٹیلی فون پر مضمون کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور قدرے اختلاف بھی کیا۔ انھیں اس ناولٹ میں کچھ چیزیں غیر فطری سی لگتی تھیں۔ اس لیے بعض رویوں یا نظریوں سے انھیں اختلاف تھا۔ بڑی دیر تک ٹیلی فون پر باتیں رہیں جب میں نے آخر میں کہا کہ سماجی حقیقت اور تخلیقی حقیقت کو ایک ترازو میں نہیں تولنا چاہئے۔ تخلیقی حقیقت میں بہرحال تصور و تخیل کا دخل رہتا ہے تو یہ بات انھیں اچھی لگی کچھ قائل ہوئے زیادہ مجھے قائل کیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا تفصیلی مضمون اسی ناولٹ پر شائع ہوا جو بعد میں ان کی کتاب تحقیق و تنقید میں شامل تھا۔ جب یہ کتاب انھوں ے مجھے بھیجی تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس مضمون میں ہمارے درمیان کی گفتگو کی جھلکیاں موجود تھیں۔ اس موجودگی سے میں بڑا نہیں ہوا بلکہ یوسف سرمت بڑے ہوئے ویسے بھی وہ عمر، عقل اور علم غرضکہ ہر اعتبار سے بڑے تھے۔ ایک بڑکپن یہ بھی تھا کہ مجھ جیسے کم علم خوردوں سے بھی محبت کرتے تھے۔ اور خاکساری کے ساتھ علمی گفتگو کرتے تھے جواب ناپید ہوگئی ہے۔ اسی کتاب میں ان کے دو ایسے طویل مضامین (فکشن۔ ناول اور سوانحی ناول اور ناول کا فن) تھے جن میں فکشن سے متلق ان کی گہری معلومات اور علمی بصیرت کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ فکشن کے فکروفن، مغربی فکشن وغیرہ پر جس قدر یوسف سرمست کی نظر تھی ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کی رہی ہو۔ وارث علوی فکشن کے بڑے ناقد تسلیم کیے جاتے ہیں اور شاید ہیں بھی۔ لیکن فن کی نزاکتوں اور ناول کی وسعتوں کو لے کر ان کے پاس بھی مضامین کی کمی ہے۔ ان کے یہاں دیگر نوع کی وسعت تو ہے لیکن جتنی وسعت ہے اتنی بصیرت نہیں۔ وہ تاثراتی انداز میں اسقدر کھو جاتے ہیں کہ مضمون اکثر تنقید کی راہ بھول کر انشائیہ کی راہ پر چلا جاتا ہے۔ یہ بات میں نے ان سے براہ راست بھی کہی تھی جسے وہ سنی ان سنی کر گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ یوسف صاحب صرف فن کی باتیں کرتے ہیں۔ ناولوں کی باتیں نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں اس کتاب میں شامل ان کے دو

مضامین ہم عصر ناول اور چائے کے باغ غور طلب اور پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ چائے کے باغ پر جتنا اچھا تجزیہ وہ کر گئے وہ تو قراۃ العین حیدر کے نام نہاد ماہرین بھی نہ کر سکے۔ یہ باتیں یہاں جو لکھی ہیں میں نے سرمست صاحب سے کہی بھی تھیں لیکن ان کا شریفانہ اور خاکسارانہ انداز ہمیشہ سچائی کو نظر انداز کر جاتا جس کی مجھے کوفت ہوتی چونکہ میں ان دنوں فکشن زیادہ پڑھتا لکھتا تھا اس لئے میں ان کی تحریر و تنقید کا قائل تھا۔ قمر رئیس صاحب بھی فکشن کے نقاد تھے وہ بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے لیکن افسوس کہ اردو دنیا نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے کہ وہ حقدار تھے۔ لیکن اس کے کچھ ذمہ دار وہ خود بھی تھے۔ ان کی مزاجی کیفیت، اظہار نمائش سے دوری، غیر ضروری بلکہ نقصان وہ حد تک خاموشی نے ان کو شمال تو کیا دکن میں بھی الگ تھلگ سا کر دیا تھا۔ دراصل وہ خود بھی گوشہ نشین الگ تھلگ رہنے والے مزاج کے انسان تھے۔ کچھ قد بھی کوتاہ تھا اور آواز بھی کمزور۔ آخر برسوں میں تو ان کی سماعت بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ تاہم وہ قمر رئیس کی دعوت پر دہلی آئے۔ ملاقاتیں ہوئیں لیکن باتیں کم ہو پائیں۔ ایک بار تو ہم دونوں غالب انسٹی ٹیوٹ کے گیسٹ ہاؤس میں ساتھ ہی ٹھہرے کئی روز کا ساتھ رہا لیکن گفت و شنید میں کافی دقت رہی۔ اول ان کا کم سننا دوم دھیمے بولنا۔ وہ کہتے کچھ تھے میں سمجھتا کچھ تھا۔ لیکن میرے دل میں پھر بھی ان کی بہت عزت تھی ان کا علم کے ساتھ ساتھ ان کی شرافت، محبت، خاکساری، ملنساری میں ایک خاص قسم کی مشرقیت اور انسانیت تھی۔ لیکن پہناوے میں مغربیت تھی۔ کوٹ اور ٹائی کے بغیر باہر نہ نکلتے تھے۔ انھوں نے جس قدر مغربی فکشن کو پڑھ رکھا تھا اور فکشن کے فن پر جتنی گہری نظر رکھتے تھے اور سنجیدہ و بالیدہ گفتگو کرتے تھے اس نوع کی علمی گفتگو میں نے کسی بڑے نقاد کی تقریر و تحریر میں نہ دیکھی نہ سنی۔ کہنے کو تو ایک سے ایک نقاد تھے اور ہیں جو اپنی انگریزی دانی اور ہمہ دانی کا ہمہ وقت اظہار کرتے رہتے ہیں، خیال رہے کہ یہ بات فکشن اور اس کے فن کے حوالے سے کہہ رہا ہوں، شاعری کے حوالے سے نہیں۔

جب کرشن چندر سے متعلق میری کتاب انجمن اردو ہند نے شائع کی اور اخبار ہماری زبان میں اس کا اشتہار انھوں نے دیکھا تو ٹیلی فون پر مجھے مبارکباد دی اور کتاب کا

مطالبہ کیا۔ حالانکہ میں ان کو اپنی کتاب بھیجتا تھا اور یہ کتاب بھی بھیج چکا تھا جو بعد میں ان کو ملتی، انھوں نے اس کتاب کو پڑھا چند دنوں کے بعد پھر ٹیلی فون کیا اور اس کے ایک مضمون (کرشن چندر کا فکری ارتقا) کی بیحد تعریف کی لیکن میرے ایک اور مضمون (اردو کا پہلا اشتراکی ناول جب کھیت جاگے) پر اختلاف تھا۔ کم از کم اس کے عنوان سے تو اختلاف تھا ہی چونکہ ٹیلی فون پر ان کی نہایت دھیمی اور کمزور آواز پورے طور پر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے میں صرف ہاں ہاں اور جی جی کرتا رہا۔ لیکن ان کا لہجہ ایسا ضرور ہوتا تھا جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سامنے والے اور لکھنے والے کو برابر کا درجہ دے رہے ہیں۔ ان کی اس محبت اور شرافت سے بھری ادا نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا تھا کہ ایسے مرنجا مرنج نیک اور پڑھے لکھے انسان اب کہاں۔ اب تو صورت یہ ہے کہ اردو شعر و ادب میں چھوٹے شاعر و ادیب معدوم ہو چکے ہیں۔ سب کے سب اعلیٰ اور بڑے بلکہ عظیم، کتاب بھیجئے تو رسید تک نہیں دیتے۔ ملاقات پر بھی کتاب موصول ہونے کا ذکر نہیں کریں گے۔ کسی شاعر و افسانہ نگار کسی تخلیق کی تعریف نہیں کریں گے۔ کسی کی اچھی کتاب آئے تو خوش نہیں ہوں گے اور یہی مجرمانہ نوعیت کی خاموشی اختیار کر کے اس کا ذکر تک نہیں کریں گے۔ لیکن یوسف سرمست اور ان کے بیشتر ہم عصروں میں یہ غیر ادبی بلکہ غیر اخلاقی عادتیں نہیں تھیں۔ وہ قمر رئیس ہوں یا وارث علوی، یوسف سرمست ہوں یا اقبال متین، یہاں تک کہ گوپی چند نارنگ اور محمد حسن بھی توجہ یا جواب دیتے تھے۔ یہ غیر اخلاقی رویہ بعد کے جدید نقادوں میں زیادہ رہا۔ جو سب کو جاہل اور معمولی سمجھ کر ایک خاص قسم کے مرعوبانہ و مزعومانہ لباس میں، اپنی ذات میں قید رہتے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ حالانکہ گزرتے ہوئے وقت نے کچھ فیصلے ان کی زندگی میں ہی کر دیئے ہیں کچھ اور کر دے گا کیونکہ وقت نہ صرف ظالم اور سفاک ہوتا ہے بلکہ منصف بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عہد کے تخلیق کار اکثر ہم عصر تنقید اور تنقید نگار سے بیزار ہی رہتے ہیں اور اس بیزاری میں وہ طرح طرح کے ایسے کام کر جاتے ہیں جو انھیں نہیں کرنے چاہئے اور وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ لیکن ان کے پاس انتظار اور صبر نسبتاً کم کم ہی ہے۔ یوسف سرمست نہایت صبر و استقلال کے انسان

تھے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی ذات وشناخت کی بات نہیں کی۔ وہ سر جھکا کر اپنا کام کرتے رہے پوری دلجمعی اور محنت ولگن کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا کام ان کی کتابیں ان کو زندہ رکھیں گی۔ خاص طور پر بیسویں صدی میں ناول والی کتاب تو بے مثال اور لازوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو تنقید وتحقیق میں پی.ایچ.ڈی. کے مقالوں کی مختصر اور بہترین فہرست تشکیل کی جائے تو اس کا شمار ابتدائی چار پانچ مقالوں میں ہوسکتا ہے کم ازکم میں ایسا ہی سوچتا ہوں۔

ان سے آخری ملاقات حیدرآباد میں داغ سیمینار میں ہوئی۔ بڑی مشکل سے آ پائے تھے۔ ملاقات پر کہا ''میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں'' ان جملوں سے جی خوش ہو گیا۔ میرے عزیز دوست ممتاز افسانہ نگار بیگ احساس نے بتایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے جب اپنے قیام کی صدی منائی تو اس کے ایک اجلاس میں اپنے ادارے کے بڑے اسکالرز کی تہنیت کا انتظام کیا جس میں یوسف سرمست بھی تشریف لے گئے۔ بقول بیگ احساس وہ بہت ہی نحیف ولاغر دکھائی دے رہے تھے۔ سخت بیمار تھے۔ صاف اندازہ ہوگیا تھا کہ اب زیادہ دنوں تک نہیں چل پائیں گے۔ یہی ہوا کہ اس کے چند ماہ بعد ہی وہ انتقال کر گئے۔ اتنی ہی خاموشی سے، جتنی خاموشی سے انھوں نے اپنی زندگی گزاری۔ کبھی کسی اعزاز یا ایوارڈ کی فکر میں نہیں رہے۔ وہ کبھی بھی اس نوعیت کی، دنیاداری وغیرہ کی بات نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں کوئی قابل ذکر ایوارڈ نہیں ملا۔ ان دنوں ایوارڈ، اعزاز کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے اور جس طرح معمولی سے معمولی لوگ ایوارڈ پا کر ذلت وبے عزتی کا سامنا کر رہے ہیں، خدا نے یوسف سرمست کو ان سب سے محفوظ رکھا۔ سرمست صاحب اس کے علاوہ بھی جو اداروں کی سیاست وغیرہ ہوتی ہے اس سے بھی وہ دور رہے۔ دور بہت دور۔ آج وہ بہت دور جا چکے ہیں لیکن ان کی محبتیں اور اس سے زیادہ ان کی کتابیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔

میں افسانوی ادب کا طالب علم ہوں۔ فکشن کو میں بھی پڑھتا لکھتا ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تکلف اور جھجک نہیں کہ شاعری کے مقابلے افسانہ کی قرأت،

سمجھ، غور وفکر، تجزیہ اور اسے تنقید کی سان تک لے جانے کا عمل اور ہنر میں نے جن لوگوں سے بطور خاص سیکھا ان میں قمر رئیس اور یوسف سرمست کے نام سب سے نمایاں اور اہم ہیں۔ کہنے کو تو فکشن کے حوالے سے اب ایک سے ایک نقاد پیدا ہو گئے ہیں۔ کسی کی پیدائش کو کیسے روکا جا سکتا ہے لیکن ان کی پیدائش اظہار ونمائش تک محدود ہے۔ لیکن اردو شاعری کی تنقید کے ہم پلہ فکشن کی تنقید کو جو اہمیت دی اور دلوائی اور اسے پوری سنجیدگی، علمیت اور معروضیت کے ساتھ معیار ووقار کا درجہ دیا ان میں وارث علوی اور قمر رئیس کے ساتھ ساتھ یوسف سرمست کا نام بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو آج بھی ممتاز شیریں اور حسن عسکری سے نیچے نہیں اترے۔ جبکہ ان لوگوں نے فکشن اور اس کی تنقید کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سید محمد عقیل جیسے پرانے نقاد کو جدید ناول کا فن اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے جدید اصلاً کلاسیکی نقاد کو "افسانہ کی حمایت میں" اور اب فکشن کی سچائیوں کو تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ اور اب تو سیکڑوں مقالے اور کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ بیسویں صدی فکشن کی صدی تھی اور اکیسویں صدی بھی ہوگی۔ اس خیال کی تعمیر وتشکیل میں یوسف سرمست کی کتاب کلیدی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ زندہ باد یوسف سرمست! پائندہ باد اردو فکشن اور فکشن نگار!!

❑❑❑

فضل امام عرف کرپارام

کسی بھی فرد سے تعلقات کی مدت طویل ہو اور کثیر بھی تو حافظہ کا ساتھ دے پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اردو کے ممتاز ادیب، ناقد، محقق، مفکر، مقرر پروفیسر فضل امام رضوی سے میرے تعلقات اتنے پرانے اور گہرے ہیں کہ ان کی قدامت اور گہرائی میں ڈوبا تو جا سکتا ہے، ابھر کر شمار و قطار کر پانا مشکل ہے۔ اس لئے یاد نہیں کہ کب کہاں اور کس مقام پر پہلی ملاقات ہوئی۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ بعض لوگوں سے روبرو ملنے سے قبل ہی مل چکے ہوتے ہیں اور پھر جب پہلی بار روبرو ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دہائیوں سے ملتے چلے آرہے ہیں۔ پہلے سے ہی محبت اور قربت ہے۔ ایک عجیب سا اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یا رشتہ فضل امام کے ساتھ رہا ہے۔ یادوں اور ملاقاتوں کی اس بھیڑ میں واقعی یاد نہیں کہ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یاد کرنے کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ جذباتی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے ہم اس قدر قریب رہے کہ یاد کا دخل نہ کے برابر رہا۔ یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو کسی اعتبار سے دور ہو گیا ہو۔ فضل امام صاحب اور میں ہمیشہ قریب رہے۔ ہر اعتبار سے قریب۔

اتنا ضرور یاد ہے کہ میں ابھی ایم۔اے۔ کا طالب علم تھا اور ہمارے گہرے دوست گورکھپور کے افغان اللہ خان جو ان دنوں فراق گورکھپوری پر برائے پی۔ایچ۔ڈی۔ مقالہ لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا اکثر الہ آباد آنا جانا ہوتا۔ ہم لوگ گاہے بگاہے فراق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افغان اللہ کے ساتھ کئی بار فراق صاحب کے پاس گئے اور بہت ساری باتیں سیکھنے کو ملیں۔ بہر حال افغان اللہ سے دوستی ہوتی گئی جو تادم آخر قائم رہی۔ افغان اللہ سچے اور کھرے انسان تھے، جس سے دوستی کرتے تو دل سے کرتے اسی طرح دشمنی کا بھی حال تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دشمن کم سے کم تھے۔ بہر حال انھیں کی زبانی میں نے پہلی بار جن دو شخصیتوں کا ذکر بار بار سنا ان میں ایک فضل امام

صاحب تھے دوسرے محمود الٰہی مرحوم۔ محمود الٰہی صاحب اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں
صدر شعبۂ اردو تھے اور معروف ادیب و محقق۔ فضل امام صاحب جے پور یونیورسٹی میں اردو
کے لکچرر تھے۔ فضل امام اور افغان اللہ میں جو چیزیں مشترک تھیں ان میں اول تو یہ کہ
دونوں ہی پروفیسر محمود الٰہی کے شاگرد تھے۔ دوئم یہ کہ دونوں کا ہی تعلق اعظم گڑھ اور گورکھپور
یونیورسٹی سے تھا۔ دونوں کے مزاج میں سادگی، خلوص اور اک بگھاپن کہ بس جس سے دوستی
اور رشتہ ہے تو ہے، سود و زیاں سے بالاتر۔ اور بھی کچھ چیزیں۔ افغان اللہ سے ہی پتہ چلا کہ
فضل امام نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم.اے. کرنے کے بعد محمود الٰہی کی نگرانی میں امیر اللہ
تسلیم کی حیات اور شاعری پر پی.ایچ.ڈی. کر کے اب وہ راجستھان یونیورسٹی جے پور میں
اردو کے استاد ہیں۔ محمود الٰہی صاحب کے بارے میں کل بھی اور آج بھی یہ سن رکھا تھا اور
دیکھا بھی کہ وہ اپنے شاگردوں کا بیحد خیال کرتے ہیں۔ ان کی پڑھائی لکھائی سے لے کر
ان کی ملازمت تک کا خیال۔ یہی وجہ ہے کہ آج پورے ہندوستان میں ان کے شاگرد پھیلے
ہوئے ہیں۔ شمال کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں محمد الٰہی کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور مل جائے
گا۔ فضل امام پر بھی ان کا فضل تھا، جس کو زندگی بھر فضل امام یاد کر کے نبھاتے رہے اور استاد
کے سامنے سر عقیدت خم کرتے رہے۔ تو فضل امام جے پور میں تھے ادھر میں الٰہ آباد میں
ایم.اے.، ڈی.فل. کرنے کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ میں لکچرر ہو گیا۔ انھیں دنوں
فضل امام صاحب نے جے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام ایک سیمینار کا اہتمام
کیا اور ہم سب لوگوں کو مدعو کیا۔ گلابی شہر جے پور دیکھنے اور گندمی شخصیت فضل امام سے ملنے
کی خواہش جے پور لے گئی۔ سیمینار میں اور بھی افراد تھے۔ الٰہ آباد سے ہمارے استاد
پروفیسر سید محمد عقیل، کچھ اور احباب بھی پروفیسر وہاب اشرفی بھی تھے۔ کچھ اور لوگ
بھی۔ ادبی سرگرمیوں سے میری بھی دلچسپی رہی ہے۔ مذکرے، مشاعرے کا اہتمام بھی کرتا
رہا ہوں۔ اس لئے جب میں نے فضل امام کو جے پور میں سرگرم اور مقبول دیکھا تو دلی خوشی
ہوئی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی شخصیت صرف شعبہ یا یونیورسٹی تک محدود نہ تھی بلکہ شہر
کے ادبی اور سماجی حلقہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ جسمانی طور پر جتنے چوڑے چکلے تھے ذہنی طور

پر بھی اتنے ہی وسیع اور فراخ بھی۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حرف ولفظ یا زبان و بیان کا پر لطف اظہار کر کے غیر کو بھی اپنا بنا لیتے تھے۔ جے پور کے اس مذاکرے۔ دو تین دن کے قیام کے دوران فضل امام اچھے لگے۔ اچھا تاثر بنا۔ فضل امام بڑے خلوص سے ملے اور چونکہ میں بھی ادیبانہ طور پر جد و جہد کر رہا تھا اور مضامین لکھنے، چھپنے اور شناخت قائم کرنے میں مصروف عمل تھا۔ اس لئے جلد ہی فضل امام سے مزید واقفیت وتعلقات کے در کھلنے لگے اور رسم و راہ بڑھنے لگی۔ اسی طرح میں نے بھی آگرہ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ سیمینار، مشاعرہ کئے لیکن سچ یہ ہے کہ میرا دل آگرہ میں نہ لگتا۔ علی گڑھ قریب ہے ہر ہفتہ وہاں چلا جاتا اور احباب میں دو تین دن گزار کر پھر واپس آگرہ آجاتا۔ میرا بھی جی چاہنے لگا میں بھی یونیورسٹی میں پہنچوں، علی گڑھ یا الہ آباد۔ شاید یہ احساس فضل امام صاحب کو بھی رہا حالانکہ وہ آٹھ نو سال سے جے پور یونیورسٹی میں تھے اور ان کے قدم جے پور میں جم چکے تھے لیکن اعظم گڑھ۔ گورکھپور اور محمود الٰہی ان کی ایسی کمزوری تھے کہ ان سے الگ رہ پانا ان کے لئے بہر حال مشکل تھا۔ اس لئے فضل امام صاحب جے پور سے نکلنے کی فکر میں لگے رہتے۔ میں تین سال کے بعد ۱۹۸۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی آگیا۔ اس کے چند برسوں بعد ہمارے شعبے میں ریڈر کی جگہ خالی ہوئی۔ استاذی سید محمد عقیل صدر شعبہ تھے۔ انھیں کسی سمجھدار اور پڑھے لکھے استاد کی ضرورت تھی۔ ان کی نگاہ انتخاب فضل امام پر پڑی۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۸۶ء میں فضل امام کا تقرر ہو گیا اور وہ جے پور میں چودہ برس (1972-1986) کا بن باس کاٹ کر الہ آباد آگئے اور اپنے وطن اعظم گڑھ اور مادر علمی گورکھپور سے قریب ہو گئے۔ ان کے آنے سے شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں نہ صرف رونق آئی ساتھ ہی مجھے انکی قربت کا موقع ملا۔ ابتدا میں فضل امام کا قیام میرے ساتھ ہی رہا۔ میں ان دنوں حلہ دریا آباد میں رہتا تھا، جو میری سسرال تھی اور ددیہال بھی۔ بڑا گھر تھا، کئی کمرے تھے۔ فضل امام ایک کمرے میں کئی ماہ رہے ساتھ کھانا پینا ہوتا۔ ساتھ یونیورسٹی آتے جاتے۔ محفل، مذاکرے۔ پڑھنا لکھنا سب ساتھ ساتھ ہوتا چنانچہ ان صورتوں اور قربتوں میں فضل امام صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ چند ماہ بعد انھوں نے بیوی

بچوں کو بھی بلا لیا۔ اور دوسرے کرایے کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

صاف اندازہ ہوا کہ فضل امام سادہ طبیعت اور مشرقی و مذہبی مزاج کے انسان ہیں۔ نماز روزہ پابندی سے کرتے، مجلس محرم اس سے بھی زیادہ۔ ان سب معاملات میں وہ راسخ العقیدہ ہیں۔ پکے مسلمان لیکن اچھے انسان۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا لیکن میں ان چیزوں سے گھبرایا نہیں اس لئے کہ میرا خاندان بھی بیحد مذہبی ہے اور آدھا شیعہ بھی۔ میرا بچپن ننیہال (صفی پور، اناؤ) میں گزرا جہاں شیعہ حضرات زیادہ ہیں۔ مجلس محرم کے سایہ میں گزرا ہے اس لئے مرے لئے زیادہ زحمت نہ تھی۔ البتہ میری بیوی کے لئے ضرور زحمت تھی اور پابندی بھی لیکن وہ بیحد شریف، مہذب اور مہمان نواز خاتون ہیں اس لئے وہ یہ سارے کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہیں۔ اپنے تمام تر مذہبی رسومات اور روایات کے باوجود فضل امام متعصب اور دقیانوسی ہرگز نہیں ہیں۔ انھوں نے مذہب، مسلک کو محض عقیدت سے نہیں بلکہ تعقل و تفکر کے حوالے سے لیا ہے۔ پوری کشادہ ذہنی اور انسان دوستی کے ساتھ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تعلقات ہر مذہب اور طبقے کے لوگوں سے رہے ہیں اور آج بھی ہیں پوری خوش دلی اور خوش فکری کے ساتھ۔ ان کی یہ انسان دوستی اور روشن خیالی ہی انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قریب لائی اور وہ باقاعدہ اس سے وابستہ رہے۔ لندن کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ ۸۷ء میں جب ہم نے الہ آباد میں انجمن کی گولڈن جوبلی کانفرنس کا انعقاد کیا تو وہ اس میں پیش پیش رہے۔ پورے طور پر ہمارے ساتھ رہے۔ بعد میں وہ انجمن کی الہ آباد شاخ کے پہلے نائب صدر، اس کے بعد صدر ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ صدر ہونے کے بعد وہ مصروف ہوتے گئے اور انجمن کی طرف توجہ کم ہوئی تو میں نے روکا ٹوکا بھی، وقتی اختلافات بھی ہوئی جو جلد ہی تحلیل بھی ہو گئے۔ انہیں ماہ و سال میں ہم نے یہ بھی جانا کہ وہ ہندی زبان بہت اچھی جانتے ہیں۔ سنسکرت بھی، راجستھانی بھی۔ کچھ اور مقامی بولیاں بھی۔ انھوں نے اس تعلق سے کچھ کورس وغیرہ بھی کر رکھے تھے۔ الہ آباد ہندی زبان و ادب کا مرکز ہے، اس لئے یہاں آنے کے بعد ان کی ہندی دانی کے جوہر کھلنے لگے۔ جا بجا ہندی و اردو کے جلسوں میں جہاں وہ

اردو کی اسکالر کی حیثیت سے بلائے جاتے وہ یہ ثابت کرنے میں لگ جاتے کہ وہ جتنی اردو جانتے ہیں اس سے کم ہندی سے واقف نہیں۔ اکثر عام گفتگو میں بھی ہندی سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے تو عجیب لطف آتا۔ یہ لطف ہندی والوں کو زیادہ آتا۔ ان کے لئے حیرت کی بات ہوتی اس سے زیادہ مسرت کی بھی۔ ہندی ہم بھی جانتے ہیں اور پورا تعلیمی کیریئر ہندی میڈیم میں ہی طے ہوا ہے۔ لیکن فضل امام جیسی ہندی ہم لوگ نہ بول پاتے۔ وہ گاڑھے گاڑھے الفاظ نکلتے کہ حلق میں خراشیں پڑ جاتیں اور وہ کھانسنے لگتے۔ حلق اور کھانسی کا مرض ان کا پرانا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی دوا اپنے پاس رکھتے ہیں کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ لیکن کھانسی اچھی ہونے کا نام نہ لیتی۔ وہ یہ بات کبھی نہ سمجھ سکے کہ ان کے حلق کا مرض دراصل گاڑھی ہندی بولنے کی وجہ سے ہے۔ ابتدا میں الہ آباد کا ہندی طبقہ خوش ضرور ہوا اور انھیں فضل امام کی جگہ کرپارام کہنے لگا جو فضل امام کا ہندی ترجمہ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ یہ رواں دواں اور بےجنل ہندی نہیں ہے بلکہ سنسکرتائی ہندی ہے جسے اصل ہندی والے بھی کم بول پاتے ہیں اس لئے جلد ہی وہ کرپارام کی جگہ پنڈت کرپا رام ہو گئے۔ ایک بار یہ بھی ہوا کہ ہندی کے کسی ایک جلسہ میں فضل امام نے گاڑھی ہندی میں تقریر کی تو حسب معمول سامعین متاثر ہوئے اور اس سے زیادہ متحیر۔ ہندی کی ممتاز افسانہ نگار ممتا کالیہ جلسے کی صدارت کر رہی تھیں، اپنی صدارتی تقریر میں ازراہ لطف کہہ گئیں کہ فضل امام کی تقریر کس زبان میں تھی، میں سمجھ نہ سکی۔ اگر وہ اس کا ترجمہ ہندی میں کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ لوگوں نے خوب لطف لیا۔ سچ بات یہ ہے کہ ہندی فضل امام کی مادری زبان نہیں ہے۔ اکتسابی ہے، اسی لئے کتابی ہے لیکن اردو جو ان کی مادری زبان ہے اس زبان میں کی گئی تقریر بھی اکثر کتابی زبان میں ہی ہوتی ہے۔ وہ عربی اور فارسی اچھی جانتے ہیں۔ مدرسہ کی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں اس لئے ان کی اردو میں بھی عربی اور چربی نظر آنے لگتی ہے۔ جو کبھی کبھی مصنوعی سی لگنے لگتی ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ یہ عادت اب ان کی فطرت بن چکی ہے۔ اس لئے ہمیں معلوم ہے کہ اب تصنع نہیں ہے تفرہ ہے۔ بہر حال یہ لطف کی باتیں اپنی جگہ پر لیکن اپنے مزاج وتہذیب، اخلاق وآداب اور

ششتا چار سے وہ دیکھتے دیکھتے یونیورسٹی اور شہر میں مقبول ہوتے گئے۔ ہندی اور دیگر مضامین کے استادوں، لیکھکوں، یہاں تک کہ سیاست دانوں سے ان کے قریبی تعلقات ہوتے گئے۔ جن کی دو مثالیں یادگار ہیں۔ جن کا ذکر ضروری ہے۔

۱۹۹۲ء میں جب بابری مسجد کی شہادت کا المناک حادثہ ہوا تو تمام سیکولر لوگ بالخصوص مسلمان اس اذیت ناک حادثہ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ چاروں طرف عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ یونیورسٹی کا ماحول بھی متاثر تھا۔ لیکن تعریف کرنی ہوگی سیکولر ہندو اساتذہ کی جو کئی قسم کے سیکولر نوعیت کے فورم سے اس حادثے کی مذمت کر رہے تھے۔ اور سیکولر فضا قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ بغیر اعلان کے دو خیموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک طرف سیکولر اور ترقی پسند اساتذہ دوسری طرف ایسے اساتذہ جو ہندوازم اور برہمن ازم وغیرہ پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ ٹھیک اسی حساس ماحول میں الہ آباد یونیورسٹی اساتذہ کی ایسوسی ایشن (AUTA) کا الیکشن ہوا۔ کچھ تیز طرار، سمجھدار اور سیکولر کردار والے اساتذہ نے سوچ سمجھ کر فرقہ پرستوں کی شکست دینے کی غرض سے فضل امام صاحب کو صدر کی پوسٹ کے لئے الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ اور وہ ہندی بولتے بولتے کھڑے بھی ہو گئے۔ ہم سب حیران و پریشان کہ اس نازک ماحول میں وہ کیا جیتیں گے۔ مسلمان اساتذہ تو گنتی کے ہیں۔ ترقی پسند بھی کتنے ہوں گے، کچھ ایسے ترقی پسند بھی ہوتے ہیں کہ کرائسس میں وہ ترقی پسند کم مذہبی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن واقعی حیرت کا مقام تھا کہ یہ الیکشن فضل امام نے کم لڑا چند برائے نام ہندو اساتذہ جن میں عورتیں بھی شامل تھیں ان سب نے جم کر فضل امام کی حمایت کی۔ میں پھر بھی مایوس تھا اور مصلحتاً مجھے بہت زیادہ آگے آگے رہنے کو منع کیا گیا۔ کیونکہ میں بدنامی کی حد تک ترقی پسند تھا۔ بہر حال اس کشاکش اور جدوجہد کے بعد جب نتیجہ نکلا تو فضل امام الیکشن جیت چکے تھے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ غالباً پہلی بار کوئی مسلم پروفیسر اساتذہ کی انجمن کا صدر بنا تھا۔ جسے اخبار والوں نے خوب پیش کیا۔ ہندی اخباروں میں جب تصویر چھپی تو وہ فضل امام کم کرپا رام زیدہ لگ رہے تھے۔ اس زمانے میں ملائم سنگھ یادو کی حکومت تھی۔ ممتاز سماجوادی لیڈر

جنیشور مصرا زندہ تھے اور الہ آباد میں ہی رہتے تھے۔ ان کی نظر فضل امام پر پڑی اور دیکھتے دیکھتے وہ سماجوادی پارٹی لیڈران کے بھی بہت قریب ہو گئے۔ میں بھی تھوڑا بہت سماجوادی نقطۂ نظر سے قریب ہوا لیکن فضل امام کی نگاہیں کہیں اور بھی تھیں۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد وہ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن کے چیئر مین بنا دیئے گئے۔ ہم سب خوش تو ہوئے لیکن مجھے یہ لگا کہ یہ عمل، یہ فیصلہ زیادہ درست نہیں کہ کمیشن کے دیگر ممبران اور ان کے رفقاء سب کے سب کرپٹ اور لالچی تھے۔ لیکن میں خاموش رہا کہ وہ مجھ سے سینئر اور پروفیسر تھے۔ چاروں طرف ان کا شور وغوغا تھا۔ سیاسی اور سماجی ماحول میں کچھ زیادہ اور میری نگاہیں ان کو شعبہ زبان وادب میں سربلند دیکھنے کی متمنی تھیں۔ ایک پروفیسر ہی نہیں ایک اسکالر کی شکل میں اور اسکالر شپ صرف زبان دانی سے نہیں آتی ہمہ دانی سے آتی ہے۔ اس کے راستے کچھ اور ہوتے ہیں۔ جہاں ایثار وقربانی کا رول کچھ زیادہ ہوا کرتا ہے۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ چیئر مین شپ کی مدت مختصر ہی رہی اور جلد ہی اس حصار سے باہر نکل آئے۔ اب ان کی توجہ شعبہ پر تھی۔ سید محمد عقیل کے ریٹائرمنٹ کے بعد جعفر رضا صدر شعبہ ہوئے جو کسی بنا پر عقیل صاحب کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی انھیں ناپسند کرتے تھے۔ کہ ناپسندی اور بڑبولاپن ان کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسی لئے جوابا وہ بھی ناپسند کیے گئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ فضل امام کی شخصیت میں کچھ ایسا کرشمہ تھا کہ وہ بظاہر عقیل صاحب کے حمایتی ہوتے ہوئے بھی جعفر رضا کے دور صدارت میں بہ آسانی پروفیسر ہوئے اور میں ریڈر نہ بن سکا جس کا مجھے کوئی قلق نہیں۔ وہ ہر وائس چانسلر کے قریب ہوتے، کبھی پراکٹر ہوتے، کبھی کچھ اور۔ بارے کسی طرح جعفر رضا کا دور ختم ہوا تو فضل امام صدر شعبہ ہوئے۔ اور مختصری مدت میں ہم دونوں نے مل کر کئی اہم کام کیے جس میں ایک اہم کام احتشام حسین سیمینار تھا جو بہت کامیاب ہوا۔ شعبہ میں ایک بڑا حال بنا جس کی تعمیر کا دعویٰ جعفر رضا کرتے رہے لیکن سنگ بنیاد پر فضل امام کا نام درج ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس لئے کہ فضل امام اپنی ذات سے شعبہ کو فیض پہنچا رہے تھے اور جعفر رضا شعبہ کی وساطت سے اپنی ذات کو۔ اس کا ثبوت فضل امام کی وہ کتاب (امعان

نظر) ہے جو شعبہ اردو کے نام معنون ہے جبکہ وہ اس شعبہ کے طالب علم نہیں رہے اور استاد کی حیثیت سے محض چودہ برس ہی رہے۔ جعفر رضا اسی شعبہ کے طالب علم رہے، تیس برس سے زیادہ استاد رہے لیکن وہ شعبہ کی فضا کو مکدر ہی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضل امام آج بھی شعبہ میں آتے جاتے ہیں عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جعفر رضا بقول نظیر اکبر آبادی ''کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے' کا مصداق بن گئے۔ شعبہ سے سچائی اور گہرائی سے وابستگی سے جہاں کچھ اچھے کام ہوئے وہیں فضل امام نے علم و ادب کی دنیا میں کئی اہم کتابیں پیش کیں۔ انیس پر تو وہ بہت اچھا کام کر ہی چکے تھے، جس پر انھیں ڈی لٹ. کی ڈگری ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک اہم کتاب مشرقی انتقادیات لکھی۔ اس موضوع پر ہمارے یہاں کم کام ہوئے ہیں۔ یہ اہم کام وہ اس لئے بھی کر سکے کہ وہ عربی فارسی، قدیم و کلاسیکی ادب پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں۔ اور فضل امام میں باطنی سطح پر معروضی نوعت کے تجزیے کا مادہ موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تجزیہ اکثر تحقیقی زیادہ ہوتا ہے تنقیدی نسبتاً کم اور اس سے بھی زیادہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کے باطن و خارج متصادم ہوتے ہیں۔ اور خارج کی فتح ہوتی ہے۔ تضادات و تصادمات کا یہی وہ نازک موڑ ہے جہاں فنکار و فنکار کو اپنی انانیت مقصدیت کو بالاتر رکھنا پڑتا ہے۔ فضل امام نے یہ کیا اور کئی بار کیا کہ اصلاً وہ مذہبی انسان ہیں اور خوف خدا رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں کہ فضل امام بھی ہماری طرح انسان ہیں اور انسان تو خاک کا پتلا ہے۔ غلطیاں کرتا ہے اور اس سے سیکھتا بھی ہے۔

پروفیسر ہو جانے کے بعد اور ریٹائر ہو جانے کے بعد عام استاد پڑھنا لکھنا بھول کر یا تو خدا کی خدمت میں لگ جاتے ہیں یا دنیا داری، رشتہ داری وغیرہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن فضل امام عام سے استاد اور انسان نہیں ہیں۔ وہ واقعی ایک رائٹر ہیں، ایک جینون رائٹر۔ ادھر ان کی کئی کتابیں جو اقبال اور جدید مرثیہ سے تعلق رکھتی ہیں ریٹائرمنٹ کے بعد ہی آئی ہیں اور عمدہ کاوشیں ہیں۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ شیعہ مسلک ہونے کے ناتے وہ مرثیہ، جدید مرثیہ، مرثیہ انیس وغیرہ پر اچھے کام کر سکے ہیں لیکن جب میں نے ان کی

اقبال پر کتاب دیکھی اور مضامین پڑھے تو دل خوش ہو گیا۔ یہ خوشی اس بات پر کم تھی کہ انھوں نے اقبال کا مرد مومن اور مسلک تلاش کیا تھا بلکہ اس لئے زیادہ تھی کہ انھوں نے بڑے سلیقے سے اقبال اور عشق اہل بیت اور غم شہدائے کربلا در مقصود اقبال کو بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا تھا۔ اور یہ پیشکش فضل امام کے ذریعہ ممکن تھی۔ اس پیشکش کو انھوں نے آج کے نظریاتی اژدہام سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''آج کی اس دنیا میں جبکہ نظریات کا اژدہام ہے
عالم اسلام میں بھی نئی نئی تحریکیں جنم لیتی جا رہی ہیں۔ اور
ماہ محرم کا چاند آسمان نیل فام پر نمودار ہوتے ہی بھانت
بھانت کے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔''

انھیں علامہ اقبال کے نظریہ غم محمد اور آل محمد کو دیکھنا، سمجھنا اور برتنا چاہیے تاکہ حقیقت غم حسین سمجھ میں آسکے اور ملت اسلامیہ ٹھوس اور اٹل حقیقت سے اپنی زندگی اور عاقبت سنوار سکے۔ بقول اقبال۔

حقیقت ابدی ہے مقام بشری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

اس خیال میں شیعت کم انسانیت زیادہ ہے۔ یہ غیر محدودیت ہی ان کے ترقی پسند مسلک کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ان کے ترقی پسند مسلک کو اور قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ہے تو ان کے مضامین کے تازہ ترین مجموعہ امعان نظر کو ملاحظہ کیجیے، جس میں واقعی نظر کی گہرائی ہے۔ نظریاتی وابستگی اور علمی وتنقیدی، سنجیدگی، پختگی وبالیدگی نظر آتی ہے۔ آپ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی علمیت، معروضیت، مشرقی انداز نظر اور گہرے تجزیاتی انداز سے انکار نہیں کر سکتے۔ بس گڑبڑ وہاں ہوتی ہے جہاں وہ مخالف اور مغربی تھیوریز سے اختلاف کی حدوں سے آگے بڑھ کر طنز وتمسخر کی راہ پر آجاتے ہیں اور اچانک ساختیات کو واہیات کہنے لگتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شاںل میر، اکبر، احتشام حسین، سجاد ظہیر، کبیر وغیرہ پر مضامین ان کی دلچسپیوں کی تہہ داری اور موضوعات کی رنگارنگی کو دیکھ کر داد

دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اسی طرح گزشتہ برس (۲۰۱۷) میں شائع ان کے مضامین کا مجموعہ انتقاد احتساب ملاحظہ کیجیے۔ ان مضامین کے عنوان ہی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف اس کتاب میں مشرقی تنقید کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ عربی فارسی تنقید نگاری پر وقیع مضامین ہیں تو دوسری طرف ہندی سنسکرت تنقید پر بھی مضامین ہیں۔ ساتھ ہی علم بیان، علم بدیع وغیرہ پر سنجیدہ و معیاری مضامین ملتے ہیں۔ جدید تنقید کی گمراہی میں ایسی راستی اب دیکھنے کو کہاں ملتی ہے۔

فضل امام جس مشرقی تہذیب، علم و فکر تعلیم و تدریس سے زندگی بھر وابستہ رہے آج بھی اسی طرح سے وابستہ ہیں۔ پڑھتے لکھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کے پیچ و خم اور سرد و گرم سے وہ بھی دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ان کی بیگم یعنی ہماری بھابی صاحبہ انھیں بڑا سہارا دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے پڑھنے لکھنے میں کمی نہیں آسکی ہے۔ ان کا قلم اور قدم آج بھی مصروف کار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اب تجربے، عمر اور فکر کی جس منزل پر پہنچ چکے ہیں اس میں تبدیلی آنا مشکل ہے۔ افکار و نظریات کی جس بلندی پر پہنچ چکے ہیں وہاں سے پلٹ کر آنا ممکن نہیں اور الٹنا پلٹنا یوں بھی ان کی فطرت میں نہیں ہے۔ یہ ایک خوبی کی بات تو ہے لیکن زندگی کے اپنے تقاضے اور مطالبے ہوا کرتے ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہے تو بدلتی بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علم و فن کی دنیا میں بھی بدلاؤ آتے ہیں۔ ان بدلاؤ کو بھی سنجیدگی سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس نئے پن میں انسانی فکر و فطرت کے سایے ملتے ہیں تو کچھ روشنیاں بھی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ آج کا جو ادبی ماحول ہے۔ یونیورسٹیاں اور اس کے اساتذہ جس بھیڑ بھاڑ والی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اس میں بازار واد اور مفادات زیادہ دکھائی دے رہے ہیں۔ اس ماحول میں فضل امام، سید محمد عقیل، شارب ردولوی جیسے سنجیدہ و خاموش طبع اساتذہ اسکالرز مس فٹ ہیں۔ شاید انھیں اس کا احساس بھی ہے لیکن اس کا قلق ہرگز نہیں اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ لوگ بے نیازی او فقیروں کا لبادہ اوڑھے ہوئے مشرقی مزاج و تہذیب کے وہ اساتذہ ہیں جن کو اپنی انسانی، اخلاقی، مشرقی قدروں کا لحاظ ذاتی مفاد سے زیادہ عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے فضل امام ریٹائر ہو

کر نہ جانے کیا سوچ کر لکھنؤ جا کر خاص شیعوں کے محلے میں بس کر بھی لکھنوی روایتی شیعہ نہیں بن سکے ہیں۔ نہ روتی، نہ جوادی، نہ ذاکری نہ چاکری، گوشے میں بیٹھے سمٹے وہ آج بھی پروفیسر فضل امام ہی ہیں۔ اعظم گڑھ، گورکھپور، الہ آباد والے فضل امام، محمود الٰہی کے شاگرد فضل امام۔ ترقی پسند نظریہ سے منسلک فضل امام۔ حق گو حق پرست فضل امام۔ یہ فضلِ امام ہے یا کرپا رام کی ہے کہا نہیں جا سکتا۔ میرے لئے آج بھی وہ بڑے بھائی ہیں۔ ترقی پسند ادیب ہیں۔ ایک عمدہ مقرر و مفکر۔ بس اسی پر زندگی ختم اور اسی پر مضمون بھی ختم۔

□□□

حلقہ کیے بیٹھے رہو.......

ہمارے بڑے بھائی، دوست اور ہندی زبان و ادب کے ممتاز و مقبول ادیب و ناقد پروفیسر راجیندر کمار نے اپنی عمر کے پچھتر برس پورے کر لئے۔ دوستوں اور محبت کرنے والوں نے ان کے اعزاز میں تہنیتی جلسے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ ضروری بھی تھا۔ اس لئے کہ غیر ادبی اور غیر محفوظ ملک و معاشرہ میں جہاں ادیبوں و دانشوروں کے احترام و عزت میں روز بروز کمی آتی دکھائی دے رہی ہے اگر ہم پڑھنے والے ہی اپنے بزرگ ادیب و شاعروں فنکاروں کی عزت اور توقیر نہیں کریں گے تو آج کے سیاست دان اور حکمران تو کرنے سے رہے۔ اس لئے آج کی یہ تقریب ضروری ہے اور مبارک بھی۔ سب سے پہلے تو میں اپنے بڑے بھائی اور مہربان شخصیت کو دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ سو سال تک جئیں اور اسی طرح سرگرم عمل رہیں۔ لیکن ''پچھتر پار'' کے عنوان دیکھ کر جہاں خوشی کا گمان ہو رہا ہے وہیں ہلکا سا ڈر بھی لگ رہا ہے۔ یہ پار کا لفظ آر پار کا بھی احساس دلاتا ہے۔ خیر آر پار کا معاملہ تو کبھی نہ کبھی ہوتا ہی ہے اور سب کے ساتھ ہونا ہے اس لئے اس سے ڈرنا کیا۔ لیکن ڈر لگتا ہے اس سناٹے اور خالی پن سے جو ایک معقول و بڑا ادیب اپنے بعد چھوڑ جاتا ہے اور جو بھرتا نہیں دکھائی دیتا۔ جو اب دھیرے دھیرے الہ آباد کو بھی اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ اور یہ احساس ہر اس شخص کو ہوگا جس نے بھرے پرے الہ آباد کو دیکھا ہے۔ میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آخری بہار تھی، لیکن کیا بہار تھی۔

میں نے جب اپنی تعلیمی و ادبی زندگی کی شروعات کی تھی تو اس وقت شہر میں شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کی بہار ہی بہار تھی۔ ان معمولی آنکھوں نے غیر معمولی شخصیتوں کے دیدار کیے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے قدموں میں بیٹھا ہوں، مہادیوی ورما کے قریب سے درشن کیے ہیں۔ سمترانندن پنت کی زلفیں دیکھی ہیں۔ امرت رائے کی رس

گھولنے والی آواز محبوبانہ انداز کو دیکھا ہے۔ اپیندر ناتھ اشک کے کاروباری انداز کو بھی دیکھا ہے بلکہ برداشت کیا ہے۔ بھیرو پرساد گپت کی کڑک اور رعب دار اور انانیت سے پر شخصیت کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ کہ ایک خوددار ادیب کیا اور کیسا ہوتا ہے۔ پروفیسر رام سروپ چترویدی، پروفیسر رگھوونش، پروفیسر جگدیش گپت، امرکانت، ماکنڈے وغیرہ ایک طرف تو دوسری طرف پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر سید محمد عقیل، بلونت سنگھ، محمود احمد ہنر وغیرہ کیا بہار تھی، کیا تکرار تھی۔ ہندی اردو کی ایکتا تھی۔ ایک پریوار، ایک خاندان کی طرح جو کم وبیش آج بھی برقرار ہے۔ انھیں زمانوں میں ہم نے راجیند رکمار کو بھی دیکھا۔ ستیہ پرکاش مصرا، دودھ ناتھ سنگھ، رویندر کالیہ، ممتا کالیہ، وغیرہ کو بھی دیکھا جو جوان تھے اور ہم نوجوان۔ لیکن ان سب میں راجیند رکمار کی جوانی میں شرافت تھی اور باقی سب میں شرارت۔ اپنی سنجیدگی، خاموشی اور شرافت کی وجہ سے وہ جوانی میں ہی بزرگ لگتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بچپن میں بھی بزرگ رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے یہ بزرگی کا نقاب پیدائشی ہو۔

فراق گورکھپوری کہا کرتے تھے کہ اچھی و بڑی شاعری کے لئے تھوڑی بہت آوارگی اور بدچلنی ضروری ہوا کرتی ہے۔ یہ بات وہ پوری سنجیدگی سے کہتے اور گھنٹوں آوارگی اور بدچلنی کی اہمیت اور صحت اور ادب سے اس کے نرم ونازک رشتوں پر تقریر کرتے رہتے کہ ہم حیران رہ جاتے پھر ہمیں یقین سا ہوگیا۔ ہم نے بھی یہ نیک راستہ اختیار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن لڑکھڑائے اور منہ کے بل گرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عمدہ ادیب نہ بن سکے۔ لیکن پھر راجیند رکمار اتنے بڑے ادیب کیسے بن گئے جبکہ ان کے اندر آوارگی کی صلاحیت تو مجھ سے بھی کم ہے لیکن ہو بڑے ادیب ہیں اور ساتھ ہی شریف اور مہذب انسان بھی۔ یہ دونوں بوجھ کوئی ایک ساتھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔ یہ راز صف راجیند ر کمار ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کے پاس نہ صرف شرافت کا بلکہ سادگی اور متانت کا بڑا خزانہ ہے۔ وہ کانپور جیسے کاروباری شہر سے ضرور آئے ہیں اور سائنس کے طالب علم ضرور رہے ہیں لیکن برسوں سے الہ آباد کے صوفیانہ وفقیرانہ کلچر میں رہتے ہوئے یہیں کی مقدس مٹی

میں رَل گئے ہیں۔ وہ الہ آباد سے زیادہ پریاگ میں رہے ہیں اسی لئے سنتوں کا خمیر اور صوفیوں کا ضمیر ان کی سادہ اور نرم شخصیت میں گھل مل گیا ہے۔ یہ جو آج کے جلسے کا دعوت نامہ ہے اس میں جو راجیند ر جی کی تصویر ہے اور اس تصویر میں جو بڑے بڑے چار خانے کی صدری ہے اس کو میں تقریباً بارہ پندرہ برسوں سے ان کے بدن پر دیکھ رہا ہوں۔ یہ اکلوتی صدری ہے جس پر پورا کڑک سے کڑک جاڑا شرما کر منہ موڑ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جوتا بھی، موزہ بھی، ایک ایک سویٹر بھی۔ کیسے گزارہ کرتے ہیں یہ؟ مجھے تو اسی پر حیرت ہوتی ہے، پھر خیال آتا ہے کہ جب وہ گزشتہ چالیس پینتالیس سال سے ایک ہی ہم سفر پر گزارہ کر سکتے ہیں تو صدری، جوتا موزہ کی حیثیت کیا۔ یہ تو غیر جاندار چیزیں ہیں۔ خیر یہ سب باتیں تو لطف کے لئے ہیں پر سچ بات یہ ہے کہ راجیند ر جی کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے دنیا کی، سماج کی مادیت سے اپنے آپ کو بچا رکھا ہے۔ ایک لمبی ملازمت و مدت گزر جانے کے بعد بڑی مشکل سے سر چھپانے کو ایک چھوٹا سا گھر بنا سکے وہ بھی اس وقت جب بچے بڑے ہونے لگے۔ راجیند ر جی کے دو بیٹے ہیں، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب بیوی ایک، صدری ایک تو بیٹے دو کیسے ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں میاں بیوی کے ہوتے ہوئے دونوں نے ایک ایک تقسیم کر لیا ہے۔ تاکہ گھر میں سکھ اور سکون رہے۔ بہر حال اب تو ماشاء اللہ بیٹے ہیں، بہوئیں ہیں، پوتے پوتیاں ہیں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ پوتے پوتیوں سے کھیلتے ہیں یا پوتے پوتیاں ان سے کھیتے ہیں۔ اس لئے کہ راجیند ر جی پچھتر کے ضرور ہو گئے ہیں لیکن ان کے اندر کا معصوم بچہ اب بھی زندہ ہے۔ اور خدا کرے کہ وہ زندہ رہے اس لئے وہ اگر زندہ رہا تو وہ سو سال کے ہو کر بھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ ایسا مجھے یقین ہے۔

راجیند ر جی کے ساتھ ہم نے دہائیاں گزاری ہیں۔ محفلوں میں، مذاکروں میں، سفر میں، حضر میں، تیج تہواروں میں۔ ادب واحتجاج کے ہر محاذ پر ہم ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ کام کیا ہے اور محبت کا جام پیا ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ کاش ان کا کوئی دنیاوی محبوب ہوتا اور ہم اس سے مل پاتے لیکن جہاں تک میں ان کو جان سکا ہوں ان کا

کوئی محبوب نہیں ہے۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر انھوں نے کتابوں کو اپنی محبوبہ بنالیا ہے اور پڑھنے پڑھانے کو ہی ہجر و وصال کا درجہ دے دیا ہے۔ اس قدر اور ایسا کہ اپنی غیر معمولی ریاضت اور تپسیا کے بعد وہ خود ہی محبوب بن گئے ہیں۔ الہ آباد کے محبوب۔ ہندی ار اردو کے محبوب۔ یہاں تک کہ جھونسی میں رہنے والے، جھونسیائے ہوئے دودھ ناتھ سنگھ کے بھی وہ محبوب ہی تھے۔ محبوبیت کی ایسی دلکش و دلنوز تصویر تو اردو شاعری کے محبوب میں بھی کم دیکھنے کو ملتی ہے کہ جسے عاشق بھی پسند کرے اور اس کا رقیب بھی۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ہندی جگت کے محبوب اردو کے بھی محبوب جان بن جائیں اور شاید بن بھی گئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جتنی اور جیسی اردو جانتے ہیں اور جس طرح اردو شاعروں خاص طور پر میر، غالب، فراق، فیض وغیرہ پر ان کی نظر ہے اور جو نظریہ ہے اس کو دیکھ کر تو ہم بھی حیران رہ جاتے ہیں اور کبھی کبھی پریشان بھی۔ وہ تو ہندی کے جلسوں اور تقریروں میں بھی اردو کے اشعار پڑھتے چلے جاتے ہیں کہ جن کو عام اردو والے تو در کنار اردو کے اساتذہ بھی ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتے۔ ابھی حال میں وجے دیو نرائن ساہی پر تقریر کرتے ہوئے اقبال کا ایک گہرا اور سنجیدہ شعر ایک خاص زاویہ سے پڑھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے، میرا نام لیتے ہوئے شعر کا پہلا مصرع پڑھا اور پھر یاد کر کے دوسرا مصرع پڑھا۔ وہ شعر مجھے بھی یاد نہیں تھا اگر مجھ سے پوچھ لیتے تو بر سر محفل میری رسوائی ہو جاتی لیکن انھوں نے پورے اعتماد سے یہ شعر پڑھا۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر ہے اس زمانے میں

ایسے کئی واقع آئے جب انھوں نے اردو شاعری اور شاعروں پر عمدہ تقریر کی۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۰۰۸ء میں جب میں نے غالب اور الہ آباد کے عنوان سے سیمینار کیا تھا تو اردو کے ادیبوں کے ساتھ ساتھ میں نے راجیندر جی سے بھی مضمون لکھنے کی گزارش کی تھی تو انھوں نے اس گذارش کو فوراً مانا اور ایک مقالہ بعنوان 'غالب ۱۸۵۷ء اور فکر دنیا' پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اسی طرح ایک تقریر میر پر غیر معمولی تھی۔ اور ایک چکبست پر۔ پریم چند اور منٹو پر تو وہ مہارت ہی رکھتے ہیں۔

اردو ادب سے دلچسپی رام سروپ چترویدی اور دودھ ناتھ سنگھ کو بھی تھی۔ اس مقام پر راجیندر جی ان لوگوں سے دو قدم آگے ہی نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ راجیندر جی صرف تنقیدی مضامین ہی نہیں لکھتے بلکہ انھوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ رسالہ کے مدیر رہے ہیں۔ شاعری بھی کی ہے۔ ہندی میں نظمیں کہی ہیں، اردو طرز پر غزلیں بھی کہیں ہیں۔ یہ غزلیں ان کا نہ دکھائی دینے والا آئینہ ہے، جس میں کہیں کہیں شباب جھلک اٹھتا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہو سکا کہ غزل میں دل کی زبان بولتی ہے، دماغ کی نہیں۔ یہ دو شعر دیکھئے۔

ابھی بھی آگ باقی ہے کہ لوہا بھی ہے دنیا کا
چھپا بیٹھا ہے بوڑھے جسم میں اک نوجواں بانکا
اگر کل خواب بن جاؤں تو ان آنکھوں کو دے دینا
جو کھینچا چاہتی ہیں اک بدلتی دنیا کا خاکہ

غور طلب بات یہ ہے کہ بوڑھے جسم میں چھپا بانکا نوجوان اپنے محبوب کے لئے کم زندہ ہے بلکہ دنیا کو بدلنے کا خواب اسے جوان کئے ہوئے ہے۔ یہاں معاملہ شباب کا کم خواب کا زیادہ ہے اور خواب دیکھنا انسان کی فطرت ہے لیکن خوابوں کی فطرت تو شاعر کی حقیقت سے اپنا رشتہ تو بناتی ہے اس کے نظریہ اور سوچ سے اور جس کی سوچ آسمان کے بجائے زمینی ہوگی اس کے خواب بھی زمینی سچائیوں سے جڑے ہوں گے۔ اس شعر میں دیکھئے، میری بات درست لگے گی۔

ہاتھوں سے اٹھا لو مجھے ماتھے سے لگا لو
میں خاک ہوں زمیں کی آسماں نہیں ہوں میں

ایک شعر اور دیکھئے۔

خواہش بھلا بننے کی مجھے کیوں بھلا ہو گئی
اچھا ہے ان کی نگاہوں میں اچھا نہیں ہوں میں

اس شعر میں ہلکی سی آوارگی اور دیوانگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے زیادہ بے نیازی اور قلندری، یہ وہی بے نیازی ہے جو میر تقی میر کو قشقہ کھینچے اور دیر میں بیٹھنے

پر مجبور کرتی ہے اور غالب دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہیں۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

جب شاعر اپنی دھرتی سے گہرا رشتہ جوڑ لیتا ہے اور اس رشتے میں جذبات کے ساتھ ساتھ نظریات بھی شامل ہو جاتے ہیں تو پھر گوشت پوست کا محبوب رخصت ہو جاتا ہے۔ زمین محبوبہ ہو جاتی ہے اور زمین کے باسی یا عام انسان اس کے جگر کے ٹکڑے اور اگر ٹکڑوں پر مصیبت آئی ہو یا آگ لگی ہو تو شاعر کا دردمند دل تڑپ اٹھتا ہے اور یہ کہہ اٹھتا ہے۔

کیسی لگی ہے آگ ادھر بھی ادھر بھی
بگلائے لوگ باگ ادھر بھی ادھر بھی
کچھ سر پھرے دین دھرم کے نام کو
کرتے ہیں داغ داغ اِدھر بھی ادھر بھی
ہم واسطہ دیتے رہے انسانیت کا پر
پھنکارتے ہیں ناگ ادھر بھی ادھر بھی
یہ کون ہے اجاڑ کر جو دل کی بستیاں
ہوتا ہے باغ باغ ادھر بھی ادھر بھی

ان اشعار مین شاعر کے درد و غم کو ملاحظہ کیجئے۔ جب زمین پر آگ لگی ہو تو دل میں محبت کے کاغذی پھول نہیں کھلتے بلکہ آتما پگھلتی ہے اور اشعار میں ڈھل جاتی ہے۔ غزل کی نازک مزاجی اس آگ کو آسانی سے برداشت نہیں کر پاتی لیکن احساس کی نزاکت، زبان کی لطافت دل کے درد کے ساتھ جڑ جاتی ہے تو اشعار گیان دھان کی سرحدوں کو چھونے لگتے ہیں۔ لوگ باگ، داغ داغ اور باغ باغ کی لے و دھن شعر میں حسن تو

پیدا کرتی ہے لیکن اس سے زیادہ درد کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ درد اگر سچا ہو تو اس میں انسانی خوبصورتی کی گونج دور تک سفر کرتی ہے۔ دیکھنا یہی ہے کہ شاعر کا درد ذاتی ہے یا کائناتی اور جن شاعر کائنات کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے تو درد میں ایک آہنگ پیدا کر دیتا ہے، ایک سوز اور سوزش، پھر یہی سوزش غم میں خوشی اشک میں قہقہہ تلاش کرنے لگتا ہے۔ شاعر جب اس منزل پر پہنچتا ہے تو پھر ایسی غزل جنم لیتی ہے۔

اشک ہوتا یا کسی کا قہقہہ ہوتا   جو بھی ہوتا آدمی کا آسرا ہوتا

او پھر یہ تیور اور لہجہ بھی سامنے آتا ہے۔

منھ حقیقت سے چرا کر بیٹھنا کیا
طے ہے آخر اک نہ اک دن سامنا ہونا

اور گیان دھان کی یہ منزل بھی۔

سیکڑوں پردوں میں ہو تو جھلک اٹھے
خود بخود سچ جس میں ایسا آئینہ ہونا

ان اشعار میں گیان دھان، زمین آسمان اور سب سے بڑھ کر انسان سبھی کچھ سمٹ آئے ہیں۔ اس میں کچھ راجیندر جی کا اپنا ہے۔ کچھ الہ آباد کے صوفیانہ کلچر کا ہے اور کچھ وطن اور اس کے ماحول کا ہے۔ ایک عمدہ اور بامقصد غزل ایسے ہی عناصر سے جنم لیتی ہے۔ اس ملی جلی کیفیات میں اب راجیندر جی اکیلے نظر آتے ہیں۔ وہ تو بہت ساری روایتوں، مشترکہ تہذیب اور صوفی روایت کی بھی آخری نشانی سے لگتے ہیں۔ بازار واد نے جس طرح سے پورے سماج کو جکڑ لیا ہے اس جکڑن میں شاعر ادیب ابھی آ گئے ہیں۔ سیاست کا بے ہنگم شور جاری ہے۔ نگاڑے بج رہے ہیں اور ہم سبھی کسی نہ کسی شکل میں اس شور کا حصہ بن گئے ہیں یا خاموشی سے کنارے ہو گئے ہیں۔ ایسے میں پریاگ میں راجیندر کی پریاگ کی ایک کٹیا میں بیٹھے سوتے جاگتے اس فکر میں ہیں کہ۔

دنیا اسیر حرص و ہوس اور ہمیں یہ فکر
انساں کے بیچ رشتۂ جاں کس طرح بنے

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ الہ آباد شاعروں و ادیبوں کا مرکز رہا ہے۔ بزرگوں کے رخصت ہو جانے کے بعد آج یہ مرکز لڑکھڑا سا گیا ہے۔ شیکھر جوشی، ممتا کالیہ، وی. این. رائے، لال بہادر ورما وغیرہ کے شہر سے باہر چلے جانے کے بعد خاص طور پر اسے گم ہوتے ہوئے ماحول میں ایک راجیندر جی ہیں جن کے دم سے زندگی ہے، روشنی ہے۔ خدا کرے یہ روشنی دیر تک قائم رہے۔ یہ میری خواہش ہے اور دعا بھی۔ فیض کے اس شعر پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

❑❑❑

سید عاشور کاظمی کی یاد میں

یاد ہے کہ عاشور کاظمی سے مجھے قمر رئیس نے ملوایا تھا۔ شاید ۱۹۸۵ء کی ابتدا کی بات ہے۔ قمر رئیس تازہ تازہ برطانیہ سے لوٹے تھے، وہاں فیض پر کوئی پروگرام تھا۔ وہیں ان کی پہلی بار عاشور کاظمی سے ملاقات ہوئی تھی جو دوستی میں بدل گئی، دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ میں قمر صاحب کے بیحد قریب تھا، بے حد قریب۔ وہ ہر سفر حضر کے بارے میں مجھ سے گفتگو کرتے تھے، رائے مشورے ہوتے تھے۔ قمر صاحب میں گہرائی و سنجیدگی تو تھی، تھوڑی سی دنیاداری بھی تھی شاید انھیں حوالوں سے ان کے عاشور کاظمی سے رشتے قائم ہوئے تھے جو مجھے عجیب لگے تھے لیکن بعد میں جب میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری ہوا تو صاف اندازہ ہوا کہ تنظیم و تحریک کی بقاء اور ارتقاء کے لئے اور اسے وسیع و متحرک کرنے کے لئے بہت سارے رشتے بنانے پڑتے ہیں جو کبھی بڑے کامیاب اور تاریخی قسم کے ثابت ہوتے ہیں۔ رشید جہاں نے فیض کو اسی طرح تلاش کیا تھا، سجاد ظہیر نے کیفی اعظمی کو اور بھی مثالیں ہیں، شاید اسی طرح قمر رئیس نے عاشور کاظمی کو دریافت کیا کیونکہ اس سے پہلے عاشور صاحب کا نام اردو دنیا میں زیادہ جانا پہچانا نہ تھا حالانکہ وہ شاعر تھے اور اچھی خاصی شاعری کرتے تھے لیکن تجارت میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ قمر صاحب برطانیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل نو اور تحریک مسلسل چاہتے تھے اس لئے کہ انھیں ایک متحرک ترقی پسند کی تلاش تھی جو انھیں عاشور کاظمی کی شکل میں نظر آیا۔ فیض سیمینار میں عاشور کی شرکت حسن نظامت اور فکر و نظر کی استقامت دیکھ کر قمر صاحب متاثر ہوئے تھے۔

انھیں خوشگوار لمحوں میں برطانیہ میں پھر سے انجمن بن گئی۔ پاکستان کے کئی سرکش اور پناہ گزیں مثلاً فارغ بخاری، شہرت بخاری، بخش لائل پوری جیسے شعراء لندن میں اقامت پذیر تھے۔ دوسری طرف اردو مرکز تھا جس کے سکریٹری انچارج افتخار عارف تھے، اس ادارے کے تحت بھی کئی شعراء و ادباء کو مدد حاصل تھی۔ برطانیہ کی انجمن کے صدر فارغ بخاری

ہوئے اور جنرل سکریٹری عاشور کاظمی۔ قمر رئیس نے ہندوستان آکر سب سے پہلی اطلاع مجھے دی اور یہ بھی بتایا کہ اس سال انجمن کی گولڈن جبلی پڑ رہی ہے جس کی شروعات لندن سے ہوگی۔ یہ کانفرنس عالمی نوعیت کی ہوگی جس میں ساری دنیا کے مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیب لندن میں جمع ہوں گے، مجھے یہ سن کر بیحد خوشی ہوئی۔ میں انجمن سے وابستہ ہو چکا تھا اور فعال تھا۔ الہ آباد کی انجمن کے ذریعہ کئی بڑے پروگرام کر چکا تھا جس کی وجہ سے میرے تعلقات اس وقت کے تمام اکابرین ادب سے بن چکے تھے۔ سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، وامق جونپوری وغیرہ تو بے پناہ محبت و شفقت کرتے تھے۔ قمر صاحب کا خورد میں ضرور تھا لیکن وہ ایک دوست کی طرح پیش آتے تھے۔ پوری بے تکلفی سے کہا ''لندن چلنے کی تیاری کرو'' میں سرشار تھا عاشور صاحب سے ملنے سے زیادہ اس کانفرنس میں شرکت کرنے اور برطانیہ گھومنے پھرنے کا شوق جاگا۔ لیکن جب یہ پتہ چلا کہ اپنے اپنے کرایہ سے جانا ہے تو حیرت ہے کہ تب بھی اس شوق میں کمی نہ آئی، بس اسباب کی تلاش شروع ہوگئی۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ عاشور صاحب ہندوستان آرہے ہیں، ہندوستانی ادیبوں کو مدعو کرنے اور وہ جیسے ہی ہندوستان آئے تو لندن جانے کی خواہش میں وہ ادیب بھی اچانک بڑے ترقی پسند ہوگئے جو اپنی تحریر و تقریر میں ترقی پسندی کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ قمر رئیس پٹھان ہونے کے باوجود مروت کے انسان تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کریں چنانچہ ایک طرف علی سردار جعفری، محمد حسن، سید محمد عقیل، قمر رئیس، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، نامور سنگھ، ش۔ اختر، محمود الحسن رضوی، علی احمد فاطمی جیسے کمیٹڈ ترقی پسندوں نے شرکت کی تو دوسری طرف وہاب اشرفی، لطف الرحمن، شکیل الرحمن، اعجاز علی ارشد جیسی روشن خیال اور دانشمند ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ تعداد کے اعتبار سے ہندوستان کا وفد سب سے بڑا تھا اور یہ کارنامہ قمر رئیس کا تھا کہ وہ تنظیم و تحریک کے سارے گر جانتے تھے۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ منجدھار سے زیادہ کگار پر کھڑے لوگوں کی فکر زیادہ کرنی چاہئے۔ گرمی فکر سے زیادہ حسن عمل سے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہئے کہ سجاد ظہیر کا یہی کارنامہ تھا۔ فراق گورکھپوری نے ایک بار کہا تھا کہ تحریک کے کامیاب ہونے کی

ایک بڑی وجہ سجاد ظہیر کے حسن اخلاق اور ایثار کی تھی۔ سجاد ظہیر کے بعد اس نوعیت کی چند خوبیاں قمر رئیس میں تھیں اسی لئے وہ ہر دل عزیز تھے اور بڑی حد تک کامیاب بھی۔

عاشور صاحب ہندوستان آئے۔ قمر رئیس کی ہدایت ہوئی کہ الہ آباد میں کوئی جلسہ ضرور کرو۔ انھیں بلاؤ، انھیں دنوں مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مشاعرے کا اہتمام تھا جس میں شرکت کرنے کے لئے کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں وامق جونپوری وغیرہ آ رہے تھے۔ میں نے دوسرے دن ایک جلسہ کا اہتمام کر لیا۔ جس میں ان تینوں شعراء کے علاوہ عاشور صاحب نے بھی شرکت کی۔ وہ تاباں صاحب کے ساتھ دہلی سے الہ آباد آئے۔ میں ان مہمانوں کا استقبال کرنے اسٹیشن پہنچا، تاباں صاحب کے ساتھ عاشور صاحب ڈبے سے باہر نکلے، تاباں صاحب سے تو میں جھک کر ملتا تھا۔ ایک عجیب شان تھی ان کی شخصیت میں۔ عاشور صاحب سے کیسے ملوں۔ یہ مرحلہ اس وقت اپنے آپ حل ہو گیا، جب مجھے دیکھتے ہی انھوں نے خود بڑھ کر گلے سے لگا لیا، کہا ''بھائی قمر صاحب نے آپ کا بڑا تذکرہ کیا ہے، ملنے کا اشتیاق تھا'' ظاہر ہے یہ سب اخلاقی اور مصنوعی باتیں تھیں۔ لیکن عاشور صاحب کی آواز میں کھنک تھی اور شخصیت میں جاذبیت۔

ان دنوں الہ آباد کے محلّہ راجا پور میں ایک ہوٹل تھا 'طاؤسی' جس کے مالکان تھے بیگم و محمد عسکری۔ عسکری صاحب تو جیپ فیکٹری میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور بیحد مصروف رہتے تھے لیکن ان کی بیگم عابدہ عسکری اور ان کا بیٹا یوسف ہوٹل سنبھالتے تھے۔ عابدہ عسکری بے حد سلیقہ مند، باذوق اور مہذب خاتون تھیں۔ وہ باقر مہدی اور ظفر مہدی کی خالہ تھیں اور شعر و ادب کا خاص طور پر ناولوں کا بے حد شوق رکھتی تھیں۔ ان سب کی وجہ سے ہم لوگوں سے بے حد اچھے تعلقات تھے۔ میری ادبی سرگرمیوں سے وہ دونوں بہت خوش رہتے اور مجھے اس بات کی پوری اجازت تھی کہ شہر میں کوئی بھی معزز ادبی مہمان آئے تو ان کے ہوٹل میں مفت قیام کر سکتا ہے۔ یہ ان کی طرف سے غیر معمولی تعاون ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی ادب نوازی اور مہمان نوازی کے پیش نظر میں نے تاباں صاحب اور عاشور صاحب کو اسی ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ چند دنوں کے قیام میں ہی عاشور صاحب عسکری خاندان

میں کس قدر گھل مل گئے اور عمدہ رشتے بن گئے یہ سب تفصیلی باتیں ہیں جو پھر کبھی کروں گا۔ ہوٹل کے کمرے میں بس رات بسر ہوتی ورنہ وہ لوگ ہمہ وقت ان کے گھر کے آنگن، کمروں میں ہی پائے جاتے۔ چائے کا دور چل رہا ہوتا۔ یہیں اندازہ ہوا کہ عاشور صاحب کے پاس گفتگو کرنے اور لمحہ بھر میں اپنا گرویدہ کر لینے کا جو فن ہے وہ ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔ چنانچہ بیگم عسکری، یوسف سبھی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ خوب خاطرداری ہوئی جس کا لطف اور ذائقہ میں نے ابھی اٹھایا اور مجھ سے زیادہ تاباں صاحب نے۔ تاباں صاحب اپنے ہی رنگ کا دودھ، دہی پا کر ایسا خوش ہوئے کہ بریانی کے بجائے اکثر دہی کھاتے ہی پائے گئے۔ وہ یوں بھی دہی کثرت سے کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ ان کے بدن میں خون کم دہی زیادہ ہوگا۔ بدن میں ہو یا نہ ہو لیکن شخصیت میں دہی کی خستگی ضرور تھی جس میں گلابی پن کے ساتھ ساتھ ہلکی سی تلخی بھی پائی جاتی تھی۔ حق پرست اور حق گو کے یہاں یوں بھی تلخی جزو خیال ہی نہیں جزو کلام بھی ہوا کرتی ہے پھر وہ تو فرخ آبادی پٹھان بھی تھے۔

رات کے مشاعرہ میں سامعین اور منتظمین خوش تھے کہ عاشور صاحب کی شرکت سے ان کی مشاعرہ عالمی نوعیت کا ہو گیا ہے حالانکہ اس میں پہلے ہی کیفی اعظمی، وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں جیسے عالمی نوعیت کے شاعر موجود تھے لیکن لندن کے تو نہ تھے۔ لندن سے ہم ہندوستانی اتنا متاثر رہتے ہیں کہ عام زبان میں جوش و رعب میں ''لندھن'' کہہ جاتے ہیں چلئے یہ تو عام بات سہی لیکن کا کیا کریں جو اکبر الہ آبادی نے کہا۔

چیز وہ ہے بنے جو ''لندن'' میں بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

مشاعرہ میں عاشور صاحب نے کچھ تعارفی قسم کی گفتگو کرنے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی غزلیں سنائیں جو بڑے ذوق و شوق سے سنی گئیں۔ ان غزلوں میں پاکستانی اقتدار کے خلاف جو مزاحمت تھی وہ شاعرانہ انداز میں سامعین کو پسند آ رہی تھیں۔ ان کا یہ شعر تو بے حد پسند کیا گیا اور بار بار سنا گیا۔

میرا دعویٰ ہے کہ یہ مٹی حوالہ ہے مرا
وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مستقل جاگیر ہے

پہلے تو میں خوفزدہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان پاکستان کی برائی کہیں کچھ گڑبڑ نہ کردے لیکن عاشور کے اشعار میں پاکستان سے محبت تھی، مزاحمت واحتجاج تو ارباب اقتدار سے تھی، پھر اب نئے قسم کے سامعین بھی بڑے سمجھدار ہوگئے ہیں انھیں اس قسم کی رومانی شاعری یا بے سر پیر کی گلے بازی سے زیادہ مزاحمتی واحتجاجی شاعری پسند آنے لگی ہے۔ بہ الفاظ دیگر انھیں جھنکار سے زیادہ للکار کی شاعری پسند آرہی ہے۔ اسی لئے انھیں عاشور کاظمی پسند آئے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا، بعد میں کئی بار جب میں نے عاشور کاظمی کی شاعری پڑھی یا سنی تو صاف اندازہ ہوگیا کہ عاشور کا لہجہ ضرور روایتی ہے لیکن ان کا مسئلہ آج کا ہے، آج کے پاکستان کا، آج کے انسان کا۔ میں نے کا شعری مجموعہ ''حرف حرف جنوں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

ذات کے اندر تلاطم، ذات کے باہر سکوت
مصلحت کوشی نے کیسی شخصیت تعمیر کی

سارے سجدے بے حرارت سب دعائیں نارسا
کیسے بے رونق ہوئے ہیں منبر و محراب سب

تہذیبوں کے جنگل میں یہ کیسا مہذب آقا ہے
جس نے ہر انسان کی قیمت صرف اک گولی رکھی ہے

ایک زمانے میں مغرب کے اردو شعراء دربدری کو ہجرت جیسا مقدس نام دے کر طرح طرح سے شعر کہہ رہے تھے۔ افتخار عارف، اشفاق حسین وغیرہ نے واقعی کچھ اچھے شعر کہے تھے لیکن عاشور صاحب نے ایک شعر ایسا کہہ دیا کہ اصطلاح کی نہ صرف معنویت بدل گئی بلکہ ایک سرے سے غائب ہوگئی۔ ہوسکتا ہے یہ بھی ہو کہ اب وہاں کے مسائل ہی بدل گئے ہوں تاہم عاشور کا یہ شعر ضرور ملاحظہ کیجئے۔

تلاشِ رزق میں ترکِ وطن ہے دربدری
اگر اصول ہوں پیشِ نظر تو ہجرت ہے

دوسرے دن ہم نے ایک جلسہ بھی کیا۔ جس میں عاشور صاحب کے علاوہ کیفی، تاباں، وامق وغیرہ نے شرکت کی۔ اس جلسہ میں عاشور صاحب نے عمدہ تقریر کی، غرض کہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ عاشور صاحب کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور ان کا سکہ جم گیا۔ اسی جلسہ میں انھوں نے ''لندن کانفرنس'' کا اعلان کیا۔ دعوتِ عام دی۔ اس کے بعد میرے توسط سے کچھ دعوت نامے بھی تقسیم کئے۔ اس کے بعد وہ لندن واپس چلے گئے اور میں لندن جانے کے تصورات میں گم ہو گیا۔ ویزہ ٹکٹ وغیرہ کے لئے جب دہلی گیا تو ہر طرف عاشور کاظمی کے چرچے تھے۔

لندن میں عقیل صاحب کے بھانجے ممتاز شاعر ودانشور باقر نقوی رہتے ہیں اس لئے عقیل صاحب اور میرے لئے قیام وطعام کا مسئلہ نہ تھا۔ ہم لوگ کانفرنس سے دس بارہ دن قبل ہی لندن پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر باقر نقوی کے ساتھ عاشور کاظمی بھی تھے۔ ان کی گفتگو، اخلاق وآداب کا وہی حال تھا۔ دوسرے دن میں ان کے گھر بھی گیا۔ ان کی بیگم عقیقہ بھابی اور دو پیاری پیاری بچوں سے ملا۔ ان کا پورا گھر کانفرنس کا دفتر بنا ہوا تھا، پھر بھی ہر چیز بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی کہ عاشور صاحب کے کام کرنے کا اپنا ایک طریقہ وسلیقہ تھا۔ چونکہ میں بھی ابتداء سے سیمینار کانفرنس کا آدمی رہا ہوں اس لئے کوٹ اتار کر زمین پر بیٹھ کر کانفرنس کا کام کرنے لگا۔ میرے ساتھ مسعود عابدی تھے، عاشور صاحب باہر کے انتظامات میں بھاگتے دوڑتے رہے ہم دونوں دفتر کا کام دیکھتے۔ فون اٹینڈ کرتے۔ اس مختصر سے وقفہ میں میں عاشور صاحب کی گفتگو اور جستجو، نرم گوئی اور دلجوئی وغیرہ کو آڑے ترچھے طریقہ سے دیکھتا رہا، محسوس کرتا رہا اور محظوظ بھی ہوتا رہا بلکہ بہت کچھ سیکھا بھی۔ ایسا نہ تھا کہ عاشور صاحب کی مخالفت نہ تھی لیکن کانفرنس سے قبل انھوں نے مجھے کیا کسی کو محسوس بھی نہ ہونے دیا اور کانفرنس نہایت کامیابی اور تزک واحتشام کے ساتھ انجام پائی۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے ادیبوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ روس، کنیڈا، امریکہ، سویڈن، ناروے، تاشقند، جرمنی اور نہ جانے کہاں سے لوگ آئے۔ سب کو مدعو کرنا، خط وکتابت کرنا، ان کا استقبال، قیام وطعام، ان سب کی دلجوئی یہ سارے

کام آسان نہیں ہوا کرتے۔ ایک لڑکی کی شادی ہوتی ہے بلکہ لڑکی کی شادی میں لوگوں کی ہمدردی اور جذبہ ہوتا ہے لیکن کانفرنس میں ادیبوں و شاعروں کے نخرے کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتے ہیں۔ ہر شاعر اچانک دو تین روز کے لئے عظیم شاعر ہو جاتا ہے اور ادیب چوٹی کا ادیب۔ اسی لئے سجاد ظہیر سے ایلیا اہرن برگ نے کہا تھا کانفرنس کرنا، ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا مینڈک تولنے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ ایک یادگار اور تاریخی کانفرنس تھی۔ جس کی ایک بڑی وجہ دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی شرکت تو تھی ہی لیکن دوسری بڑی وجہ عاشور صاحب کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت تھی۔ جس کی سبھی نے تعریف کی اور اچانک اس بڑی کانفرنس نے عاشور صاحب کو بھی بڑا بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ مخالفین اور حاسدین کے لئے یہ ایک کڑا اور برا وقت تھا۔ ایک مقام پر عاشور صاحب نے کانفرنس کے ایک اجلاس کی نظامت مجھے سونپ دی کہ انھیں بعض اکابرین کے ساتھ الگ بیٹھ کر منشور تیار کرنا تھا۔ میں نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا پھر بھی پاکستان کے کچھ ادیبوں نے اعتراض کیا کہ بغیر اجازت عاشور صاحب نے ہندوستان کے ادیب کو یہ حق کیوں دے دیا۔ ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے معاملات کچھ یوں ہی سے تھے۔ اچھی بات یہ ہے کہ گزرتے ہوئے وقت اور بڑھتے ہوئے میل ملاپ نے یہ معمولی باتیں ختم کر دیں۔

کانفرنس کے خاتمے کے بعد جیسا کہ عرض کیا حاسدین نے عاشور صاحب پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ خط و کتابت، اخبار بازی، گٹ بازی سبھی وہ کچھ ہوا جو اردو والوں کا محبوب ترین وطیرہ رہا ہے اور عاشور صاحب اکیلے ان گرم ہواؤں کا سامنا کرتے رہے۔ وہ اندرونی و بیرونی ادیب جو عاشور صاحب کی محنت و محبت کا قصیدہ پڑھتے تھے بالکل خاموش رہے حتیٰ کے قمر رئیس بھی خاموش رہے (اور وہ کرتے بھی کیا) اس سے عاشور صاحب قدرِ دل برداشتہ ہوئے۔ تھوڑا سا توازن ڈگمگایا اور منع کرنے باوجود وہ اپنے مخالفین کا جوب دینے یا دلوانے میں مصروف ہو گئے نتیجتاً لندن کچھ دنوں کے لئے اکھاڑہ بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ہند و پاک کا ادیب اس اکھاڑے میں اترتا ہی کیوں پھر ادیبوں کے لنگوٹ تو یوں بھی کمزور ہوا کرتے ہیں۔

میں نے ان سے بار بار کہا کہ عملی کام تو ہو چکا، اب علم کی طرف آیئے کہ علمی کارنامہ سب سوالوں کا جواب ہوتے ہیں اور سب کی زبانیں بند کر دیتے ہیں۔ ان کاموں کی طرف توجہ دینے میں انھوں نے قدرے تاخیر تو کی لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ شاعری کے بجائے نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند دنوں کے بعد ان کی ایک کتاب بعنوان ''سخن گسترانہ بات'' منظر عام پر آئی۔ بے حد خوبصورت چھپی ہوئی کتاب۔ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور جب پڑھا گیا تو ہر طرف عاشور صاحب کی نثر نگاری کی تعریف ہوئی۔ واقعی کیا عمدہ اور سلیس نثر تھی۔ ایسی لطافت کہ محسوس ہوا کہ رشید احمد صدیقی اور کرشن چندر شیر و شکر ہو گئے ہوں، جس میں عاشور صاحب کا اپنا رنگ بھی تھا۔ طنز کی ملاحت نے معنی کو ایک عجیب شوخ رنگ دے دیا تھا۔ اس پر لطف قسم کے بامعنی محاورے مزہ دے رہے تھے۔ عرصہ کے بعد ہر لطف اور سلیس کتاب پر ہم لہالوٹ ہو گئے۔ ہم نے جی لگا کر پڑھا اور اس زیادہ جی لگا کر تبصرہ کیا۔ سچ یہ ہے کہ اس تعریفی تبصرے میں عاشور کی کانفرنس والی شخصیت بھی کام کر رہی تھی جس پر مجھے یاد ہے کہ قمر رئیس نے ٹوکا بھی تھا اور کہا تھا ''دوستی الگ ہے اور ادب الگ۔ دونوں میں گھالا میلا نہیں کرنا چاہیے'' میں نے یہ بات دل میں اتار لی اور پھر ایسی غلطی کبھی نہ کی بعض دوست ناراض بھی ہوئے (جن میں عاشور صاحب بھی شامل تھے) لیکن میں کیا کرتا کہ اب یہ بات میرے اصولوں کا حصہ بن چکی تھی۔ اس تبصرے نے مجھے عاشور صاحب کے اور قریب کر دیا۔ اب بڑی بڑی باتیں اور بڑے بڑے منصوبوں پر باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد عاشور صاحب کی ایک اور کتاب آئی ''فسانہ کہیں جسے''۔ اس کتاب میں انھوں نے مغرب کے اردو افسانہ نگاروں کا تعارف کرایا، افسانے شامل کیے، لیکن ان سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی ان کا مقدمہ جو واقعی علمی و معروضی تھا۔ اس مقدمے میں ان کی نثر کا تخلیقی و تنقیدی رنگ دیکھنے کو ملا، لیکن اب میں محتاط تھا۔ ذاتی خط تو لکھے لیکن تبصرہ سے گریز کیا کہ تعریف مسلسل سے میری شخصیت کو خطرہ تو تھا خود ان کی شخصیت کو نقصان ہی پہنچتا لیکن یہ نازک بار عاشور صاحب سمجھ کر بھی سمجھنے کو تیار نہ تھے اور ہم بے بس تھے۔ شاید یہ بات انھیں پسند نہیں آئی تاہم وہ ایک وضعدار انسان بھی تھے انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ اسی

کے آس پاس ان کی ایک اور کتاب ''غداروں کے خطوط'' شائع ہوئی جس کے مرتبین میں سلیم قریشی بھی تھے۔ اس کتاب کے سلسلے میں طرح طرح کے چرچے ہوئے۔

اس درمیان غالباً ۱۹۹۸ء کے آس پاس قمر رئیس صاحب انڈین کلچرل سینٹر کے ڈائرکٹر ہو کر تاشقند چلے گئے۔ وہ اور میں دونوں کر نیا سفر نکالتے تھے جو اپنا مقام بنا چکا تھا۔ سچ یہ ہے کہ رسالہ دہلی سے شائع ہوتا تھا اور اس کا سارا کام قمر رئیس ہی دیکھتے تھے۔ مواد یا اشتہار کی فراہمی میں میں ان کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ ان کے تاشقند جانے سے رسالہ کے بند ہونے کے آثار نظر آنے لگے جو میں نہیں چاہتا تھا۔ عاشور صاحب اس درمیان کئی بار مجھ سے کہہ چکے تھے کہ آیئے ہم لوگ مل کر ایک ادبی رسالہ نکالیں لیکن ''نیا سفر'' کی موجودگی میں میں ان کی اس تجویز سے اتفاق نہ کر سکا۔ لیکن قمر صاحب کے تاشقند چلے جانے کے بعد جن ''نیا سفر'' بند ہونے کی نوبت آنے لگی تو انھوں نے پھر کہا ''بھائی فاطمی نیا سفر اپنا رسالہ ہے اسے بند نہیں ہونا چاہئے، آیئے اسے ہی ہم آپ مل کر نکالیں۔'' مجھے ان کی یہ تجویز مناسب لگی پھر بھی میں نے قمر صاحب سے مشورہ کیا اور کہا کہ نگراں کے طور پر آپ کا نام رہے گا اور مرتبین میں عشور کاظمی اور میں۔ قمر صاحب نے صاف طور پر کہا ''دیکھئے فاطمی صاحب! تجویز تو بری نہیں ہے لیکن سارے کام آپ کو ہی کرنے ہوں گے۔ ان سے کوئی توقع نہ کیجئے گا البتہ ان سے کہئے کہ وہ رسالے کو مالی تعاون دیں۔'' اور میں نے یہ بات صاف طور پر عاشور صاحب سے کہہ دی۔ جو انھیں بخوشی منظور ہوئی۔ رفتہ رفتہ باتوں کو میں بھی سمجھ رہا تھا لیکن رسالہ کے لئے، ایک اچھے کام کے لئے، ایک جوا کھیلنے میں کیا حرج ہے۔ کچھ دنوں کے بعد عاشور صاحب کی طرف سے ایک معقول رقم کا ڈرافٹ ملا اور میں جوش میں ''نیا سفر'' شائع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جس رسالہ کو قمر رئیس نکالتے تھے مجھے اس کے مقاصد اور معیار کا خیال تو رکھنا تھا۔ دو ایک شمارے نکلے، جو پرانے شماروں سے مختلف تھے۔ قمر رئیس، دعا شور کاظمی کے علاوہ اردو دنیا کو پسند آنے لگے اور میرا حوصلہ بڑھنے لگا۔

اسی درمیان غالباً اسی سال لندن میں جوش عالمی سیمینار کا اہتمام ہوا جس کے کنوینر عاشور صاحب تھے۔ انھوں نے مجھے لندن بلایا اور جب میں لندن ہیتھرو ایئرپورٹ

پہنچا تو مجھے لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ شبانہ بھی تھیں۔ شبانہ دہلی کی خاتون ہیں، جنھیں میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی طالبہ رہی ہیں اور غالباً قمر رئیس کی شاگرد بھی۔ انھیں عاشور صاحب کے ساتھ لندن میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ لیکن اس وقت میری حیرت دوگنی ہوگئی جب جب عاشور صاحب کی کار لندن میں اپنے گھر کے بجائے برمنگھم کی طرف دوڑنے لگی۔ میں عتیقہ بھابی اور بچیوں سے ملنے کے بیتاب تھا اور کار ان سے دور دوسرے سمت بھاگی جا رہی تھی، میں نے ہلکا سا سوال کیا۔ گول مول جواب ملتے رہے۔ بہرحال ہم برمنگھم پہنچے جہاں ایک فلیٹ میں ہم رہے۔ سب کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن مروت و محبت میں خاموش رہا۔ جوش سیمینار لندن میں تھا، چند دنوں بعد ہم لندن آئے لیکن اس درمیان ہم اقبال مرزا (مدیر صدا) کے یہاں ٹھہرے۔ مجھے یاد ہے کہ اس چھوٹے سے مکان میں ہم کئی لوگ یعنی عاشور کاظمی، علی احمد فاطمی، سائیں سچا، صادق نقوی، نسرین نقاش وغیرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اقبال مرزا کی بیگم بیمار تھیں اور نرسنگ ہوم میں تھیں اس لئے ہم لوگ خود ہی کھاتے پکاتے تھے۔ ایک بے تکلفی تو تھی لیکن بے چینی بھی۔ بہرحال سیمینار ہوا، جگن ناتھ آزاد، نثار احمد فاروقی، خلیق انجم، مظفر حنفی، افتخار نسیم، جعفر رضوی اور بہت سارے لوگ۔ جوش اور پاکستان کو لے کر خوب بحثیں ہوئیں۔ میں نے ان بحثوں کو رد کیا۔ یہ کہہ کر کہ ہم لوگ یہاں جوش کی شاعری پر بات کرنے آئے ہیں باقی باتیں فروعی ہیں، خیر یہ تفصیل الگ ہے۔ سیمینار تو ہو گیا اور مشاعرہ بھی۔ اور لوگوں سے ملاقات ہوئی لیکن میں عتیقہ بھابی اور بچیوں سے نہ مل سکا۔ ایسا نہ تھا میری اس بے چینی کو عاشور صاحب سمجھ نہ رہے تھے لیکن وہ کچھ مجبور تھے اس لئے ٹال رہے تھے اور میں پورے طور پر معاملات کو سمجھ بھی نہ پا رہا تھا۔

ہم لوگ پھر برمنگھم واپس آ گئے۔ اس بار ہمارے ساتھ آزاد صاحب، فاروقی اور خلیق انجم بھی تھے۔ ہم ساتھ ساتھ اسی گھر میں رہے۔ چند دن یادگار گذرے۔ برمنگھم شہر اور یونیورسٹی میں گئے جہاں عاشور صاحب کی عزت اور رسائی دیکھ کر خوشی ہوتی تھی لیکن ان کی ذاتی زندگی اور بیماری دیکھ کر دکھ بھی ہوتا تھا۔ مخالفت اور رقابت کا کم و بیش وہی حال تھا بلکہ اس میں ایک نازک حوالہ سے اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس قیام کے دوران ''نیا سفر'' سے

متعلق خوب خوب باتیں ہوئی کچھ اور منصوبے بھی بنائے مثلاً مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ میں عاشور صاحب کے دوستوں اور ادیبوں سے عاشور صاحب کی خدمات کے بارے میں مضمون لکھواؤں اور ایک کتاب ترتیب دوں، حالانکہ میری رائے تھی کہ یہ کام ابھی مناسب نہیں۔ دو ایک کتابیں اور آ جائیں تو ٹھیک رہے گا لیکن عاشور صاحب کی خواہش اور اس سے زیادہ شبانہ کے اصرار کی وجہ سے میں تیار ہو گیا اور میں اس کا معترف تو تھا کہ عاشور صاحب نے چند بڑے کام کیے ہیں ان کا اعتراف کیا جانا چاہئے لیکن یہ بھی خواہش تھی کہ وہ تحریر و تنقید کی سطح پر اور کام کریں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جب میں وطن واپس آیا اور عاشور صاحب کے قریب ترین ساتھیوں سے مضمون لکھنے کی گزارش کی تو بیشتر نے ٹال مٹول کیا۔ مجھے یہ بات بری لگی کہ جو لوگ عاشور صاحب کی شخصیت اور کارناموں کی تعریف کرتے تھے وہ کترا کیوں رہے ہیں۔ کچھ تو اردو والوں کا مزاج، کچھ عاشور صاحب سے متعلق بڑھتے ہوئے تنازعات۔ چار و ناچار مجھے یہ کہہ کر اس ارادہ کو ترک کرنا پڑا کہ ابھی اس کام میں جلدی نہ کرنا چاہئے۔ مناسب وقت پر یہ کام ہو جائے گا۔ ظاہر ہے میری یہ بات پسند نہیں کی گئی اور اسے میری سیاست و چالاکی پر محمول کی گئی جب کہ ایسا قطعی نہ تھا۔ عاشور صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ "نیا سفر" میں ان کے مخالفین کو ہرگز جگہ نہ دی جائے۔ بلکہ ان کے خلاف لکھا جائے۔ میں پہلی بات ماننے کو تیار تھا لیکن دوسری بات حلق کے نیچے نہ اتری میں نے معذرت ہی کی۔ کئی معذرتوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے میرا شمار بھی دوستوں میں نہ رہ گیا۔ رویوں میں فرق آ گیا، میں کیا کرتا۔ میری اپنی بھی مجبوریاں تھیں لیکن ان سب کے باوجود میرے دل میں عاشور صاحب کے لئے وہی عزت و محبت تھی جس کا میں بار بار اظہار کرتا رہا۔ لیکن وہ اسے شاید میری چالاکی و سیاست وغیرہ سمجھتے رہے۔ قمر صاحب دلی واپس آ چکے تھے، میں نے ان حالات و رویوں کا ذکر کیا تو بولے "تم اپنا کام کرتے رہو، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا" لیکن افسوس کہ وقت کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا، بات بگڑتی ہی رہی جس کا مجھے افسوس ہے لیکن میں کرتا بھی کیا۔ عاشور صاحب انفرادی طور پر ایسا سوچ رہے ہوتے تو مسئلہ کب کا حل ہو گیا ہوتا وہاں تو معاملہ کچھ یوں تھا:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

میری اپنی کچھ مجبوریاں تھیں۔ میں نے کھرے قسم کے ترقی پسند ادیبوں سے تربیت پائی ہے۔ سید محمد عقیل جیسے حق پسند اور قناعت پسند کا شاگرد رہا ہوں، اپنی عزت نفس سے آسانی سے سودا نہیں کرسکتا۔ البتہ اپنے ترقی پسند دوستوں اور ادیبوں کے لئے بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ ان کے لئے ایک خاص لچک اور جذبہ رکھتا ہوں۔ وہ جذبہ عاشور صاحب کے لئے بھی تھا۔ اس لئے میں نے کبھی بھی عاشور صاحب کے خلاف کوئی جملہ نہیں نکالا۔ کبھی کچھ نہیں کہا سنا۔ ہمیشہ عاشور بھائی ہی کہہ کر یاد کرتا رہا۔ لیکن وہ اکثر و بیشتر میرے خلاف بول جاتے تھے۔ لوگ مجھ سے بتاتے کہ عاشور صاحب آپ کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے جس کا مجھے افسوس تو ہوتا لیکن میں ٹال جاتا۔ میں نے اپنے قریب ترین دوستوں کو چشم زدن میں دشمن بنتے دیکھا ہے، زہر اگلتے دیکھا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے میری پوری شخصیت اور کردار کو مسخ کر دینے کی مذموم کوشش کی لیکن جب کہ میں نے ان کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تو عاشور صاحب تو میرے عاشور بھائی تھے اور واقعی بڑے کام کئے تھے۔ آخر وقت تک میں ان کا نام 'نیا سفر' میں دیتا رہا، انھیں خط لکھتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ جواب سے محروم رہتا جس کا مجھے قلق رہتا۔ جب قمر رئیس تاشقند سے دہلی آگئے تو میں نے "نیا سفر" ان کو سونپ دیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب انھوں نے پھر سے "نیا سفر" نکالنا شروع کیا تو عاشور صاحب کا نام ندارد تھا۔ میں نے کبھی ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ قمر صاحب سے بیحد قریب ہونے کے باوجود بعض معاملات میں وہ ایک خوشگوار فاصلہ بنا کر چلتے تھے۔ جسے میں بھی پسند کرتا تھا کہ فاصلہ میں تعلقات بنے رہنے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی اور قربت اکثر کڑواہٹ کا سبب بن جاتی ہے۔ انھیں دنوں عاشور صاحب دہلی آئے۔ انجمن ترقی اردو نے استقبالیہ دیا جس میں میں نے عمدہ تقریر کی اور عاشور صاحب خوش بھی ہوئے اور خوشی خوشی ہم دونوں قمر رئیس صاحب کے گھر پر بھی گئے۔ دنیا بھر کے منصوبوں پر بات بھی ہوئی لیکن میرے متعلق کوئی بات قمر

صاحب نے نکالی نہ عاشور صاحب نے۔ میں بھی چپ رہا کہ شاید مل جل کر کام کرنے میں گلے شکوے اپنے آپ ختم ہو جائیں اور میں نے بہت کچھ آنے والے وقت پر چھوڑ دیا اور خاموش ہو گیا۔ اس درمیان مرثیے کی تاریخ سے متعلق ان کی ایک عمدہ کتاب اور آئی جس کی تعریف میں میں نے ایک تفصیلی خط لکھا لیکن جواب سے محروم رہا۔ پھر بیماری کی اطلاع ملی خط لکھا ہنوز محرومی رہی۔ میری نئی کتابیں آئیں انھیں بھیجتا رہا، رسید تک نہ ملی۔ وجہ ان کی بڑھتی ہوئی ملالت بھی ہو سکتی ہے، عمر بھی ہو چلی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ اپنے بیوی بچوں سے قریب ہونا چاہئے تھا وہ دور تھے اور بہت دور۔ شبانہ نے ان کی خدمت کی خدا ان کو خوش رکھے لیکن ہم مشرقی لوگ جانتے ہیں کہ مریض کا آدھا مرض تو بیوی بچوں کی خدمت اور مسکراہٹ سے ہی دور ہو جاتا ہے۔ جو انھیں زندگی کے آخری دور میں نصیب نہ ہوئی۔ ذمہ دار کون؟ قصور وار کون؟ میں نہیں جانتا اور نہ کسی پر الزام لگانے کا حق ہے مجھے۔ جو کچھ سوچ رہا ہوں قلم جو بھی تحریر کر رہا ہے صرف محبت میں۔ عاشور بھائی کی عقیدت میں۔ ابتدأ ان کی شخصیت و محبت کا جو جادو مجھ پر چلا وہ آخر وقت تک قائم رہا۔ اسی کے زیر اثر یہ مضمون بھی لکھا گیا ورنہ کتنے رخصت ہو جاتے ہیں سب کے لئے تو قلم نہیں چلتا۔ کوئی کچھ بھی کہے کہ عاشور صاحب تاجر تھے۔ سیاست داں بھی، کچھ اور بھی تھے لیکن ان سب پر حاوی تھی ان کی جذباتیت۔ وہ جذباتی انسان تھے اور جذبات میں اکثر انھوں نے دھوکے بھی کھائے۔ میں نے بھی کھائے ہیں لیکن یہ دھوکہ تجربہ کی ایک انمول دولت ہوتا ہے اسے سنبھال کر رکھنا تو چاہئے لیکن اس سے دوستی یا دشمنی کو بڑھنے یا گھٹانے سے زیادہ مشاہدات و تجربات کے توسط سے زندگی کو اس کے رویوں کی تفہیم کرنا چاہئے لیکن کبھی کبھی یہ ہو نہیں پاتا اور چھوٹی عداوتیں بڑے کاموں کے آگے رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ جسے میرے بعض دوست سمجھ نہیں پاتے وہ اسی میں خوش ہوتے رہتے ہیں کہ میں نے فلاں کو بری طرح شکست دے دی۔ فلاں کے بارے میں اتنا سخت لکھ دیا کہ جواب دینے کی ہمت نہیں پڑی۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں سچ لکھنے سے زیادہ بڑا ہوا کرتا ہے اپنے بارے میں سچ سننا۔ دوسروں کی پگڑی اچھالنے سے زیادہ بڑا

کام ہوتا ہے اپنی دستار سنبھالنا۔ ظاہر ہے بڑے کام ہوتے ہیں۔ انھیں سے شخصیتیں بڑی ہوتی ہیں جسے چھوٹی طبیعت کے لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اپنی چال ڈھال اور اپنی کھال میں گم رہتے ہیں پھر ایک دن وقت کی دھول انھیں گم کر دیتی ہے۔

دوسرے انسانوں کی طرح عاشور صاحب میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں لیکن وہ اپنے کو لے کر تھیں۔ دوسروں کے بارے میں نہ کے برابر۔ اس لئے انھوں نے دوسروں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ جانے انجانے میں اپنا نقصان ضرور کرتے رہے۔ اچھے انسانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ تو خوبیاں ہی چلتی ہیں اور کام ہی یاد کیے جاتے ہیں۔ جو کام عاشور صاحب نے مغرب میں رہ کر کر دیے وہ تو بڑے سے بڑے لوگ مشرق میں نہ کر پائے۔ اس کا اندازہ اس بار لندن جانے کے بعد ہوا۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ سبھی نے ان کو یاد کیا اور ان کے کاموں کا اعتراف کیا۔ تقریبات سے قبل عاشور صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

محمد حسن چلے گئے۔ قمر رئیس چلے گئے۔ عاشور کاظمی بھی چلے گئے۔ زندگی میں ویرانی سی آ گئی۔ لندن اس بار بے حد سونا سونا لگا۔ پھر بھی لگتا تھا کہ ہر گلی، ہر موڑ پر عاشور کاظمی کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں ”اب انجمن اور رسالہ کی ذمہ داری تم پر ہے فاطمی! اسے سنبھالو۔ ہم تو قمر بھائی کے پاس چلے“ اور وہ چلے گئے۔ میرے لندن پہنچنے سے چند روز قبل۔ لیکن وہ آج بھی زندہ ہیں اس لئے کہ ان کا کام زندہ ہے۔ مغرب میں اردو زبان و ادب کی بقا اور ارتقاء میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

میرے دل میں آج بھی ان کی یادوں کے چراغ روشن ہیں جو ہمیشہ روشنی دیتے رہیں گے۔ ہم انھیں اور ان کی خدمات کو سلام کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایک عمدہ انسان۔ بانکا شاعر۔ دلنشین نثر نگار اور غیر معمولی منتظم کار چلا گیا۔ جانا تو سب کو ہے لیکن جانے والوں میں یاد وہی کیے جاتے ہیں جو کام کر جاتے ہیں اور عاشور صاحب نے کام کیا ہے۔ ان کے کاموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خدا حافظ عاشور بھائی۔ قبول کیجئے میرا آخری سلام۔

□□□

تم جیسے گئے ویسے تو جاتا نہیں کوئی
(پروفیسر افغان اللہ کی یاد میں)

زندگی اپنے نرم گرم واقعات وحادثات سے ہی جانی جاتی ہے۔ اسی سے اس کی رفتار اور کردار کا تانا بانا بنتا ہے۔ عام انسان زندگی کے اسی پیچ وخم اور سرد وگرم کو انگیز کرتا ہوا سفر حیات طے کرتا رہتا ہے۔ ارتقا کی منزلیں بھی طے ہوتی ہیں لیکن ہر انسان کی زندگی میں کچھ واقعات وحادثات ایسے ہوتے ہیں جس کو دیکھ کر فوری طور پر لگتا ہے کہ زندگی ٹھہر گئی ہے۔ وقت تھم گیا ہے اور اب زندگی اسی مقام پر دم توڑ دے گی۔ میرے دیرینہ جگری دوست پروفیسر افغان اللہ خاں (صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی) نے جس دم دہلی کے ایک اسپتال میں دم توڑا اور تقریباً ۳۵ سالہ دوستی اور محبت کا رشتہ اچانک ٹوٹ گیا تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ زندگی نہ صرف ٹھہر گئی بلکہ بیحد حقیر وذلیل لگنے لگی۔ اپنا وجود بھی بے معنی وبے سہارا لگنے لگا۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے، طاقتور ہے، دنیا کو فتح کرنے میں مصروف اور کامیاب ہے وہ ایک کمزور لمحے میں کس قدر بے بس اور لاچار۔ ۳۵ سالہ دوستی کو ختم ہونے میں ۳۵ منٹ بھی نہ لگے۔ ہم دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے۔

دہلی اردو اکادمی کا سیمینار۔ انجمن ترقی اردو دہلی کے ہال میں رواں دواں۔ اس سے قبل علی گڑھ میں ایک ورکشاپ۔ اس سے بھی قبل افغان اللہ کی علالت اور خرابی صحت کی اطلاعیں۔ چند ماہ قبل الہ آباد آئے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن میں سلیکشن کمیٹی تھی۔ ہم دونوں ایکسپرٹ تھے۔ دونوں کے اتفاق رائے سے مناسب ومعقول امیدوار چنے گئے۔ کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ تو ایک لمحہ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ گزشتہ ۳۵ سال کے درمیان ہمارے بیچ کوئی ناگوار قسم کا اختلاف ہوا ہو۔ اگر ہوا تو صرف ادبی وہ بھی بہت معمولی اور لمحاتی۔ اگلے پل ہی ہم دوست ہو گئے۔ واقعی دوست۔ اسی سچے دوست کو جب میں نے پہلے سے کمزور اور بے رونق پایا۔ تشویش ہوئی لیکن وہ اسی انداز سے بات کرتا رہا۔ مجھے خرابی صحت سے زیادہ

نگرانی صحت کی فکرتھی کہ وہ ایک لاابالی شخص تھا۔ بے نیاز، بے فکر، قلندر مگر دانشور بھی۔ جس کے کئی نمونے میرے حافظے میں ہیں۔ اسی انٹرویو میں امیدواروں سے ایسے ایسے سوالات کرتا کہ میں حیران رہ جاتا۔ سوال کرنے، سوال در سوال کے ذریعہ نزاکت و معنویت قائم کرنے میں اس کا جواب نہ تھا۔ بعض پیشہ ور سوالی ہوتے ہیں جو صرف سوال کرتے ہیں جواب خود انھیں بھی معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن افغان اللہ سوال تو کرتے ہی تھے طالب علموں کو جواب بھی بتاتے تھے۔ اکثر مجھے بھی معلوم نہ ہوتا کہ جواب کیسا ہے۔ میں نے اکثر افغان اللہ سے جانا اور سمجھا ہو سکتا ہے کہ کچھ چیزیں انھوں نے مجھ سے بھی جانی ہوں۔ دوستوں میں یہ آدان پردان چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر ہم واقعی سچے دوست ہیں لیکن مسئلہ تو ان دنوں سچی دوستی کا ہی ہے۔ افغان اللہ سچے دوست تھے اور اسی جذبہ کے توسط سے جب میں نے ان کی صحت کے بارے میں تاکید کی اور سگریٹ پینے پر روک لگائی تو وہ اسی دوستانہ جذبہ کے ساتھ مسکراتے رہے اور پھر از راہ محبت لمبی سگریٹ کو آدھا توڑ کر پیتے اور آدھا ٹکڑا بے رحمی سے پھینک دیتے اور پھر میری طرف یوں دیکھتے جیسے سگریٹ سے زیادہ اسے میں عزیز ہوں۔ پھر بہت ساری باتیں جو ہمیشہ ہوتیں اردو ادب کی، اردو دنیا کی اور ان مشترکہ نام نہاد دوستوں کی جو دوستی کی دے سے بھی واقف نہ تھے۔ وہ ہنستے، فقرے کستے اور کہتے ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی ہماری دوستی قائم ہے۔ وہ دوستی کے معنی جانتے تھے اور دوست نما دشمنوں کو خوب پہچانتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ اس طرح استعمال کرتے تھے جیسے ایک منجھا ہوا مداری اپنے بندر کو ایک دائرے میں چلاتا اور نچاتا ہے۔

ہم واقعی دوست تھے اور پروفیسر بھی۔ وہ تو صدر شعبہ بھی ہو چکے تھے اس لئے صفائی کا جواز ہو سکتا تھا کہ اب کیا خوف اور مروت۔ لیکن میں نے تو اس کے اندر کی صفائی جرأت مندی اس وقت بھی پائی جب وہ محض طالب علم تھے۔ بات شاید ۷۲۔۷۳ کی ہے۔ میں ایم۔اے۔ سال اول میں تھا اور وہ ریسرچ اسکالر تھے (مرحوم مجھ سے کئی سال بڑے تھے) ''فراق کی شاعری'' اس کے تحقیق کا موضوع تھا۔ فراق صاحب، احتشام حسین، مسیح الزماں، سید محمد عقیل وغیرہ کی وجہ سے شعبۂ اردو میں آتے جاتے تھے۔ اور ہم لوگ فراق

صاحب کے گھر۔ تحقیق کی غرض سے افغان اللہ بار بار الہ آباد آتے رہتے تھے۔ میں اکثر افغان اللہ کو لے کر فراق صاحب کے یہاں جاتا رہتا۔ فراق اس وقت ۷۵ سے اوپر ہو چکے تھے۔ کیفیت جسمانی اور حالات زندگانی نہ گفتہ بہ تھے۔ جن کے پاس فراق کی شاعری اور دانشوری پر بات کرنے کا مواد یا مزاج کم ہوتا وہ اکثر فراق کی ہر طرح کی برہنگی پر لب کشا ہوتے لیکن افغان اللہ نے ان چیزوں پر کبھی توجہ نہ دی۔ کیونکہ وہ فراق سے زیادہ لاابالی تھے۔ ازدواجی زندگی سے بھی زیادہ لینا دینا نہ تھا۔ فراق صاحب کی ازدواجی زندگی شادی کے بعد بگڑی۔ لیکن افغان اللہ تو پیدائشی بے توازن بکھری ہوئی زندگی لے کر آئے تھے۔ لیکن اس عدم توازن میں ایک مخلصانہ توازن تھا ایک دوستانہ ہمواری۔ جسے ایک سچا دوست ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس نے بے گھری میں ہی ایک گھر بنایا وہ بھی بہت بعد میں اور دوسروں کے لئے۔ اپنے لئے ان کا اپنا کچھ نہ تھا سوائے چائے سگریٹ کے۔ یا کتابیں اور طلبا اور بعد میں ایک بھتیجہ۔

ہم دونوں کئی بار فراق کے گھر گئے۔ خوب باتیں کیں اور بحثیں بھی۔ فراق کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے اور میں بھی کہتا تھا کہ وہ ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہندو تہذیب پر نظر رکھتے تھے۔ بعد میں افغان اللہ نے جس نوعیت اور جس اعتماد کے ساتھ فراق سے بحثیں کیں اس سے اندازہ ہوا کہ فراق کی ہندو تہذیب پر نظر برائے نام تھی۔ وہ بھی شاعری کی ضرورت کے تحت ورنہ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور جمالیات پر اچھی نظر رکھتے تھے اور طرح طرح سے اس کی ایسی پرتیں وجہتیں پیش کرتے کہ ہم سب انگشت بدنداں رہ جاتے شاید افغان اللہ بھی۔ لیکن کئی بار محسوس ہوا کہ ہندو تہذیب پر جتنی نظر افغان اللہ کی ہے شاید ہم میں سے کسی کی نہیں۔۔۔ ہر چند کہ یہ نظر اکتسابی تھی لیکن تھی اس قدر غیر معمولی کہ کبھی کبھی اس پر ہندو ہونے کا شبہ ہونے لگتا۔ صورت وشکل سے تو وہ ہندو لگتا بھی تھا۔ ہندوستان والا ہندو نہیں سمرقند و بخارا والا ہندو جس کی پوری شخصیت میری شخصیت کے لئے ہندو (تل) کی حیثیت رکھتی تھی۔

وہ اکثر ہندو تہذیب پر فراق سے سوال کرتا۔ فراق صاحب جواب دینے کے

بجائے گھماؤ دار تقریر کرنے لگتے۔ ایسی تقریر کہ کیا مجال کہ کوئی روک یا ٹوک سکے۔ لیکن افغان اللہ انھیں روک دیتا۔ میں ڈر جاتا کہ کہیں اس کی شامت نہ آ جائے۔ لیکن شامت کبھی نہیں آئی بلکہ فراق صاحب خوش ہوتے۔ اس کے پے در پے سوالات پر سوچنے لگتے اور کبھی کبھی پوری ایمانداری کے ساتھ کہہ دیتے ''بھئی یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں برائے نام ہندو، میں ہندوستانی جمالیات اور جمالیاتی تہذیب کا قائل ہوں'' افغان اللہ کی اس جرأت پر مجھے حیرت ہوتی اور مسرت بھی کہ فراق پر ایک اچھی اور سچی تحقیق کی غرض سے ہندو میتھولوجی کو اُس نے قریب سے پڑھا اور سمجھا تھا۔ میں نے اکثر ہندو دوستوں سے بھی تبادلۂ خیال کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی وہ اس طرح کرتا جیسے چائے، کافی سگریٹ کی بات کر رہا ہو۔ جسے کچھ لوگ اس کی غیر سنجیدگی سے تعبیر کرتے لیکن میں اس کی اس غیر سنجیدہ سنجیدگی کو عیاری سے بھری زندگی پر قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے دوست میں اوڑھی ہوئی دانشوری اور پھیلی ہوئی بقراطیت ہرگز نہ تھی۔ اسی لئے وہ اکثر اپنے گورکھپور کے ان دوستوں جو دوسری یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور دانشور ہوئے ان سے ناپسندیدگیاں اور دوریاں بنا کر رکھتا تھا کہ ان کے یہاں دکھاوا اور تصنع بہت ہے۔ افغان اللہ کا ان کمزوریوں اور نمائشی چیزوں سے دور دور تک تعلق نہ تھا۔ وہ واقعی پٹھان تھا اور ایک اچھا انسان۔ اس کی پٹھانیت کے بارے میں میں نے ایک بار سوال کیا ''یار کیا تم واقعی پٹھان ہو؟'' اس نے ایک لطیفہ سنایا کہ سچا پٹھان ہے وہ جو بارجے سے جھانک رہا ہو اور اس کی پٹھانیت کو چیلنج کی جائے تو وہ غصہ میں بارجے سے کود پڑے۔

''تم کبھی بارجے سے کودے ہو؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''نہیں، میں ہمیشہ زینے سے آیا۔ لیکن آیا ضرور!''

''تو تم سچے اور پکے پٹھان نہیں ہو۔'' میں کہتا۔

''ہاں نہیں ہوں۔ محمود الٰہی کی شاگردی اور فضل امام کی دوستی میں پٹھانیت بگڑ گئی۔''

فراق صاحب سے بھی کئی بار پٹھانیت دکھائی۔ فراق کے اندر کا سود وزیاں میں

ڈوبا ہوا کائستھ اکثر ڈر جاتا اور کہنے لگتا" ارے بھائی تم لوگ آ جاتے ہو تو دماغ تفکر کی سانسیں لینے لگتا ہے۔"

نجانے کتنے سیمینار، کتنے مذاکرے، کتنے سفر ہم نے ساتھ ساتھ کئے۔ سنا ہے کہ انسان وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس کی ضرورتیں، اس کے مناصب بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے رویے، تعلقات وغیرہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن افغان اللہ میں یہ سب نہ تھا۔ کم از کم میں نے کبھی محسوس نہ کیا۔ مصلحتاً کچھ دوستوں کا اضافہ ضرور ہوا لیکن ان کو وہ اسی فاصلہ سے رکھ کر کام کرتے یا کام نکالتے تھے جس کو سامنے والا سمجھ بھی نہ پاتا۔

اترانچل میں نئی یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی۔ شعبۂ اردو بھی قائم ہو رہا تھا۔ نصاب تیار ہو رہا تھا چنانچہ نصابی کمیٹی کی ایک میٹنگ میں شارب ردولوی، محمود الحسن رضوی، افغان اللہ اور راقم الحروف شریک تھے۔ نصاب کی باریکیوں پر گفتگو جاری تھی۔ اس موقع پر بھی میں نے ان کی نظر دیکھی اور بحث بھی۔ بیچارے محمود الحسن جو شاید کسی لکھنوی شاعر کو نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ بات افغان اللہ کو مناسب نہ لگی کہ اترانچل کے طلباء لکھنوی شاعری کی نزاکتوں کو کیا سمجھ سکیں گے چنانچہ دوران بحث اس نے ایسی پھبتیاں کسیں کہ محمود صاحب لہولہان ہو گئے۔ سنجیدہ اور رنجیدہ لیکن وہ اسی طرح ان سے ہنستا اور بولتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جبکہ محمود صاحب دل پہ لئے بیٹھے تھے۔ یو۔ پی۔ اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ میں لکھنؤ کے ایک پروفیسر کا بول بالا تھا۔ کسی سے ڈرتے نہ تھے۔ بیباک تھے اور شاید بے لگام بھی لیکن اگر ڈرے اور تھے تو افغان اللہ سے۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ بحث کر کے بھول جاتے لیکن دوسرے کبھی نہ بھول پائے۔ ان کی باتوں میں دلیل ہوتی اور سچائی بھی لیکن اردو دنیا۔ اردو ادیب حتیٰ کہ اردو کے پروفیسران دونوں سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ہمہ وقت نفع و نقصان میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ان کی حق گوئی کو زنگ لگ چکا ہے۔ منھ میں تالے لگ چکے ہیں۔ افغان کی شخصیت ایسے حقیر نفع و نقصان سے بالاتر تھی۔ وہ معاملات کو اقدار و اخلاق کے حوالے سے جذباتی ہو کر برتنے کا ہنر جانتے تھے، دوستوں کے لئے بطور خاص۔

ایک بار میں نے دہلی سے ایک ریڈیمیڈ کوٹ خریدا۔ الہ آباد میں مجھے پہنے دیکھ کر افغان مسکرائے، میں سمجھ گیا۔ میں نے فوراً کہا۔ ''اتار دوں''

اسی محبت اور بے تکلفی سے بولے۔ ''یار تم جو بھی پہن لیتے ہو اچھا لگتا ہے، میں ہیرے جواہر بھی پہنوں اچھا نہیں لگتا۔ نہ جانے کتنے ہزاروں لاکھوں روپئے کی کریم پوڈر لگا ڈالا لیکن سیاہی ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی بلکہ اور پکی ہوتی جا رہی ہے۔''

''پکا رنگ تو اور اچھا ہوتا ہے۔ متوجہ کرتا ہے۔'' میں چھیڑتا۔

''آج تک تو کوئی متوجہ ہوا نہیں۔'' وہ مزے سے کہتے۔

''تمھاری توجیات اور ترجیحات بھی مختلف ہیں۔'' میں کہتا

''ایسا نہیں ہے پیارے، یہ نہ سمجھو، لیکن کیا کروں کچھ مجبوریاں ہیں۔''

اس طرح کے جملوں سے وہ اپنی ذاتی زندگی کے نازک گوشوں کی طرف اشارہ کر کے بات کو ٹال جاتے۔ ایسا نہ تھا کہ وہ حسن و جمال۔ عشق و محبت کا جذبہ نہ رکھتے تھے۔ اکثر مجھے چھیڑتے تھے لیکن جلد احساس ہو جاتا کہ وہ خود ایک گہرے اور ذمہ دار شخص ہیں۔ گھر والوں کی چاہت اور ضرورت کا اپنے جذبات سے زیادہ احترام کرتے تھے ورنہ میں پہلے عجیب و غریب خیال رکھتا تھا کہ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے اساتذہ میں کوئی شادی شدہ ہے ہی نہیں سوائے محمود الٰہی کے۔ احمر لاری کنوارے رہے، اختر بستوی کنوارے ہی دنیا سے چلے گئے۔ اور اب افغان اللہ۔ یہ کس کی پاسداری ہے؟ کیسی وفاداری ہے؟ لیکن بظاہر لاپروا اور لاابالی سا دکھائی دینے والا شخص اندر سے کس قدر گہرا، ذمہ دار اور بردبار ہے یہ بعد میں پتہ چلا۔ اپنے گھر والوں اور خاص طور سے اپنی ماں کے لئے اس کی محبت اور ذمہ داری قابل تقلید تھی۔ وہ دوستوں کے گھر والوں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچتے۔ میری بیوی کو شوگر کا عارضہ ہے۔ ہر بار فون پر ملاقاتوں پر بیگم کی خیریت ضرور دریافت کرتے اور دواؤں کا ذکر کرتے۔ میری بڑی بیٹی کی شادی ہوئی۔ جلدی جلدی میں ہوئی تھی۔ مختصر اہتمام تھا لیکن افغان اللہ شریک ہوئے صاف کہا کہ فلاں فلاں چیز مت خریدنا میں نیپال سے لے کر آؤں گا اور لے کر آئے بڑی محبت سے شریک ہوئے۔ بات کوٹ کی

تھی۔ وہ کوٹ ان کو پسند آیا تعریف کی اور اپنا مذاق اڑاتے رہے۔ گورکھپور جا کر فون کیا ایک شاگرد آنے والا ہے اس کے ذریعہ کوٹ بھیج دو شاید تمھارے توسط سے کچھ بن سنور سکوں۔ میں نے وہ کوٹ بھیج دیا۔ چند دنوں کے بعد اسی شاگرد کے ذریعہ نیپال کا ایک گرم سوٹ مجھے ملا جسے پا کر میں حیران نہیں ہوا کہ سلوک اور جذبۂ دوستی میں وہ مجھ سے میلوں آگے تھا۔ جب کبھی سفر میں سیمینار میں ہم ساتھ ہوتے کس کا کتنا خرچ ہو رہا ہے اور کیسے خرچ ہو رہا ہے نہ وہ حساب رکھتے نہ میں۔ بس چائے سگریٹ کی شرکت مجھے گراں گزرتی۔ میں ٹوکتا وہ مسکرا کر ٹال جاتے۔ کتنے قلم، چشمے، ٹارچ، کتابیں یونہی بغیر حساب کتاب کے دیدیتے تھے اور مجھ سے بھی طلب کر لیتے جس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ وہ حساب کتاب کے آدمی ہی نہ تھے، خاص طور پر دوستوں کے لئے۔ نجانے کتنی چیزیں ان کی میرے پاس ہیں اور میری ان کے پاس۔ جس کا حساب تو رزِ حساب میں بھی نہ ہو سکے گا۔
اس طرح شاگردوں کے درمیان بھی کوئی فرق نہ تھا۔ میرے شاگرد ان کے تھے اور ان کے میرے شاگرد۔ سید حسین احمد اصلاً میرے شاگرد ہیں میری نگرانی میں فراق پر ڈی فل. کی ہے لیکن انھیں گورکھپور بلایا۔ آج وہ شعبۂ اردو میں مہمان استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے شاگرد سید وضاحت حسین رضوی مدیر نیا دور لکھنؤ جنھوں نے سب سے پہلے پی. ایچ. ڈی. کا کام کیا ہے یعنی افغان اللہ کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں مجھے اپنا بھائی اور استاد سمجھتے ہیں۔ افغان اللہ وضاحت کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ میری پہلی اولاد ہے یعنی پہلی پی. ایچ. ڈی.۔ شاگردوں اور طالب علموں کی ایک بھیڑ ان کے ساتھ رہتی اور وہ سب کے مسائل حل کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ میرے شاگردوں کے مسائل بھی حل کرتے رہتے۔ وہ میرے علمی و ادبی عمل میں برابر کے شریک ہوتے۔
جب میں نیا سفر نکال رہا تھا وہ برابر سے اس کی ادارت و شاعت میں شریک تھے۔ پندرہ بیس کاپیاں منگواتے، میری جو بھی کتاب آتی اس کی دس پانچ کاپیاں پورے حق سے منگواتے اور دوستوں و طالب علموں میں مفت تقسیم کر دیتے تا کہ طلباء پڑھیں۔ میں نے اپنے مضامین کی کتاب 'نئی تنقید نئے اقدار' افغان اللہ کے نام معنون کی۔ ظاہر ہے کہ خوش

ہوئے۔ وہ اپنی ہر کتاب میں میرا ذکر کرتے۔ کلیات سردار جعفری کا سٹ آیا تو ایک اپنے لئے منگوایا اور دوسرا ڈاکٹر عزیز کے لئے۔ اس کا مقدمہ اس قدر پسند آیا کہ اٹھتے بیٹھتے دوسروں سے تعریف کرتے۔ پھر میں نے فراق پر کئی مضامین لکھے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ قدم قدم پر میں نے ان سے مشورے کئے اور انھوں نے کھلے دل و دماغ سے مشورے دیئے۔ فراق پر ان کی غیر معمولی نظر تھی۔ میرا خیال ہے کہ فراق پر ان کی کتاب 'فراق کی شاعری' ایک بہترین کتاب ہے اور اردو کی چند معیاری تحقیقی مقالوں میں اس کا شمار کیا جائے گا۔ لیکن جب میں نے فراق پر ایک مضمون سیاسی نوعیت کا لکھا تو حیران رہ گئے اور نئے گوشوں کی تعریف کرنے لگے۔ اسی طرح جب میں نے فراق کی نظم 'آدھی رات' کا تجزیہ کیا تو وہ بھی انھیں پسند آیا تھا۔ وہ فراق کے اس قدر مرید تھے کہ ان کے مقابلے جب کبھی میں جوش کی عظمت کا ذکر کرتا تو وہ بحث کرنے لگتے وہ جوش کو محض ایک رومانی احساس کا شاعر مانتے تھے۔ اسی نوعیت کا ایک مقالہ انھوں نے جوش سیمینار الہ آباد میں پڑھا جو اگر چہ اختلافی تھا لیکن منطق اور دلیل سے پر تھا۔ وہ ایک اچھا مقالہ تھا۔ جب میں کہتا کہ جوش کی رباعیات فراق سے بہتر ہیں تو انکار تو نہ کرتے لیکن کہتے کہ فراق نے رباعیاں جوش کے جواب میں ضرور کہیں ہیں لیکن فراق کی رباعیوں میں ہندوستانی تہذیب، سرنگار رس اور جمالیاتی رچاؤ ہے وہ جوش کے یہاں مفقود ہے۔ بات غلط تو نہ تھی لیکن جوش کے یہاں حکیمانہ وفلسفیانی احساس ہے وہ فراق کے یہاں نہیں۔ بحث ہوتی، تکرار ہوتی اور پھر چائے کی پیالی میں سب کچھ غرق ہو جاتا۔ میرے ہی کہنے پر انھوں نے فراق کی رباعیوں کا ایک انتخاب کیا اور ایک بسیط مقدمہ لکھا جو مجھے بیحد پسند آیا۔ دوسروں نے اس پر اس لئے توجہ نہ دی کہ انھوں نے اسے پڑھا ہی نہیں۔ کیونکہ بزرگ لوگ اپنے بعد کی نسل کو کم پڑھتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں تو ایماندارانہ اظہار میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ افغان اللہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے فراق کے علاوہ کچھ اور اچھے کام بھی کئے۔ مثلاً انھوں نے دو بیحد اہم قدیم کتابوں کو ترتیب دیا۔ پہلی رانی کیتکی کی کہانی اور دوسری طرازِ ظہیری۔ ان کے مقدمات ملاحظہ کیجئے کیا اعتماد بولتا نظر آئے گا۔ افغان اللہ کی

معلومات عمدہ تھیں بس انھیں مجتمع کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن جب وہ سلیقے سے ایک مقام پر آ جاتیں تو غیر معمولی ہو جاتیں۔ روپ کا مقدمہ ملاحظہ کیجئے۔ ایک نئی بصیرت و علمیت کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگوں نے اسے بھی پڑھا نہیں۔ اس کے ذمہ دار کسی حد تک وہ خود بھی تھے۔ ایک ادیب اور پروفیسر کے جو ہاؤ بھاؤ، رکھ رکھاؤ ہوا کرتے ہیں وہ سب ان میں نہ تھا۔ وہ پھکڑ اور بے فکر قسم کے انسان تھے۔ سادہ اور صاف گو اس لئے دنیا داری کے معاملات میں اکثر وہ مات کھا جاتے تھے لیکن انھیں اس مات پر ہرگز افسوس نہ ہوتا۔ بس ایک جملہ کہتے ''چھوڑو، ان سب میں کیا رکھا ہے'' سچ تو یہی ہے کہ ان سب میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ پھر بھی دنیا اور پڑھی لکھی دنیا انھیں سب میں گرفتار ہے۔ علمیت، شرافت وغیرہ بے معنی سی دکھائی دیتی ہے۔

وہ مجھ سے پہلے پروفیسر ہو گئے تھے۔ میری پروفیسر شپ کی انھیں بیحد فکر تھی اور جب میں پروفیسر ہوا تو از راہ محبت و دوستی یہی کہتے کہ فاطمی تو جب پروفیسر نہیں ہوا تھا تب بھی پروفیسر ہی لگتا تھا۔ کتنا کام کرتا ہے، کون کرتا ہے آج کل۔ سب آسانی سے اور فری میں پروفیسر ہو جانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے کیا کیا سیاست کرتے ہیں۔ افغان اللہ میرے قلب و جگر میں سمائے ہوئے تھے۔ دل و دماغ کی پہلی دہلیز پر۔ کوئی بھی مسئلہ یا معاملہ ہوتا اکثر سب سے پہلے میں انھیں شریک کرتا۔ ہمہ وقت، ہمہ تن ساتھ دینے کا وعدہ کرتے۔ انھیں سب خوبیوں کی وجہ سے ان کی گورکھپور شہر اور یونیورسٹی میں بیحد عزت تھی۔ ہر طبقہ اور پیشہ کے لوگ ان سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ احترام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے علم و عمل سے۔ اخلاق و ایثار سے اردو کے نہ جانے کتنے بزعم خود تاناشاہوں کو کنارے لگا دیا تھا۔ ان کی حق گوئی اور بیباکی میں ایک مخصوص قسم کی دلنوازی اور دلکشی تھی۔ جو اکثر پسند کی جاتی کبھی کبھی تلخی بھی ہوتی کہ سچ تو تلخ ہوتا ہی ہے۔ اس کے لئے بطور خاص جس کو سچائی موافق نہ آ رہی ہو۔ ان کی تحریر و تقریر میں بھی یہی خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ جو شاعر و ادیب کو پسند ہے تو پسند ہے جو ناپسند ہے تو ناپسند ہے۔ جب میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری ہوا تو سب سے پہلے مبارکباد کا فون افغان نے کیا۔ یو۔ پی۔ کی باڈی بنانے

کی بات کی۔ میں نے انھیں کی ایما پر یو. پی. کی باڈی بنائی، جس کے وہ جنرل سکریٹری ہوئے۔ یہ الگ بات ہے شعبہ کی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے وہ زیادہ وقت نہ دے سکے۔ کچھ یہ بھی ہوا کہ اس زمانے میں ان کی دلچسپی لکھنؤ کے بعض ایسے لوگوں سے ہوگئی جن کا قارورہ انجمن سے میل نہ کھاتا تھا۔ میں سب سمجھ رہا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ افغان اللہ جیسے بیباک اور اور کھرے انسان کے ساتھ یہ سب زیادہ چل نہیں سکتا تھا۔ اور وہی ہوا۔ حالانکہ ان کی دوستی اور شخصی رویوں میں فکر ونظر کبھی دیوار نہ بنتے تھے۔ شمس الرحمن فاروقی کی وہ بیحد عزت کرتے تھے اور جب الہ آباد آتے اگر وہ شہر میں ہوتے تو ضرور ملنے جاتے۔ اکثر میں بھی ساتھ ہوتا، خوب لطف کی باتیں ہوتیں، علم وادب کے مختلف زاویے کھل کر سامنے آتے۔ فاروقی صاحب بھی افغان اللہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ ان سے بھی بے باکی سے بات کرتے لیکن ان کی بیباکی میں ایک خاص قسم کا لطف اور اپنا پن ہوتا۔ بس ذرا قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی ضرورت تھی، جو اکثر نے نہیں کی لیکن جس نے کرلی وہ ان کا گرویدہ ہوگیا۔

غالب، جوش، فراق، سردار جعفری وغیرہ پر لکھے گئے ان کے مضامین عمدہ ہیں اور نئی فکر کا پتہ دیتے ہیں۔ نقادوں میں مجنوں اور احتشام حسین کے قائل تھے۔ ان پر مضامین بھی لکھے اور عمدہ طریقہ سے ان کا تجزیہ کیا۔ بعد کے نقادوں میں تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود شمس الرحمن فاروقی اور قمر رئیس کو پسند کرتے تھے اور شاعروں میں شہریار اور ظفر گورکھپوری کو۔ وہ ان دونوں شاعروں کے بارے میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن شعبہ کی ذمہ داریوں اور خرابی صحت نے انھیں موقع نہ دیا۔ ان کی بے اعتدالیوں اور لاپروائیوں نے اس میں اضافہ کردیا۔ سگریٹ نوشی منع ہونے کے باوجود رکی نہیں۔ اندر پوشیدہ زخم اب منھ چڑھانے لگے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

دہلی اردو اکادمی کے سیمینار میں جب آخری ملاقات ہوئی تو وہ بری طرح سے امراض کے گھیرے میں تھے۔ چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ اجلاس کے وقفہ میں میری ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ سیمیناروں سے بیزار تھے اور سفر سے بھی۔ میں نے کہا جب طبیعت

ٹھیک نہ تھی تو کیوں آئے؟ بولے، قمر صاحب کا معاملہ تھا اور فراق کا بھی، میں نے فراق پر مقالہ لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر نریش کے مقالہ پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے تقریباً دس منٹ تک فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب پر تقریر کی۔ وہی ان کی آخری تقریر اور تصویر تھی جسے ایوان اردو نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ لیکن لنچ کے وقفہ میں جہاں دہلی کے شرکا، روٹی، بوٹی پر ٹوٹ رہے تھے، افغان اللہ میں ایک کونے میں کھڑے تھے۔ کسی ایک مہربان نے مجھے ایک پلیٹ میں کچھ کھانے کی چیزیں دیدی تھیں، جسے افغان اللہ دیکھ تو رہے تھے لیکن کھا نہیں رہے تھے، غالباً چکنی چیزیں منع ہو چکی تھیں۔ بعد میں زردہ کے کچھ لقمے میری پلیٹ سے لے کر کھائے۔ اس کے بعد سگرٹ نکالی۔ میں نے حسب معمول ٹوکا تو جھٹکے سے اسی لب ولہجہ میں بولے:

''ارے چھوڑو۔ روز روز مرنے سے تو بہتر ہے ایک جھٹکے سے.....''

جملہ ادھورا رہ گیا، یا میں نے مکمل نہیں ہونے دیا۔

پھر بولے ''یار اب تھک گیا ہوں، یہ میرا آخری سیمینار ہے، اب دہلی نہ آؤں گا۔''

''ارے یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہوئی ہے، ابھی سے یہ تھکن۔''

''پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

گزشتہ تیس پینتیس برس میں پہلی بار مایوسی کے الفاظ، مجھے بیحد تکلیف ہوئی۔ میں نے پوچھا

''آخر ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟''

''کچھ نہیں، کہتا ہے کہ سانس کی مشکلات ہیں۔'' پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہو جائے گا..... چلو فاطمی، آرام کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''یار لنچ کے بعد کے اجلاس میں میرا مقالہ ہے، غالباً پہلا۔ سن لیتے تو اچھا تھا۔''

''اچھا کس موضوع پر ہے؟''

''نظیر اکبر آبادی پر''

وہ بادل نخواستہ ایک دوست کی مروت میں رک گئے۔ حالانکہ وہ رکنے کی

پوزیشن میں ہرگز نہ تھے۔ اس کا احساس مجھے اس وقت نہ تھا لیکن دوستی انھیں زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ اجلاس میں ہم ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ اجلاس شروع ہوا، میں مقالہ پڑھنے اسٹیج پر ابھی میں نے مقالہ شروع ہی کیا تھا کہ وہ اٹھ کر جانے لگے۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔ مقالہ پڑھتے رہنا میری مجبوری تھی۔ مقالہ ختم کرنے کے بعد میں نے اپنے ایک اور دوست ابن کنول کو ساتھ لیا اور باہر کی طرف رخ کیا۔ ابھی زینے پر ہی تھا کہ گورکھپور سے ان کے نائب رضی الرحمٰن کا فون آیا ''فاطمی بھائی فوراً اسپتال پہنچیے، افغان صاحب ایڈمٹ ہیں اور حالت سنگین ہے۔'' میں گھبرا گیا۔ ہم دونوں بھاگے ہوئے اسپتال پہنچے تو افغان اللہ ہمارے درمیان سے رخصت ہو چکے تھے۔ بستر پر لاش پڑی تھی۔ وہی سوٹ، وہی ٹائی وہی قلم، جوتا، موزہ لیکن افغان اللہ وہ نہ تھے بلکہ ان کی لاش تھی۔ ایک بے جان لاش ہمارے اس دوست کی جس کی جانداری، شانداری، حق گوئی کی قسمیں کھائی جاتی تھیں، وہ اپنے حقیقی معبود کے پاس جا چکا تھا۔ میرے پیر تھرتھرانے لگے، کانپنے لگا کہ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ اور لوگ آئے۔ قمر رئیس، فضل امام اور اکادمی کا عملہ۔ ایک عجیب منظر۔ ایک عجیب احساس جس سے میں آج بھی نکل نہیں سکا ہوں۔ تیس برس کی مضبوط دوستی کا رشتہ یوں اچانک ٹوٹ جائے گا اندازہ نہ تھا۔ افغان اللہ اس طرح چلے جائیں گے۔ یوں ہنستے، بولتے، سگرٹ پیتے، سیمینار میں شریک ہوتے اور دوست نوازی کرتے۔ میرے دوست۔ تمھاری دوستی کو سلام۔ تمھاری سادگی اور حق گوئی کو سلام۔ تمھاری افغانیت کو سلام کہ جس پر تمام طرح کی شرافت اور سیادت قربان کی جا سکتی ہے۔

میرے افغان!

کیا کوئی اس طرح سے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ جانا تو سبھی کو ہے لیکن موت کو مذاق بنانا اور زندگی سے کھلواڑ کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ ہائے!

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ویسے تو جاتا نہیں کوئی

□□□

دیدہ و دل تمام آئینہ
(غضنفر کی شخصیت اور فکر و فن پر چند باتیں)

بلا شک وشبہ غضنفر آج ہماری نسل کے افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے ایک اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا کوئی ذکر، کوئی فہرست غضنفر کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔۔ یہ بات ان کے ہم جیسے مخلص اور سچے دوستوں کے لئے باعث فخر و مسرت تو ہے ہی ذاتی طور پر میرے لئے تھوڑی سی حیرت کی بھی ہے یا یوں کہئے کہ یہ تحیر ہر اس فرد کے لئے ممکن ہے جو غضنفر کے بیحد قریب ہے۔ رگ جاں کی طرح۔ ہاں ہم ایک دوسرے کے لئے ایک جاں کی طرح تھے اور ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رگ، یہ قربت یونہی نہیں پھڑکتی۔ اس لہو کو گرم اور رگوں میں رواں دواں ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دہائیاں بھی صرف ہو جاتی ہیں۔ ہمارا ساتھ بھی برسوں کا نہیں دہائیوں کا ہے۔ اسی لئے مجھے مسرت کے ساتھ تھوڑی سی حیرت بھی ہے۔ کہ غضنفر جیسا معصوم اور سادہ لوح انسان محض اپنی ذاتی محنت و لگن، عرق ریزی، تخلیقی گہما گہمی سے اپنے قارئین اور ناقدین کے درمیان اتنی جلدی توجہ کا مرکز اور آج کے افسانوی ادب کا محور جس طرح بن گیا۔ اسے تو وہ چلت پھرت، ہوشیاری اور چالاکی بھی نہیں آتی جو آج کے ادبی ماحول میں نام نہاد ادبی مقام کے حصول کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو کسی ادارے کا چیئرمین یا ڈائرکٹر بھی نہیں۔ کوئی بڑا افسر بھی نہیں، پروفیشنل قسم کا مفکر و مقرر بھی نہیں۔ مزاج میں خوشامد بھی نہیں اسی لئے آج تک اسے کوئی قابل ذکر انعام و اعزاز بھی نہیں ملا جس کے حصول کے لئے بعض لوگ اپنی عزت و دولت تک کی بازی لگا دیتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود غضنفر نے اپنی پہچان بنائی۔ اسی بھیڑ میں ایک منفرد پہچان، جو یقیناً تادیر قائم رہے گی۔ ہے نہ حیرت کی بات۔ ایک بات کی حیرت مجھے اور ہے لیکن اس حیرت کو سمجھنے کے لئے کئی دہائیاں قبل لوٹنا ضروری ہے۔ صرف میری حیرت کے لئے نہیں بلکہ غضنفر کی

شخصیت کی تفہیم کے لئے بھی یہ مراجعت ضروری ہے۔

یہ وہ دن تھے جب ہم علی گڑھ میں تھے۔ یہ بات ۷۵-۱۹۷۴ء کی ہے۔ میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر ریسرچ میں داخلہ لے چکا تھا۔ میرے نگراں پروفیسر سید محمد عقیل صاحب تھے۔ الہ آباد کے ایک جلسے کی نظامت کرتے ہوئے میری ملاقات مرحوم نسیم قریشی سے ہوئی۔ جو اس جلسہ کے مہمان خصوصی تھے۔ دوران گفتگو جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میری تحقیق کا موضوع شرر ہے تو وہ خوش ہوئے اور ذکر کیا کہ کبھی انھوں نے بھی شرر پر کام شروع کیا تھا خاصا مواد بھی جمع کرلیا تھا لیکن اپنی گوناں گوں مصروفیات کی وجہ سے وہ کام مکمل نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے ساتھ علی گڑھ چلنے کی دعوت دی۔ اور میں تیار ہو گیا کئی ماہ ان کے ساتھ آفتاب منزل شمشاد مارکیٹ میں قیام رہا۔ نسیم قریشی صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات وایام کی ایک الگ داستان ہے۔ جو کبھی اطمینان سے رقم کروں گا۔ لیکن نسیم صاحب کے توسط سے میری ملاقات ابوالکلام قاسمی اور شارق ادیب سے ہوئی۔ قاسمی ایم۔اے۔ کرنے کے بعد شعبہ اردو میں لکچرر ہو چکے تھے اور شارق غالباً سیاسیات سے ایم۔اے۔ کر رہے تھے۔ لیکن شعروادب اور بالخصوص افسانوی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور یہی ہم دونوں کی دوستی کی اصل بنیاد تھی۔ اس وقت علی گڑھ میں نوجوان ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ خاصا سرگرم، متحرک، بولتا ہوا، بعض اوقات چیختا ہوا بھی۔ جو شاعر تھے مثلاً عبید صدیقی، فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، اسعد بدایونی اور بعض دوسرے وہ خلیل الرحمن اعظمی اور ان سے زیادہ شہریار کے قریب تھے اور شارق ادیب، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، تھوڑا اور جونیئر ابن کنول، غیاث الرحمن وغیرہ قاضی عبدالستار سے زیادہ قریب۔ کچھ لوگ دونوں سے ہی قریب تھے۔ بہر حال اس بھیڑ میں ایک سانولا سلونا سا چہرہ غضنفر کا تھا۔ جس کی شخصیت کا سب پر کشش چہرہ اس کے سر کے بال تھے۔ گھنے بھرے بھرے کالے اور لمبے بال تو خیر ہمیشہ سے ہی پسند کئے گئے ہیں لیکن مردوں کے بالوں کا کان تک ڈھکے رہنا اس زمانے کا فیشن تھا۔ ہم سب اس کوشش میں رہتے لیکن اس فیشن کی

زینت اور سعادت غضنفر کے حصہ میں زیادہ آئی تھی۔ بال تو طارق چھتاری کے بھی بہت اچھے تھے اور ان کا ہیئر اسٹائل اگرچہ سادہ تھا لیکن کم پر کشش نہ تھا۔ بال میرے بھی اچھے تھے لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ کان تک نہیں پہنچ پاتے اینٹھ جاتے روٹھ جاتے اور اب تو کچھ ایسا روٹھ گئے ہیں کہ مکمل رخصتی پر آمادہ ہیں۔ بہر حال سب سے پہلے غضنفر کے بالوں نے مجھے متوجہ کیا تھا، پھر معلوم ہوا کہ موصوف شاعر بھی ہیں اور شہریار کی صحبت میں زیادہ عمل دخل ہے۔ تو پھر وہ بال مجھے فیشن زمانہ کم گیسوئے شاعرانہ زیادہ لگنے لگے۔ بہر حال کوئی بات ایسی تھی جو مجھے غضنفر سے قریب کرنے لگی۔ علی گڑھ کی کئی محفلوں میں انھوں نے اشعار سنائے وہ اشعار کس معیار کے تھے کہہ نہیں سکتا لیکن ان کی ادائیگی اور پیشکش میں بڑی سادگی ہوتی۔ اسی سادگی نے مجھے متاثر بھی کیا۔ اس لئے کہ اس وقت عین نوجوانی کے عالم میں اور ابتدائے شاعری کے ایام میں بھی بعض شعراء نجانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے۔ شراب، سگرٹ، چائے وغیرہ کی کثرت کے ساتھ رعونت و نخوت بھی جھلکتی رہتی۔ بعض تو پائپ یا سگار پیتے دکھائی دیتے جس کی وجہ سے وہ شاعر کم افلاطون زیادہ لگتے۔ شہریار کے فرزند کم فاروقی کے داماد زیادہ لگتے۔ ایسے میں غضنفر کی سادگی متاثر کرتی اور حیرت میں ڈالتی۔ کچھ ٹھیک سے یاد نہیں بہر حال دوستوں کے ہی حوالوں سے غضنفر سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھنے لگا تو پتہ چلا کہ حضور علامہ شبلی نعمانی پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بھی فرمارہے ہیں اور بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ علی گڑھ میں ہی پہلی بار مجھے بہار کے طالب علموں کو ایک خاص نظر سے دیکھے جانے کا اندازہ ہوا کہ قاسمی، خورشید، عقیل، غضنفر اور بعض دوسرے سبھی بہار کے تھے۔ جو بڑے زور و شور سے پوری یونیورسٹی میں بالعموم اور شعبہ اردو میں بالخصوص داخل ہو رہے تھے۔ اور غالباً بہار کی پہلی نسل تھی جو اتنی کثیر تعداد میں شعبہ اردو سے وابستہ تھی۔ اور محض درس و تدریس میں ہی نہیں پوری ادبی دنیا میں مداخلت کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اعظمی، بدایونی، بریلوی، شاہجہاں پوری وغیرہ کو یہ بات اندر اندر پسند نہ آتی ہو لیکن یہ باتیں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس لئے کہ اس وقت میں بہار اور غیر بہار کا شعور نہ رکھتا تھا اور آج بھی نہیں ہے لیکن وہ جو محاورہ ہے کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے

اور جادو بول رہا تھا خود بہار میں اور بہار سے باہر بھی۔ اردو کے تعلق سے بہار کی بہار تھی تو غضنفر بھی بہار کے تھے۔ عقل و ہنر کے ساتھ دل کے معاملات میں بہار کے احباب آگے آگے تھے۔ قاسمی اور غضنفر اس وقت معاملات عشق میں پیش پیش تھے اور طارق چھتاری کی آرزوئیں بھی دختر آرزو کے زلفوں میں الجھ چکی تھیں۔ اور ان کے دل کے باغ کا دروازہ سروسمن سے مہکنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اور پھر وہ مہک کر رہا۔ گزرتے ہوئے وقت نے طارق اور یاسمین دونوں کی زندگی میں بہار ہی بہار بھر دی۔ خدا نظر بد سے بچائے کہ ہمارے دوستوں میں طارق اور یاسمین کا جوڑا ہر اعتبار سے ایک آئیڈیل جوڑا سمجھا جاتا ہے۔ تو اس وقت معاملات عشق شباب پر تھے۔ خیر قاسمی تو روزگار سے تھے لیکن طارق طیار اور غضنفر بے روزگار۔ لیکن اس معاملے میں غضنفر نے وہ کام کیا جو رستم سے بھی نہ ہوا ہوگا۔ عین پریشانی و بے روزگاری کے عالم میں نجیب آباد کے سادات گھرانے کی خوش شکل اور اس سے زیادہ خوش کردار و گفتار لڑکی بشریٰ سے نہ صرف دیوانہ وار عشق کیا بلکہ پوری ایمانداری، سچائی اور سادگی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس میں غضنفر کی شرافت اور سچے جذبۂ عشق کا تو دخل تھا ہی کم و بیش یہی کیفیت اور خصوصیت بشریٰ بھابی کی بھی تھی۔ وہ ایک بہت اچھی بیوی، بھابی اور ماں ثابت ہوئیں۔ یقیناً محبوبہ بھی بہت اچھی رہی ہوں گی۔ یہ وہی دن تھے جب ہم بھی بے روزگار تھے، پریشاں حال تھے اور عشق میں بھی مبتلا تھے۔ لیکن ہمارے گھر والوں نے عشق کی ناپختگی اور معاشی ناہمواری دیکھ کر اور والدہ نے دودھ کا واسطہ دے کر ہماری شادی خاندان کی ایک لڑکی سے کر دی۔ چنانچہ غضنفر، طارق اور میں تینوں شادی شدہ۔ تینوں بے روزگار اور سامنے زندگی کا میدان کارزار بلکہ خاردار۔ طارق کے پاس کچھ بنیادی سہولتیں تھیں اس لئے اکثر وقت ہم دوستوں کا ان کے گھر پر گزرتا۔ چائے، سگرٹ، کھانا اور افسانہ، ہم نے سگرٹ پی پی کر افسانے سنے، چائے پی پی کر کڑوے کسیلے تبصرے کئے۔ سید محمد اشرف، شارق ادیب، طارق، ابن کنول کی افسانہ نگاری کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اشرف کا ''ڈار سے بچھڑے''، ابن کنول کا ''بند راستے'' غیاث الرحمٰن کا ''وہ دن'' شہرت اختیار کر چکا تھا۔ یاد نہیں کہ ان افسانوں کے ساتھ غضنفر کا

بھی کوئی افسانہ آیا ہو یا مشہور ہوا ہو۔ ہم لوگ انھیں شاعر کے روپ میں زیادہ جانتے تھے۔
اسی زمانے میں علی گڑھ میں افسانے پر ایک سیمینار ہوا، جس میں محمد حسن، عابد سہیل اور بعض دوسرے شریک ہوئے۔ عابد سہیل نے اپنا تازہ افسانہ 'سوا نیزہ پر سورج' پہلی بار اس محفل میں سنایا اور محمد حسن وقاضی عبدالستار نے افسانے پر بہت اچھی تقریریں تو کیں لیکن نئے لوگوں کا ذکر نہیں کے برابر کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے مباحثہ میں اس کی زوردار شکایت کی۔ مجھے یاد ہے کہ چائے پیتے وقت محمد حسن صاحب نے الگ سے مجھ سے کہا تھا کہ اس طرح شکایت سے کوئی فائدہ نہیں، کام کر کے دکھایئے۔ ایک طرح سے انھیں کی تحریک پر میں نے جلد ہی بیس نئی کہانیوں کا انتخاب کیا جسے عابد سہیل صاحب نے شائع کیا اور یہ الہ آباد میں نئی کہانی۔ نئے مسائل کے عنوان سے بڑا سیمینار کیا جس میں اشرف، طارق، شارق وغیرہ کے علاوہ تقریباً ۵۵ کہانی کار اور کہانی کے ناقدین نے شرکت کی۔ بزرگوں میں محمد حسن، قمر رئیس، عابد سہیل، جوگیندر پال، کلام حیدری، رام لعل، قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، احمد یوسف وغیرہ خاص تھے۔ بعد میں محمد حسن صاحب نے بیس نئی کہانیاں پر عصری ادب میں تبصرہ کیا اور نئی کہانی اور نئے کہانی کاروں کا استقبال کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سیمینار میں غضنفر شریک نہیں ہوئے اور نہ بیس نئی کہانیوں میں ان کی کوئی کہانی شامل ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس وقت تک بحیثیت کہانی کار ان کی پہچان نہیں کے برابر تھی۔ ان کے کچھ افسانے اس وقت شائع ہوئے جب وہ سولن جا چکے تھے۔ انھیں دنوں الفاظ میں میں نے ان کا افسانہ ڈگڈگی پڑھا تھا۔ جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ غضنفر میں افسانہ لکھنے کی بھی صلاحیت ہے۔ وہ اگر اس طرف توجہ دیں تو زیادہ اچھی بات ہوگی اور یہ بات میں نے سولن کی ملاقاتوں میں بار بار کہی تھی۔ لیکن اس سے قبل ایک بات کا ذکر اور ضروری ہے کہ جب میں نے یہ سنا تھا غضنفر شبلی پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں اور میں نے شرر پر کام کرتے ہوئے کہیں پڑھا تھا کہ شرر سرسید کے رفقائے کار میں سب سے زیادہ شبلی سے متاثر تھے۔ شرر شبلی سے زیادہ کھلا ذہن ضرور رکھتے تھے لیکن اسلامیات کے سلسلے میں وہ شبلی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے رسالہ دلگداز میں شبلی کی

کئی کتابوں پر بہت اچھے تبصرے کئے اور جب ۱۹۱۴ء میں شبلی کا انتقال ہو گیا تو شرر نے شبلی پر بہت اچھا تاثراتی و تعزیتی مضمون بھی لکھا جسے بعد میں میں نے یو. پی. اردو اکادمی کی طرف شائع شدہ کتاب مضامین شرر میں شامل بھی کیا۔ تو میں شبلی کے بارے میں ایک عالمانہ ہیبت کا تصور رکھتا تھا۔ علی گڑھ سرسید کے حوالے سے زیادہ۔ سید صاحب تو بیچارے شبلی، حالی کی عزت و محبت کرتے ہوئے رخصت ہو گئے اب وہاں صرف صاحب کی صاحب رہ گئے۔ ایسے میں علی گڑھ میں کوئی شبلی پر کام کرے تو میرے لئے حیرت سے زیادہ عقیدت اور محبت کی بات تھی چنانچہ غضنفر سے محبت اور دوستی کا یہ بھی حوالہ بنا۔ محبت سے یاد آیا کہ ہم تینوں دیوانہ وار محبت میں مبتلا تھے۔ عین عالم شباب کی شب تاب بیروزگاری میں ہم نے شادیاں بھی کر لی تھیں۔ طارق کے لئے مسئلہ نہ رہا ہو لیکن غضنفر اور میرے لئے تو مسئلے ہی مسئلے تھے۔ اور شب تاب جوانی شب تار میں بدلنے ہی والی تھی کہ انھیں دنوں سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو لکچرر کی جگہ خالی ہوئی انٹرویو میں میں اور غضنفر دونوں ہی بلائے گئے۔ مجھے ڈی فل. کی ڈگری مل چکی تھی اور غضنفر کو ملنے والی تھی۔ اتفاق سے نسیم قریشی صاحب ممتحن تھے۔ انتخابات ہوئے تو پہلے نمبر پر میں تھا اور دوسرے پر غضنفر۔ غضنفر ان دنوں کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ اسی پریشانی کے عالم میں مجھ سے کہا ''فاطمی اگر تم نہ جوائن کرو تو میرا تقرر ہو جائے گا۔'' میری دوستی اور انسانیت سب خطرے میں پڑ گئی۔ اپنی تحقیق اور یونیورسٹی کی لالچ میں ہندو ڈگری کالج مراد آباد کی ملازمت چھوٹ چکی تھی جس کی وجہ سے والدین کی لعن طعن سن چکا تھا اور اب بیوی اور سسرال کی لعن طعن سننے کی تاب نہ تھی۔ غضنفر کو اپنی مجبوری بتائی تو اس نے اسی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''نہیں، نہیں تم جوائن کر لو۔ آخر تم بھی تو بے روزگار ہو، شادی شدہ ہو۔'' بھاری من سے اس اجنبی شہر میں ملازمت تو کر لی لیکن وہاں کی اجنبیت اور غیر ادبیت مجھے تقریباً ہر ہفتہ علی گڑھ پہنچا دیتی اور میرا زیادہ تر وقت قاسمی، شارق، اشرف، طارق، کنول وغیرہ کے ساتھ گزرتا۔ خورشید السلام ریٹائر ہو چکے تھے۔ ثریا حسین صدر شعبہ ہوئیں۔ نورالحسن نقوی، قاضی عبدالستار، شہریار وغیرہ میری آگرہ کی سرگرمی اور میرے علمی و ادبی مشاغل سے قدرے خوش تھے۔ مرحوم

اطہر پرویز الہ آباد کے تعلق سے خصوصی محبت و شفقت فرماتے تھے، انھیں دنوں علی گڑھ میں دو لکچرر کی جگہیں خالی ہوئیں۔ اطہر پرویز نے مجھ سے علی گڑھ آنے کو کہا لیکن میرے استاد سید محمد عقیل صاحب مجھے الہ آباد بلانا چاہ رہے تھے اور میں جلد ہی الہ آباد پہنچ گیا۔ علی گڑھ میں ان جگہوں پر باہر کے دو لوگ قاضی افضال حسین اور قاضی جمال حسین کا تقرر ہو گیا اور علی گڑھ کے کئی اچھے لوگ محروم رہ گئے جس میں غضنفر بھی تھے لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ جلد ہی غضنفر کا تقرر سولن کے اردو ٹیچنگ ریسرچ سینٹر میں لکچرر کے طور پر ہو گیا۔ بعد میں طارق چھتاری بھی ریڈیو میں پروگرام آفیسر ہو گئے۔ لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب ہم شادی کر کے ایک ایک بچے کے باپ بن چکے تھے۔ طارق ایک بیٹے کے میں اور غضنفر ایک ایک بیٹی کے۔ ۸۳ء میں جب میں الہ آباد چلا آیا تو غضنفر سولن میں تھے طارق گورکھپور میں اس لئے ملاقاتوں کے سلسلے ٹوٹ گئے۔ یہ غالباً ۱۹۸۵ء کی بات ہے ہم الہ آباد میں فراق گورکھپوری سیمینار کا اہتمام کرنے جا رہے تھے جس میں شرکت کرنے کراچی سے ممتاز ترقی پسند ناقد ممتاز حسین الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ ان کی آؤ بھگت میں مصروف تھے کہ ایک دن ڈاک میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ ملا۔ ممتاز صاحب کی آمد اور پروگرام کے انتظامات میں اس قدر مصروف تھے کہ لفافہ کھولنے تک کی نوبت نہ آئی۔ بعد میں اطمینان سے کھولا تو غضنفر کی طرف سے سولن آنے کی سرکاری دعوت تھی۔ تقریباً پندرہ بیس دن کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ہماچل کے اسکولوں میں جا کر اردو درس و تدریس کا معائنہ کرنا تھا۔ غضنفر سے ملنے کی تڑپ، سولن شملہ گھومنے کی خواہش نے ہمیں سولن پہنچا دیا۔ سولن پہنچنا بھی اپنے آپ میں ایک واقعہ ہے۔ وہاں اردو ریسرچ سینٹر کا ہونا دوسرا واقعہ۔ جب ہم سولن پہنچے تو غضنفر اور بشریٰ بھابی نے جس طرح استقبال کیا اس نے فوری طور پر ہمیں ایک بار پھر حیرت میں ڈال دیا۔ اس وقت تک غضنفر ایک بیٹے کا بھی باپ بن چکا تھا۔ میاں بیوی دو چھوٹے چھوٹے بیٹی بیٹے اور پہاڑ کی وادیوں میں بسا ہوا چھوٹا سا گھر لیکن بشریٰ بھابی کی نفاست اور سلیقہ مندی کا اعلان کرتا ہوا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہاں سبھی گھر اور محلے ٹیڑھے میڑھے ہیں لیکن لوگ بڑے سیدھے ہیں۔ غضنفر کی سادگی اور شرافت ہماچل کے گنگناتے آبشاروں،

منڈراتے بادلوں اور بہتے ہوئے ٹھنڈے نیلے پانیوں میں گھل مل گئی اور وہ اسی فطرت کا حصہ معلوم ہونے لگے۔ اس لئے اس بار جب میں غضنفر سے ملا تو ایک نئے غضنفر سے تعارف ہوا۔ وہ ایک عمدہ شوہر اور دوست تو تھے ہی ایک بہترین استاد، رفیق کار اور فن کار بن چکے تھے۔ ایک ذمہ دار انسان بھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ہم دونوں بیس بائیس دنوں تک ہماچل کے مختلف شہروں دور دراز علاقوں میں بسے اسکولوں میں جا کر اردو پڑھتے ہوئے پہاڑی بچوں کو دیکھ کر خوش ہوئے ہی اس سے زیادہ خوشی ہوتی ان غیر مسلم اردو ٹیچروں سے مل کر۔ ان کی خاطر تواضع ان کے دلوں میں غضنفر کے لئے بے پناہ عزت و احترام دیکھ کر۔ اس سفر اور قیام میں ہم نے سولن، شملہ، کلو، منالی کے خوبصورت قدرتی مناظر دیکھے ہی وہاں کا کلچر، رہن سہن، کھان پان، ان کی مہمان نوازی، سادگی اور ایمانداری دیکھ کر میں یو۔ پی۔ کا حیران تو تھا ہی اس سے زیادہ پر مسرت حیرانی تھی غضنفر کو کہ وہ بہار کا تھا۔ اس کے برعکس یہ بھی صورت تھی کہ ہم ہماچل کی خوبصورتی اور سادگی سے جس قدر متاثر تھے وہاں کی غربت و افلاس نے ہمارا دل بھی دکھایا۔ غضنفر جو پورے سفر میں پوری ایمانداری کے ساتھ حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا اور میں وہاں کی تہذیب و ثقافت اور سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ہم دونوں ان موضوعات پر اکثر باتیں کرتے۔ غضنفر اسی فطری سادگی کے ساتھ وہاں کے سارے حالات سے ہمیں آگاہ کرتا۔ کچھ ایسی اندرونی معاشرتی باتیں جو ایک دانشور کم فنکار دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ اس صحبت اور گفتگو سے صاف اندازہ ہوا کہ وہ غضنفر جو علی گڑھ میں محض ایک شاعر تھا اب ایک ذمہ دار انسان، حساس فنکار بن چکا ہے۔ اس لئے کہ اس نے ہمیں صرف اطلاع نہ دی تھی بلکہ اس اطلاع میں درد تھا۔ ایک ایسا درد جو اندر ہی اندر اسے کرب میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ لیکن ملازمت اور گھر کی ذمہ داریاں اسے دبائے ہوئے ضرور تھیں وہ چھلکنے اور باہر آنے کے لئے بیتاب تھا۔ اس سفر میں مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے اندر کا چھپا ہوا افسانہ نگار اب بیدار ہو چکا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے باطن کا شاعر اور افسانہ نگار باہم متصادم ہوں اور یہ تصادم غضنفر کو مشکل اور کشمکش میں ڈالے ہوئے ہو۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین تھا کہ غضنفر کے مزاج کی

سادگی اور ایمانداری اس کرب اور تصادم کا پوری ایمانداری سے سامنا کرے گی اور جو مناسب اور فطری راہ تلاش کرے گی اسے اپنانے میں غضنفر کو کوئی ہچک اور مصلحت نہ ہوگی اور وہ پوری سچائی کے ساتھ اس راستے پر چل پڑے گا۔ اور وہی ہوا جب ہم کچھ وقفہ کے بعد استاد سید محمد عقیل صاحب کے ساتھ دوبارہ سولن گئے تو وہ مکمل طور پر افسانہ نگار ہو چکا تھا۔ اور اس کے کچھ بہت اچھے افسانے کاغذ پر آ چکے تھے۔ لیکن تھوڑی سی عدم اعتمادی اور بے کیفی تھی کہ وہاں کس کو سنائے کس سے تبادلۂ خیال کرے۔ علی گڈھ کا ماحول تو اس سے مختلف تھا۔ ایسے میں غضنفر نے عقیل صاحب جیسا ناقد اور مجھ جیسا دوست پایا اور ہم لوگ اس کے ساتھ اس کے گھر پر ہی ٹھہرے تھے اور بشریٰ بھابی کے ہاتھوں سے پکی ہوئی شروم کی لذیذ سبزی کھا کھا کر لطف اندوز ہو رہے تھے تو نمک کا حق تو ادا کرنا ہی تھا اس نے اپنے افسانے سنائے اور جی کھول کر سنائے اور اپنے اندر کے عوامل و محرکات بھی بتائے۔ ان افسانوں کو سن کر مجھے بیحد مسرت ہوئی لیکن عقیل صاحب کو حیرت شاید اس لئے کہ عقیل صاحب اس وقت تک غضنفر سے زیادہ واقف نہ تھے۔ اور اس بات پر بھی کہ اتنے خوبصورت ماحول قدرتی حسین مناظر میں رہتے ہوئے غضنفر نے اس بدصورتی کو کیسے چھو لیا جو اس کے افسانوں کی آتما کی پکار بن گئی تھی۔ اس کا مرکزی خیال فنکارانہ تو تھا ہی اس سے زیادہ دردمندانہ۔ عقیل صاحب نے جی بھر کے تعریف کی اور یہ تعریف کے پہلو اس وقت زیادہ روشن ہوئے جب غضنفر نے 'پانی' نام کا ناول لکھ ڈالا۔ اس کی اشاعت سے قبل غالباً ہم لوگوں نے ہی اسے پہلی بار سنا۔ اس ناول کی اشاعت سے قبل 'ڈگڈگی'، 'پہچان' اور بعض دیگر افسانے چھپ چکے تھے لیکن ان کی ان ابتدائی کہانیوں نے اردو میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بحیثیت افسانہ نگار اپنا مثبت اور صحت مند تعارف کروا چکے تھے۔ سولن کے انھیں ایام میں انھوں نے کچھ اور بھی افسانے لکھے۔ اس کا مزاج و ماحول ان کے پچھلے افسانوں سے خاصا مختلف تھا۔ اس میں ایک خاص قسم کا جغرافیائی و ثقافتی ماحول کام کر رہا تھا۔ پہاڑ، آبشار، ندی نالے، پیڑ پودے، کھیت، باغ، چرند پرند اور عام دیہی و عوامی مزاج کے انسان۔ اردو میں ان دنوں عجیب قسم

کے علامتی و تجریدی نوعیت کے افسانے لکھے جا رہے تھے۔ لیکن غضنفر کے یہ افسانے اس نوعیت کے نہ تھے لیکن روشن علامت نگاری اور تہہ دار بیانیہ سے الگ بھی نہ تھے۔ بہر حال انھیں ملی جلی صورتوں نے آگے بڑھ کر پانی جیسے ناول کی شکل اختیار کر لی۔ وہ تو ہونا ہی تھا کہ اس عہد کے افسانوں میں فکر و فن کی بظاہر خام صورتیں اس بات کی بھی اعلان کر رہی تھیں کہ غضنفر کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اس کے ذہن میں بہت کچھ پک رہا ہے۔ جس کی چنگاریاں افسانے کے مختصر کینوس میں سما نہیں پا رہی ہیں اس لئے ان میں فنکارانہ تشنگی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تشنگی جوان کے عہد کے افسانوں میں بظاہر کمزوری سمجھی جا سکتی ہے اس نے ان کے ناول کا مرکزی خیال اختیار کر کے علامتی بیانیہ کی ایک انوکھی اور البیلی صور اختیار کی، پوری مہارت اور بلاغت کے ساتھ۔ غضنفر ۸۶ یا ۸۷ء میں الہ آباد آئے۔ اپنے شاگرد اساتذہ کے ساتھ۔ میں نے ہی سب کے قیام و طعام کا اہتمام کیا۔ یہ سب تقریباً پندرہ روز رہے۔ اس درمیان متعدد نشستیں ہوئیں۔ ایک نشست میں انھوں نے اپنے ناول پانی کا مسودہ پڑھا۔ ہم سب اس کی اردو دانی۔ تخلیقی علامتی زبان، طرح طرح کی ترکیبوں اور اصطلاحوں کو سن کر حیران رہ گئے۔ اس ناول میں ایک ماہر زبان داں، ناول نگار اور مفکر بول رہا تھا۔ اس وقت جو تبصرے ہوئے سو ہوئے۔ میری حیرانی یہ تھی کہ بھولے اور سیدھے سے غضنفر میں اتنی دانشوری اور فنکاری کہاں سے آئی۔ وہ غضنفر جو علی گڑھ میں اپنے تقرر کے لئے ذرا بھی حکمت عملی سے کام نہ لے سکا اپنے گھر میں چراغ نہ روشن کر سکا وہ دوسروں کی روشنی اور پیاس کے لئے کس قدر تڑپ رکھتا ہے۔ میرے دل میں ایک دوست کی حیثیت سے غضنفر کے لئے جو پیار تھا اس نے ایک قاری کی حیثیت سے عزت کا روپ لے لیا۔ اور مجھے صاف اندازہ ہونے لگا کہ بحیثیت فکشن رائٹر جلد ہی غضنفر اپنا مقام بنا لے گا۔ لیکن تھوڑی سی فکر بھی تھی کہ اس راہ میں جو چلت پھرت اور کرتب بازی کی ضرورت پڑتی ہے اسے غضنفر کس طرح اپنا سکے گا۔ اس لئے کہ اسے تو یہ سب آتا ہی نہیں ہے۔ لیکن فکر و فن کا طلسم ایک ایسا طلسم ہے جو ہزاروں کرتب بازیوں کو روند کر اکادمیوں و اداروں کے اعزاز کو ٹھوکر مار کر قارئین کے دل و دماغ پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں توجہ اور

پسندیدگی کا وہ تاج پہنتا ہے جو بڑے بڑوں کے نصیب میں نہیں آتا۔ ہم سب واقف ہیں کہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس اردو کے جن تین ناولوں نے اردو ناول کا رخ موڑ دیا ان میں عبدالصمد کا ''دوگز زمین''، پیغام آفاقی کا ''مکان'' کے ساتھ ساتھ غضنفر کا ''پانی'' تھا۔ پانی کے ہر طرف چرچے، تذکرے اور تبصرے تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ آج سے تقریباً بارہ تیرہ سال قبل (۸۹ء) قبل چھپا محض سو صفحات پر مشمل یہ ناول وہ کام کر گیا جو موٹے موٹے ناول نہ کر سکے۔ آج بھی نئی ناول نگاری کی ابتداء کی بات ہوگی تو 'پانی' کا ذکر ضرور ہوگا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ پانی کے اس بہاؤ میں بڑے بڑے شاطر اور بڑے بڑے پرویز بہہ گئے۔ سبھی حیران تھے، میں بھی حیران تھا لیکن میری حیرانی اس ناول کی زبان کو لے کر زیادہ تھی۔ ایسی مفرس ومعرب اور کلاسیکی زبان غضنفر نے کہاں سے سیکھی۔ کیا اس کا شاعر ہونا کام آیا یا شبلی پر کام کرنا کام آیا۔ یا سولن میں اردو املا اور اردو لسانیات کے نئے نئے سبق سیکھ کر اس نے یہ قدیمی اور کلاسیکی زبان استعمال کی۔ بہرحال پانی کے کامیابی کی جتنی خوشی غضنفر کو تھی کہ وہ بہرحال اس کے اصل خالق ہیں اتنی ہی مجھے بھی کہ اس کی اشاعت سے قبل اس کو سنتے وقت۔ رائے مشورہ کے وقت۔ گفتگو در گفتگو کردار در کردار میں بھی اس میں شریک تھا۔ اس لئے میں اپنے آپ کو پانی کا کوآتھر (Co Author) سمجھ رہا تھا۔ غضنفر کی اکثر کہانیوں اور ناولوں کے پہلے قاری میں یا طارق رہے ہیں۔ وہ جتنے بھولپن سے اپنی تخلیقات سناتا ہے اتنی ہی معصومیت اور فراخ دلی سے ہماری تنقید بھی برداشت کرتا ہے۔ یہی اس کا بڑکپن ہے۔ اور اس کی تخلیقی عظمت کی دلیل۔ مجھے اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ تربتوں کے شہر کے مقابلے پربتوں کا یہ شہر اس کو راس آ رہا تھا۔ گوپال گنج سے نکلے ہوئے غضنفر کو علی گڑھ تو اتنا راس نہیں آیا لیکن سولن اور شملہ ضرور موافق وہموار تھا۔ شبلی اور شاعری کے مقابلے افسانہ نگاری اسے موافق آ رہی تھی اور علی گڑھ کی چائے کے مقابلے سولن کا پانی اسے نہ صرف سرسبز وشاداب کر گیا بلکہ اس کی فکری اور تخلیقی سفر کے دھارے موڑ دیئے۔ اب ہر طرف غضنفر کے چرچے تھے۔ شہرت تھی، ایسی شہرت جس سے بڑے بڑوں کے مزاج بدل جاتے ہیں۔ اور ان پر غم ناک نحوست اور المناک رعونت طاری یہ

ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا کہ اس کا بھولا پن، معصومیت، سادگی اسی طرح برقرار ہے بلکہ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر انسان دوستی اور روشن خیالی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے اندر ایک تخلیقی سنجیدگی کا اضافہ ہو گیا تھا جس نے اس کو خود نگری اور خود نمائی کے مزعومانہ عناصر سے دور رکھا۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ اس کی فطرت ہی اس سے مختلف ہے اور یہی فطرت ہی اسے لے گئی ان عناصر کی طرف جسے بعد میں اس نے اپنے دیگر افسانوں اور ناولوں میں جذب و پیوست کئے اور اس کا تخلیقی سفر تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ اسی درمیان ملک کے حالات بدلے، فرقہ وارانہ سیاست، تفریق اور نفرت کی نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ اس ضمن میں ۹۲ء میں بابری مسجد کا حادثہ تو ایک علامت بن گیا۔ اس عہد کے تقریباً تمام شاعر اور افسانہ نگار اس ماحول سے متاثر ہوئے اور الگ الگ انداز سے ان موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ کچھ افسانہ نگاروں نے اس سنجیدہ و حساس موضوع کے ساتھ بھی کھلواڑ کیا اور کرتب بازی دکھانی شروع کی۔ وہ ان کی مجبوری بھی تھی۔ اور کمٹ منٹ کی کمزوری بھی لیکن غضنفر جیسے افسانہ نگار نے اس موضوع کو نئے ڈھنگ سے برتا۔ طبیعت کی شرافت اور انسانیت نے اپنا اثر دکھایا اس نے نہایت سادگی کے ساتھ فرقہ واریت جیسے نازک موضوع کو آسان تر اور پر اثر بنا دیا۔ ملاحظہ کیجیے اس کے افسانے 'خالد کا ختنہ'، 'کڑوا تیل' اور بعض دوسرے افسانے۔ جن کے عنوان ہی بتا رہے ہیں کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی سے کس قدر قریب ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے اور غضنفر کی بے تکلف گھریلو قسم کی شخصیت پر غور کیجیے غضب کی مماثلت نظر آئے گی لیکن یہ مماثلت وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے ان دونوں کو قریب سے پڑھا اور محسوس کیا ہو۔ ان کے بعد کی کہانیوں کو پڑھیے تو صاف اندازہ ہوگا کہ غضنفر شعر تو سہل ممتنع میں کہتے ہی ہیں افسانے بھی سہل ممتنع میں لکھتے ہیں۔ اور اپنی زندگی بھی سہل ممتنع میں بسر کرتے ہیں۔ غضنفر کی شخصیت اور فن کے اسی اسلوب اور ہنر کو دیکھ کر یہ احساس یقین میں بدل گیا کہ فن تو دراصل مشکل بات کو سہل ممتنع میں ہی کہنے کا نام ہے۔ جینے کا نام ہے اور زندہ جاوید ہونے کا نام ہے۔ پریم چند، منٹو وغیرہ یونہی تو زندہ جاوید نہیں ہو گئے۔ ان کے

افسانوں میں ہی نہیں ان کی زندگی میں بھی یہ فن بدرجہ اتم موجود ہے۔

چند برسوں کے بعد غضنفر کا ٹرانسفر لکھنؤ ہو گیا۔ ہم اور قریب آ گئے۔ اس قربت سے اندازہ ہوا کہ بکھرے ہوئے غضنفر اب منظم اور انداز میں کام کرنے لگے ہیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ مزاج ان کو دفتر نے دیا یا بشریٰ بھابی نے۔ اسی طرح انھوں نے ادب میں بھی اپنی بعض بکھری ہوئی کہانیوں کو نظم وضبط دے کر کہانی انکل نام کا ناول لکھ دیا، جو بالکل ایک الگ نوعیت کا ناول ہے۔ اس کے بعد ایک اور ناول کینچلی لکھا۔ کہانی انکل پر ہم نے الہ آباد میں مذاکرہ بھی کیا۔ ناول پسند ضرور کیا گیا لیکن پانی جیسی شہرت اسے نہ مل سکی۔ پہلی تخلیق ہٹ ہو جائے تو مشکل تو ہوتی ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لکھنؤ میں انھوں نے مجھے اپنے ناول دویہ بانی کا مسودہ پڑھ کر سنایا جو اس وقت مجھے پسند نہ آیا تھا شاید اس لئے کہ اس کی زبان سخت ہندی تھی جو اس وقت مجھے پسند نہ آئی لیکن جب دویہ بانی چھپ کر آیا اور میں نے باضابطہ اس کا مطالعہ کیا تو میں اس کی ہندی دانی پر دنگ رہ گیا۔ پانی کی زبان کے بالکل برعکس وہ ایک بہترین قدیم ہندی زبان میں لکھا گیا ہندو سبھیتا پر بہترین ناول ہے۔ وہ ایک دلت نظام پر لکھا گیا اردو کا پہلا ناول ہے جس میں باقاعدہ صرف زبان ہی نہیں، کردار ہی نہیں مکمل نظام اور اس نظام سے نہ جانے کتنے اٹھتے ہوئے سوال اور استحصال جنم لے رہے ہیں۔ میں حیران رہ گیا کہ ہندوستان کے قدیم اور جدید سماجی نظام اور انسانی استحصال کو لے کر اتنے معنی خیز اور فکر انگیز سوال غضنفر کے ذہن میں کہاں اور کس طرح سے آئے اور اس نے یہ پختہ اور کلاسیکی ہندی زبان کہاں سے سیکھ لی۔ میں نے دویہ بانی کو دوبار پڑھا اور ناول سے متعلق اپنے ایک مضمون میں اس کا خوب خوب ذکر بھی کیا۔ لیکن یہ سوال اس وقت اور بھی کلبلانے لگا جب اس نے اپنی تازہ کہانی 'سائبر اسپیس' نیا سفر کے فکشن نمبر کے لئے دی۔ اس کو پڑھنے کے بعد بھی میری میری حیرانی میں اضافہ ہی ہوا کہ یہ تو ہم سے اور ہماری آئیڈیالوجی سے زیادہ ترقی پسند ہے۔ اس حد تک کہ ہم تو صرف باتیں کرتے ہیں غضنفر نے تو 'دویہ بانی' اور اس کے بعد کی کہانیوں میں اپنے خیالات کو ایک فیصلہ کن ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ کوئی نسل کشی مکمل طور پر کامیاب نہیں

ہوتی، کوئی ذی روح اس نسل کو زندہ کرتا ہے۔ غضنفر نے اردو کے تازہ ترین فکشن کو جو مسئلہ اور جو بیانیہ دیا ہے اور دیتا جا رہا ہے اس کی آج سخت ضرورت ہے۔ غضنفر جس راستے پر چل پڑے ہیں اس راہ پر اگر چہ اردو فکشن جو پہلے قدرے گمراہی کا شکار تھا، اب چل پڑا ہے اور اسے راہ راست پر لانے میں غضنفر کی نسل کا ہاتھ تو ہے ہی غضنفر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

اس درمیان جانے انجانے میں عملی زندگی میں غضنفر سے ایک چوک بھی ہو گئی۔ علی گڑھ کی تعلیم وتربیت نے انھیں مدرس ہونے کی چاہ تو پیدا کر ہی رکھی تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کی خواہش بھی دبی ہوئی تھی جو ایک خاص موقع پر ابھری اور ایک موقع ملا تو وہ اپنی پختہ ملازمت اور پرنسپل شپ چھوڑ کر عارضی طور پر شعبہ اردو میں ریڈر ہو گئے۔ لیکن ڈھائی تین سال گزر جانے کے بعد بھی وہ جب وہاں مستقل نہ ہوئے یا نہیں ہونے دیا گیا تو مجبور ہو کر انھیں واپس آنا پڑا۔ لیکن اس درمیان انھوں نے علی گڑھ میں اپنا مکان بنوالیا اور بیوی بچوں کو بھی منتقل کر دیا۔ ڈھائی تین سال کا یہ وقفہ ایک تلخ احساس کی طرح ان کے سینے میں اٹک گیا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی واپسی پر رنجیدہ نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں اور خوب کام کر رہے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہاں رہ کر وہ جتنا کام کر سکیں گے علی گڑھ میں رہ کر نہیں کر سکتے تھے اس کی وجہ یہی ہے کہ غضنفر کی سادگی، اس کی شریفانہ سوچ اور خلاقانہ اپج سولن، شملہ جیسی اجنبی وادیوں میں تو گل کھلا سکتی ہے علی گڑھ میں نہیں۔ علی گڑھ میں وہ رہتے تو صرف شاعر ہوتے لیکن اس میں بھی وہ عبید صدیقی ہوتے، نہ اسعد بدایونی البتہ مہتاب حیدر نقوی کی طرح ضرور ہو جاتے۔ اچھے شاعر، اچھے دوست اور اچھے انسان۔ لیکن گوشہ نشین۔ آج جو ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت ہند و پاک کی سرحدوں کو چھو رہی ہے شاید وہ مقدر میں نہ ہوتی اور اردو کا نیا ناول اور افسانہ ان کے قابل ذکر افسانوں اور ناولوں سے یقیناً محروم رہ جاتا۔ اس بات کا احساس غضنفر کو علی گڑھ کے پہلے طویل قیام میں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس ڈھائی تین سال کی مدت میں ضرور ہو گیا۔ اس لئے اب جہاں وہ ہے خوش اور مطمئن ہے۔ اور اس کے میرے جیسے احباب بھی خوش اور مطمئن ہیں۔

غضنفر آج اردو فکشن کا بہت اہم اور شہرت یافتہ نام ہے۔ لیکن یہ شہرت اس نے ادبی ریاکاری اور افسانوی کرتب بازی یا شاعرانہ مکروفریب سے حاصل نہیں کی جیسا کہ ان دنوں عام ہے۔ یہ شہرت وسعادت اس نے واقعی اپنی ریاضت، محبت، شخصیت کی سادگی اور ایمانداری اور فنکارانہ ذمہ داری کو باہم متھ کر فکشن کا ایک فکری اور فطری راستہ اپنا کر حاصل کیا ہے۔ اگر ایک طرف اس نے 'پانی' میں اردو زبان کی مہارت اور خلاقی دکھائی ہے تو دوسری طرف 'دویہ بانی' جیسا ناول لکھ کر ہندو تہذیب کے دیرینہ فرسودہ نظام کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ان کی کہانیاں ملی جلی زبان، بیان، اسلوب، آہنگ کا نمونہ ہیں اس لئے کہ وہ اپنی بات کو عام آدمی تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ جو آسان زبان لکھ سکتا ہے وہی مشکل زبان بھی لکھ سکتا ہے۔ اور جو صرف مشکل زبان لکھتا ہے وہ آسان زبان نہیں لکھ سکتا۔ تخلیقی زبان تو لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے حصہ میں صرف افلاطونی زبان آتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو بہت جلد افلاطون سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن ایسے بقراط قسم کے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ افلاطونی شخصیت، قاموسی قابلیت، دانشورانہ اظہاریت یہ سب تو ظاہری صفات ہیں جنھیں عام انسانی تہذیب اور ادبی تاریخ بہت جلد بھلا دیتی ہے۔ اس لئے یہ سب عملی طور پر اندر سے کھوکھلی ہوتی ہیں۔ غضنفر کی یہی ادا انھیں بحیثیت انسان اور بحیثیت فنکار زندہ رکھے گی کہ انھوں نے اپنی غزل گوئی کو غزل بازی میں نہیں بدلا اور اپنی افسانوی حقیقت کو غیر حقیقی افسانوں کی شکل میں نہیں پیش کیا۔ ان کے بعض ناول علامتی، تخیلی ضرور ہیں لیکن ان سب کا ماضی سے لے کر حال تک کی حقیقت سے گہرا تعلق ہے۔ وہ لکچرر ہوئے۔ پرنسپل ہوئے۔ پروفیسر ہوئے۔ شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار سبھی کچھ ہوئے لیکن افلاطون نہیں ہوئے۔ ایک اچھے انسان اور اچھے دوست ہی رہے۔ اسی لئے آج بھی ان کے ذہن میں ایک عام انسان کے طرح طرح کے دکھ درد و مسائل کی داستان بسی ہوئی ہے جو خون جگر کے ذریعہ ان کے افسانوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔ اور وہ اس کو پورے دردمندانہ اور فنکارانہ انداز میں پیش کرتے جا رہے ہیں اپنی شخصیت کی بھرپور سادگی اور ہمدردی کے ساتھ۔ فکر و خیال کا یہ وہ عمل ہے جس سے دیدۂ دل آئینہ کی طرح صاف اور شفاف رہتے

ہیں۔یہی پاکیزہ آلودگی یا آلودہ پاکیزگی ان کی تخلیقات میں بھی منعکس ہے۔جس میں آپ بہ آسانی آج کے عہد کا پورا انسان اور ہندوستان دیکھ سکتے ہیں۔

ایسا لگتا تو ہے کہ غضنفر نے شعوری یا لاشعوری طور پر تخلیق کی عظمت کا یہ راز پالیا ہے اور راہ بھی لیکن ابھی شاہراہ پر چلنا باقی ہے لیکن ان کی عرق ریزی، دردمندی، کوشش و کاوش کا سفر یونہی جاری رہا اور وہ اس راہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے تو یقین کامل ہے کہ آنے والا وقت انھیں اس منزل پر لا کھڑا کرے گا جہاں پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جہاں تک غضنفر، طارق اور فاطمی کے رشتوں اور محبتوں کا تعلق ہے تو اس کو رقم کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے، جو فی الحال ممکن نہیں اس لئے کہ ابھی تو ہماری دوستی کی صرف ایک ربع صدی ہی گزری ہے۔ ذرا نصف صدی گزرنے دیجئے ہمیں یقین ہے کہ ہم اس وقت بھی یہی کہیں گے کہ۔

یہ زندگی تو بہت کم ہے دوستی کے لئے
کہاں سے وقت نکلتا ہے دشمنی کے لئے

□□□

ایک ماڈرن صوفی کی کہانی

طارق چھتاری کے بارے میں لکھنا میرے لیے بے حد مشکل ہے۔ ہم عصروں اور دوستوں کے بارے میں لکھنا کیوں مشکل ہوا کرتا ہے اس کا احساس شدت سے اب جا کر ہوا ہے ورنہ میں اکثر ہم عصر شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں کے بارے میں لکھتا ہی رہا ہوں۔ احباب مجھ سے خوش بھی ہوئے ہیں اور ناراض بھی، ناراض اس لیے کہ میرے قلم سے اس مقدار میں تعریف نہیں نکلی جتنی کہ وہ چاہتے تھے اور خوش اس لیے کہ بعض کی میں نے مروتاً کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی تھی جس پر ایک بار ممتاز بزرگ ناقد وارث علوی نے مجھے تنبیہ کی تھی اور واضح طور پر کہا تھا کہ ادب کے ساتھ انصاف کرو دوست کے ساتھ انصاف ہو یا نہ ہو، تنقید میں دیانت داری چلتی ہے دنیاداری نہیں، تب سے میں عصری ادب اور ادیب کو لے کر محتاط ہو گیا۔ شاید یہ احتیاط ہی مانع رہی جس کی وجہ سے میں اپنے بیحد ہردل عزیز دوست بلکہ علی گڈھ کی زبان میں ''جگر'' کے بارے میں اب تک کچھ نہ لکھ سکا۔ حالانکہ مجھے ان سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت سست رفتار ہیں، کافی دنوں سے کچھ نہیں لکھا ہے اور اگر علی گڈھ کے ہی دوسرے ''جگر'' کی یہ بات مان بھی لی جائے یعنی 'قمر الہدیٰ فریدی' کے اس خیال سے اتفاق کر لیا جائے کہ ''موضوعات کے انتخاب میں افسانہ نگار کی احتیاط پسندی اور کسی اچھوتے پہلو کی تلاش بسیار نویسی میں مانع رہی۔'' چلیے مان لیا جائے کہ بسیار نویسی اچھی بات نہیں لیکن بسیار خاموشی کو کیا نام دیا جائے۔ 'باغ کا دروازہ' میں انیس (۱۹) افسانے شامل ہیں جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا اور جو بقول فریدی ''ان کے تقریباً پچیس سالہ ادبی سفر کا حاصل ہے۔'' اس اعتبار سے سال میں ایک افسانہ کا اوسط بھی نہیں پڑتا چلیے پھر بھی بسیار نویسی کے مقابلے قلت نویسی کو بہتر مان لیا جائے لیکن اس مجموعہ کے بعد سولہ برس گذر چکے ہیں اس درمیان کتنے افسانے شائع ہوئے۔ قریبی دوست ہونے کے ناتے کہہ سکتا ہوں کہ سال میں ایک چوتھائی افسانہ بھی حصہ میں نہیں آتا ایک ناول

ضرور لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصے ہم چند قریبی دوستوں نے علی گڈھ کی محفلوں میں سنے لیکن اسے سنتے ہوئے بھی مدت گذر گئی۔ پتہ نہیں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور ہماری کمزور ہوتی ہوئی نگاہوں سے گذر سکے گا یا نہیں جبکہ طارق چھتاری ایک ذمہ دار انسان ہیں۔ شریف شوہر ہیں (جو عام طور پر نہیں ہوتے) یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ کھاتا پیتا گھر ہے۔ چین ہے آرام ہے لیکن شاید یہ آرام سکون ہی مانع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تخلیق کا کیڑا آزار میں کلبلاتا ہے پریشان کرتا ہے تب ذہن اور قلم حرکت میں آتا ہے۔ اور جب جب ایسا ہوا ہے طارق کے قلم نے وہ جولانیاں بھری ہیں ایسے چونکا دینے والے افسانے لکھے ہیں کہ جن پر مدتوں بحثیں ہوتی رہی ہیں اس کے ایک ایک پہلو پر ہم دوستوں نے طرح طرح کی گفتگو کی ہے اور پھر جواب میں طارق کی ٹھہری، سنبھلی اور متوازن سنجیدہ گفتگو۔ ادب کی فہم اور خاص طور پر فکشن کی سمجھ غیر معمولی کیا کیا نعمتیں ہیں ان کے پاس لیکن کبھی کبھی یہ نعمتیں ہی زحمتیں بن جاتی ہیں۔ مقدار کا معاملہ جتنا سپاٹ اور سادہ ہوتا ہے معیار کا معاملہ اتنا ہی الجھا ہوا پریشان کرتا ہوا۔ طارق ادب کے معاملے میں اکثر پریشان رہے ہیں۔ ذاتی ملاقاتوں اور گفتگو میں یہ پریشانی کھلی بھی ہے، لیکن آج کل بند ہے۔ کیوں اتنا سنجیدہ فنکار خاموش ہے؟ کیا اسے صرف خاموشی اور تساہلی کا نام دے دیا جائے یا ادب کے نام پر غیر ادب کا شور بے ہنگم ماحول۔ ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں کی گھڑ دوڑ، حرص وہوس۔ بازار وادا سے ایک گونہ پریشان کیے ہوئے ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا قریبی دوست ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہوں اور یہ دعویٰ بخوشی طارق کو بھی منظور ہوگا لیکن یہ دعویٰ کر پانا مجھ سے بھی زیادہ قریبی احباب مثلاً سید محمد اشرف، غضنفر، صغیر افراہیم وغیرہ کے لیے بھی مشکل ہوگا کہ طارق کے باطن میں کیا کھلبلی ہے اس خاموشی کے پیچھے کیا بے چینی ہے۔ کیا پک رہا ہے اور اگر پک رہا ہے تو وہ پک کر باہر کیوں نہیں آرہا ہے باہر آنے کا خوف ہے یا خوف کی بے معنویت بے مقصدیت۔ اس راز کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے طارق کی شخصیت و ذہنیت کو تو کھنگالنا ہی ہوگا نیز اس عہد کو کہ جب اس نے لکھنا شروع کیا اور آج کے عہد کو کہ

جب وہ کم کم لکھ رہا ہے یا اس عہد کے بیشتر لکھنے والوں کو دیکھئے اور ان کے تیس پنتیس سالہ ادبی وتخلیقی سفر کو بغور ملاحظہ کیجئے اور اس کے بعد بدلتے ہوئے عہد بگڑتے ہوئے اقدار کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ ہمارے ہی عہد کے ممتاز ترین افسانہ نگار سلام بن رزاق نے اپنے تازہ ترین مضمون افسانہ اور عصر حاضر کے چیلنج، میں پہلے ایک جگہ یہ لکھتے ہیں:

''آج سے چالیس پنتالیس سال پہلے ادب کی اہمیت اور ضرورت ایک مسلمہ حقیقت تھی_ایک زمانہ تھا جب ہمارے شعراء کے اشعار اور ادیبوں کے افسانے موضوع بحث ہوا کرتے تھے ان کا نام خاندانی ناموں کا حصہ ہوتے تھے مگر آج نئی نسل کی زبان پر مضمون کے ایکٹر مختلف کھیلوں کے کھلاڑی۔ سیاستداں، لطیفے باز، حتیٰ کہ بھانڈ اور میراثیوں کے ناموں کا تذکرہ ہوتا ہے۔''

اسی مضمون میں سلام نے یہ بھی لکھا:

''آج ہم ایک ہولناک صورتِ حال سے گذر رہے ہیں اور ایک تشویشناک کی مستقبل ہمارا منتظر ہے ایسی صورت میں پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ آج معاشرے کی افسانے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔''

کیا یہی وجہ ہے جس نے شوکت حیات اور دیگر دوستوں کو کم لکھنے یا نہ لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا یہی وجہ ہے جس نے غضنفر کو فکشن کے بجائے مثنوی 'کرب جاں' لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا یہی وجہ ہے جس نے 'حسین الحق' کو ناول کے بجائے تنقیدی کتاب لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور سید محمد اشرف تہذیب کی آخری سواری پر سوار ہونے پر مجبور ہیں۔ کیا یہی وجہ ہے کہ عبدالصمد پٹنہ کی ادبی سیاست اور شور غل سے دور اقلیت کی حالت پر ماتم کناں ہیں اور کیا یہی وجہ ہے کہ طارق چھتاری مدتوں سے خاموش ہیں۔؟ آیئے اس خاموشی کی تہہ کو تلاش کریں اور اس گفتگو کی بات کریں جہاں سے طارق

کا تخلیقی سفر شروع ہوتا ہے۔

یہ ۷۶-۱۹۷۵ء کی بات ہے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہا تھا اور کثرت سے علی گڈھ آتا جاتا تھا اور مہینوں قیام رہتا۔ انھیں دنوں جن نوجوان قلمکاروں سے میری دوستی ہوئی ان میں سید محمد اشرف، غضنفر، طارق، صغیر افراہیم، پیغام آفاقی، آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، ابن کنول، شارق ادیب، غیاث الرحمٰن وغیرہ تھے۔ ہمہ وقت انھیں دوستوں کے ساتھ گذرتا۔ شمشاد مارکیٹ کا ٹی ہاؤس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، اسٹاف کلب اور دودھ پور کی گلیاں۔ عجب دن تھے، عجب نشہ تھا۔ شعراء خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کے قریب تھے اور فکشن سے دلچسپی رکھنے والے قاضی عبدالستار کے قریب میں دونوں کے ہی قریب تھا۔ حالانکہ میں شاعر نہ تھا اور نہ ہوں۔ فکشن سے دلچسپی رہی۔ ابتداً افسانے بھی لکھے۔ اس لیے انھیں لوگوں سے دوستی زیادہ ہوئی جو فکشن سے دلچسپی رکھتے تھے جن میں طارق چھتاری بھی تھے۔ طارق اور میں ہم عمر ضرور ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں وہ کلاس میں مجھ سے پیچھے تھے جب میں ریسرچ کر رہا تھا تو وہ اردو سے ایم۔اے۔ کر رہے تھے۔ بلند شہر کے قصبہ چھتاری کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے طارق کے والد کم عمری میں انتقال کر گئے۔ دادا نے علی گڈھ میں داخلہ کرا دیا لیکن جلد ہی وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ طارق کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا جس سے وہ آسانی سے نکل نہیں پائے شاید اسی موڑ پر ان کا تعلیمی سلسلہ گڑبڑا یا لیکن جلد ہی وہ سنبھلے اور سائنس سے آرٹس کی طرف آ گئے۔ اب وہ ہاسٹل میں تھے۔ اس ہاسٹل اور اس کمرے میں جہاں کبھی علی سردار جعفری رہا کرتے تھے اور اب طارق جعفری صاحب کے بھتیجے پرویز جعفری کے ساتھ رہتے تھے بقول صغیر افراہیم ''یہ کمرہ انھیں اس لیے بھی عزیز تھا کہ اس میں کئی سال تک علی سردار جعفری رہے تھے اور اب ان کا بھتیجا پرویز جعفری ان کا روم پاٹنر تھا۔'' صغیر نے اپنے مضمون میں یہ بھی اطلاع دی کہ ٹھیک انھیں دنوں جب کہ وہ بی۔اے۔ کے ہی طالب علم تھے انھوں نے اپنا پہلا افسانہ 'تین سال' سنایا تھا میں نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اس لیے دعویٰ سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن عنوان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نوجوان کے وہی تین سال رہے ہوں گے۔

جب دادی دادا، والد بھی بزرگوں کا سایہ آگے پیچھے اٹھ گیا اور طارق اس دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ ان کے والد بھی اپنے بھائیوں میں اکیلے تھے۔ اور آج طارق کا بیٹا بھی اکیلا ہے۔ یہ اکیلے پن کی روایت اور کفایت شعاری کی عادت خاندانی ہے جس پر طارق چلتے رہے چلتے رہے پھر کچھ ایسی عادت پڑی کہ کفایت شعاری ان کی افسانہ نویسی کو بھی متاثر کر گئی۔ خاندانی وضعداری اور روایت کی پاسداری طارق کے شعار کا تہذیبی اور نفسیاتی حصہ ہے لیکن یہ حصہ پختہ اور بالیدہ ہو کر فطری طور پر ان کی شخصیت سے لپٹ گیا ورنہ نوجوانی اور خون کی روانی روایات سے انحراف کرنے اور الٹ پلٹ کر دینے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ منزل طارق کی زندگی میں بھی آئی۔ ہوسٹل کے قریب دودھ پور کی گلی میں پروفیسر مختارالدین احمد آرزو رہا کرتے تھے ان کی خوبصورت نرم و نازک بیٹی جو سرو سمن کی نازک بیل کی طرح تھی اچانک ان کے جسم و جان سے لپٹ گئی اور کائنات روح بن گئی یہ واقعہ غالباً ۱۹۷۵ء کے آس پاس کا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ پُر مسرت تقریب میں میں شریک ہوا تھا یا نہیں لیکن جب طارق مع اپنی بیگم اسی گھر کے ایک حصہ میں رہنے لگے تو میری حاضری برابر ہوتی اور یاسمین بھابی کے ہاتھوں کی چائے و دیگر اشیاء پینے کھانے کے ہزار ہا موقع ملے۔ اس زمانے کا علی گڑھ بہت سرگرم تھا۔ جدیدیت کا شور و زور تھا۔ طارق کے قلم کا بھی زور تھا مجھے یاد ہے کہ انھیں دنوں میں نے 'سنڈے کلب' میں ان کا افسانہ دس بیگھے کھیت سنا تھا۔ کچھ کہانیاں انھوں نے 'کارواں کلب' میں بھی سنائی تھیں۔ دس بیگھے کھیت کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کہانی کا تعلق دیہات اور قصبات سے ہے۔ طارق کا تعلق بھی کھیت باغ اور دیہات سے رہا ہے پھر ان دنوں قاضی عبدالستار کے افسانوں کا بھی اثر تھا۔ پھر وہ ان اثرات سے باہر بھی نکلے۔ مجھے یاد ہے کہ شارق ادیب یا اسعد بدایونی کے کمرے میں ایک محفل ہوئی تھی جس میں طارق نے افسانہ سنایا تھا وہ بالکل جدید رنگ میں تھا۔ ہم سب نے بے باکی سے اپنے اپنے خیالات پیش کیے لیکن جب طارق کی باری آئی تو انھوں نے بھی صاف گوئی سے کہا کہ آپ لوگوں کی آراء کا شکریہ لیکن میں ان آراء سے اتفاق اس لیے نہیں کرتا کہ میں نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں آپ لوگوں نے

کیسے سمجھ لیں۔ میں نے تو کچھ اور کہا ہے۔ پھر وہ اندر کی باتیں باہر لانے لگے جس سے ہم لوگ متفق نہیں ہوئے خوب بحث ہوئی۔ شارق تو بحث کرنے اور تیز تیز بولنے میں ماہر تھا۔ آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے لیکن اس ہنسی میں جدیدیت کی وہ تجریدیت پوشیدہ تھی جو اس زمانے میں فیشن بنی ہوئی تھی کہ تخلیق آسانی سے سمجھ میں نہ آنے پائے۔ ابہام، تذبذب اور کم فہمی بلکہ کج فہمی جدیدیت کے عناصر سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ سارے افسانہ نگار اس نقصان کا اعتراف کرتے ہیں جس کا وہ خود شکار ہوئے تھے۔ آج سلام بن رزاق افسانہ کے تعلق سے عمدہ و سنجیدہ باتیں کر رہے ہیں اور اس حد تک لکھ رہے ہیں ''ادب میں تجربوں کی بڑی اہمیت ہے اگر ادب میں تجربے نہ ہوں تو سارا ادب بھوانی کی اس تلوار کی مانند ہو جائے جو لندن کے برٹش میوزیم میں سجا کر رکھی گئی ہے۔ قابلِ احترام، متبرک اور عظیم مگر بے مصرف۔ ادب میں تجربے یقیناً مستحق ہیں مگر تجربہ وہی زندہ رہتا ہے جس کا خمیر زندہ فن کی روایت سے اٹھا ہو۔ جدت کے نام پر ٹوپی سے خرگوش نکالنا شعبدہ گری تو ہو سکتی ہے تجربہ ہرگز نہیں'' یہی ''ہرگز نہیں'' لکھنے والے آج کے سلام بن رزاق کل جدیدیت کے اثر میں ننگی دوپہر کا سپاہی جیسے افسانے لکھ رہے تھے۔ حسین الحق، عبدالصمد، انور قمر، بیگ احساس یہاں تک کہ طارق چھتاری بھی اسی کا شکار رہے۔ یہ ایسی کوئی بری بات نہیں کہ ماحول کا اثر تو کچھ نہ کچھ پڑتا ہی ہے لیکن یہ سارے کہ سارے جلد ہی اس ماحول سے نکل آئے اور کچھ بہت اچھے تجربے سے بھرے ہوئے افسانے لکھے جس نے یقیناً اضافے ہی کیے۔ ہر منفی شے کا ایک مثبت پہلو بھی ہوتا ہے اگر ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی اس پر نظر ہے تو تبدیلی آنا ناگزیر ہے۔ اور جو اڑیل ہوتے ہیں وہ قمر کی طرح ڈوب جاتے ہیں۔ قصہ پارینہ بن جاتے ہیں۔ یہ کہنا کہ طارق پورے طور پر جدیدیت کے اثر میں رہے شاید غلط ہو گا۔ ماحول کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور رہا ہوگا لیکن بہت کچھ طارق کا اپنا ہے۔ اس لیے کہ طارق میں وہ کمزوری ہے ہی نہیں کہ وہ فیشن کا شکار ہو جائیں۔ سیلاب میں بہہ جائیں۔ اس لیے کہ طارق ابتدا سے ہی سنجیدہ اور سوچنے والا ذہن رکھتے ہیں اور لمحاتی تبدیلی کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے انھیں ادب اور فکشن کی دائمی قدروں کا احساس و شعور کل بھی تھا اور آج بھی

ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ افسانہ کو صرف قصہ کہانی اور راجہ رانی کی حدوں تک محدود نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس میں فکر و فلسفہ تلاش کرتے ہیں اور پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کم ضرور لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ اتنا پختہ اور بالیدہ ہے کہ اس پر ہم سبھی احباب مسلسل گفتگو کرتے ہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب طارق خود اپنے افسانہ پر بات کرتے ہیں تو ایک کیا کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں یہی رویہ ان کا دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو لے کر ہے کہ جس وقت وہ اظہارِ خیال کرتے ہیں ہم حیران بلکہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہماری اس حیرانی میں طارق کی بلاغت اور ذہانت پوشیدہ رہتی ہے اور یہ بھی کہ وہ ادب کو افسانہ کو کس قدر سنجیدگی اور گہرائی سے لیتے ہیں۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ طارق نرے فنکار نہیں ہیں وہ اسکالر اور دانشور بھی ہیں۔ صغیر افراہیم نے درست لکھا ہے:

> ''طارق چھتاری ہمارے دور کے ممتاز افسانہ نگار اور سنجیدہ نقاد ہیں۔ کئی کہانیوں کے اچھے تجربے کیے ہیں۔ افسانہ نگاری اور مابعد جدید افسانہ پر فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔ ان کا تحقیقی کام جدید اردو۔ ہندی افسانے پر سند کی حیثیت رکھتا ہے۔''

اور یہ بالکل صحیح ہے۔ ہندی ادب کے افسانوں کا مطالعہ بھی خوب ہے انھوں نے انگریزی فکشن بھی پڑھ رکھا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ریڈیو کی ملازمت میں آئے اور گورکھپور میں تھے تو ریڈیو کی طرف سے انھوں نے کئی سال بڑے مذاکرے کیے جس میں اس وقت کے اردو/ہندی کے بڑے فکشن رائٹرز شریک ہوئے تھے۔ مثلاً امرکانت، رویندر کالیہ، ممتا کالیہ، کے۔ پی۔ سنگھ وغیرہ اس طرح اردو میں قاضی عبدالستار، سید محمد عقیل، نیز مسعود اور بہت سارے ہم جیسے نوجوان کیا مذاکرے تھے۔ کیا مقالے اور کیا بحثیں، طارق ہر چند کہ منتظم تھے اور ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت تو دیکھنے کو ملی ہی لیکن ہندی افسانوں اور افسانہ نگاروں سے متعلق ان کی غیر معمولی واقفیت نے ہم سبھی کو چونکایا اس واقفیت نے بھی ان کو اکثر پریشان کیا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بالخصوص ہندی زبان

میں طرح طرح کے عمدہ افسانے لکھے جارہے ہیں جس طرح ان کا کینویس وسیع ہے اردو کا کیوں نہیں ہے؟ اس موضوع پر طارق نے مجھ سے ذاتی طور پر کئی بار تبادلۂ خیال کیا ہے۔ خیر یہ الگ سی بحث ہے جس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے جو پھر کبھی کی جائے گی لیکن یہ تو اندازہ ہوتا ہی ہے کہ طارق لکھتے ضرور کم ہیں لیکن سوچتے زیادہ ہیں۔ ان کا ذہن اور وژن اردو کے دیگر جلد باز اور اشتہار باز افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ گمبھیر اور سوچتا ہوا جو ظاہری نمائش اور تصنع سے دور باطن میں اپنی دنیا سجاتا ہے۔ آپ ان کے چند افسانے پڑھئے میری بات اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ مجموعہ کے عنوان کو ہی ملاحظہ کیجئے باغ کا دروازہ اور کتاب کے سرورق کو بھی بغور ملاحظہ کیجئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی کہانیاں (Folk stories) در آئی ہیں۔ داستان کا سا تحیّر و تجسس لیکن مسئلہ جدید سے جدید تر قدیم و جدید، تہذیب و ثقافت کی رنگا رنگ آمیزش نے ایک باغیچہ کی شکل اختیار کر لی ہے جس میں رنگ برنگے پھول ہیں لیکن آج کے تعصب و تنگ نظری نے باغ کو ایک ہی رنگ میں بدل دینے کی کوشش کر رکھی ہے۔ جب ان کی کہانی 'نیم پلیٹ' چھپی تو بڑے چرچے ہوئے۔ یہ کہانی دہلی اردو اکادمی کے ایک بڑے سیمینار میں پڑھی بھی گئی اور اس پر حامدی کشمیری جیسے بڑے نقاد نے تجزیہ بھی کیا لیکن وہ تجزیہ ایک خاص قسم کا تھا جس نے پورے طور پر کہانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اس لیے کہ نیم پلیٹ صرف گھر کی نہیں فرد کی بھی پہچان ہوا کرتی ہے اور اس دوڑتے بھاگتے دور میں شخص کی گمشدگی کا جو مسئلہ آن پڑا ہے وہ بظاہر انفرادی سا لگتا ہے لیکن بغور دیکھئے تو آج یہ قوم ملک و معاشرہ تک پھیل گیا ہے۔ طارق اتنے شریف اور شرمیلے انسان ہیں کہ جنس یا سیکس کی بات کیجئے تو اپنی بیگم سے زیادہ شرما جائیں گے۔ ایک لڑکی کی طرح جسے بار بار چھیڑنے کو جی چاہے لیکن جب یہ احساس ہو جائے کہ یہ تو پہلے ہی سے چھڑے ہوئے ہیں تو ان پر ترس اور رحم آنے لگتا ہے۔ بات کا رخ بدلنا پڑتا ہے۔ وہ گورکھپور اور دہلی میں اکثر اکیلے رہے ہیں شریف سلیقہ مند گھرانے کی بہو بیٹی کی طرح بیگم ان سے بھی زیادہ مہذب اور منظم خاتون ہیں۔ طے کرنا مشکل ہے کہ میاں بیوی کے درمیان کون زیادہ مہذب ہے اور کبھی کبھی یہ

طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں کون میاں ہے اور کون بیوی۔ بہرحال میاں بیوی کا یہ حسین جوڑا قابلِ رشک ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ خدا ان دونوں کو نظرِ بد سے بچائے۔ ایسے شرمیلے شخص اور فن کار نے جنس اور سیکس پر چند بہترین کہانیاں لکھی ہیں جن میں گلوب کا جواب نہیں امیر گھرانے کی عورت کی جنسی جبلت اور ملازم کی حیثیت صرف جنسی جبلت کو ہی نہیں پیش کرتی بلکہ طبقاتی فرق سے وابستہ بلاوجہ کی Ego کو بھی جنم دیتی ہے اور افسانہ جنسی جبلت اور طبقاتی حقیقت کے ملے جلے جذبات کو بخوبی پیش کر جاتا ہے۔ افسانے اور بھی ہیں جنھوں نے شہرت پائی مثلاً 'کھوکھلا پہیہ'، 'شیشے کی کرچیں'، 'پورٹریٹ' وغیرہ لیکن ان کا ایک افسانہ ایسا ہے جس کو پڑھ کر میں کئی رات ٹھیک سے سو نہیں پایا اور وہ ہے 'لکیر' یہ اس زمانے کا لکھا ہوا افسانہ ہے جب جدیدیت اور فرقہ واریت دونوں عروج پر تھے۔ فرقہ واریت تو خیر آج بھی عروج پر ہے۔ لیکن یہ افسانہ فرقہ واریت سے زیادہ صدیوں کی انسانیت ،محبت کو سمیٹتا ہے۔ جنم اشٹمی کا تہوار گاؤں کا ماحول برسوں سے بھگوان کرشن کا رول ادا کرتا ہوا ایک مسلم لڑکا لیکن اس بار کنھیا بننے پر سوال اور حمید کا یہ جمال ''اللہ میاں جلدی سے جنم اشٹمی آئے اور میں مکٹ پہن کر کنھیا بنوں اور بانسری۔'' لیکن یہی جمال جب سوال بنتا ہے اور خواب حقیقت تو معاملہ صدیوں پر پھیل جاتا ہے۔ اب لڑکا ہندو ہونا چاہیے۔ یہ اب کتنا خطرناک ہو چکا ہے۔ بزرگوں کے اصرار پر حمید کنھیا تو بن گیا لیکن جب مسجد کی طرف سے پتھر آیا جس نے کرشن بھگوان کے ماتھے پر خون کی لکیر کھینچ دی۔ اس خون سے آرتی کا دیا بجھ گیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے خود ہندوؤں نے بھگوان کرشن پر اس لیے حملہ کر دیا کہ وہ مسلمان ہے اور اس طرح بھگوان کا اپمان ہوا ہے اور پھر بات بڑھتی گئی حمید کے سر پر وار ہوا اور کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے:

> ''مکٹ کاچھنی اور بجنتی مال پہنے کرشن بھگوان ڈولے سے نیچے لڑھک پڑے اور دھرتی پر خون کی ایک لکیر بہت دور تک کھنچتی چلی گئی۔ کچھ لوگ لکیر کے ادھر تھے اور کچھ لوگ ادھر۔ دونوں طرف شور تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ لکیر

کے ادھر زیادہ شور ہے یا ادھر۔''

جو لوگ زندگی، انسان اور انسانی معاشرے سے سنجیدہ اور جذباتی تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کہانی بیحد اثر انگیز ہے لیکن جو لوگ ادب کو کتابی اور نصابی انداز سے لیتے ہیں انھیں یہ کہانی لاؤڈ لگے گی۔ نعرہ بازی بھی لگ سکتی ہے اور شاید لگی بھی ہے اسی لیے اس کہانی کا ذکر زیادہ نہیں ہوا، جدید نقادوں نے تو اس پر بات نہیں کی اس لیے کہ ایسے موضوعات کو ہنگامی موضوعات کہتے ہیں جو سماجی اور خارجی ہوتے ہیں۔ طارق چھتاری بھی ان بحثوں میں نہیں پڑے وہ تو بس اس کے قائل تھے کہ ''شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو'' لیکن سچ یہ ہے کہ طارق کا املا غلط نہیں ہے وہ شعر اور فنِ شعر کے ضرور قائل ہیں اس طرح ان کی نظر میں افسانہ پہلے افسانہ ہونا چاہیے خواہ وہ بیانیہ ہو یا علامتی۔ طارق نے دونوں طرح کے کامیاب تجربے کیے کہ مسئلہ علامت یا تجریدیت کا نہیں ہوتا اصل معاملہ یا مقدمہ تو مشاہدہ اور تجربہ کا ہوتا ہے اور پھر رویہ اور نظریہ کا۔ نظریہ سے مطلب نظریۂ ادب اور نظریۂ حیات کا۔ ادب ایک سنجیدہ و مقدس عمل ہے۔ طارق نے زندگی کی طرح ادب کو بھی پوری سنجیدگی سے لیا ہے۔ ذاتی زندگی میں ان کی تہذیب، اخلاق، اخلاص، نرم گفتاری، ملنساری کے بھی قائل ہیں۔ چونکہ میں ان کے افسانوں پر تفصیل سے الگ مضمون لکھ رہا ہوں اس لیے ان کے فکر وفن پر باتیں الگ ہیں یہ تاثراتی نوعیت کا مضمون تو اپنے افسانہ نگار دوست کے تئیں محبت بھرا نذرانہ ہے۔ جس کے ایک ایک ورق ایک ایک لفظ پر چالیس سال کی داستانِ محبت رقم ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان چار دہائیوں کے طویل عرصہ میں ہمارے درمیان کبھی کوئی تلخ بحث ہوئی ہو یا کوئی بات ناگوار گذری ہو۔ کبھی کبھی تو اسی بات پر غصہ آتا تھا کہ یہ شخص بحث کیوں نہیں کرتا۔ علی گڈھ میں رہتے ہوئے اسے ''علی گڈھ'' نہیں ہوا۔ کبھی کبھی تو اس کے علیگ ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو طارق ہی سچا علیگ ہے ورنہ لمبی مدت سے علی گڈھ میں رہتے ہوئے بھی کوئی سید ہے، کوئی انصاری ہے کوئی بہاری اور کوئی غیر بہاری لیکن طارق تو چھتاری ہے۔ چھتنار درخت کی طرح پھیلا ہوا۔ مہکتا ہوا۔ دوستوں کا دوست، دشمنوں کا بھی دوست۔ گاڑی سے اسٹیشن پہنچانا اسٹیشن سے لے آنا۔ گھر میں

دعوت کرنا۔عمدہ قسم کی چائے پلانا اور نزاعی قسم کے افکار و افراد پر لب بند رکھنا بڑے ظرف کام ہے جو بڑے بڑے نہیں کر پاتے لیکن طارق یہ بڑا کام بڑی آسانی سے کر جاتے ہیں۔طارق الہ آباد بھی آتے رہتے ہیں اور میں بھی علی گڈھ جاتا رہتا ہوں۔میرے لیے طارق اور علی گڈھ لازم و ملزوم ہیں۔ان کے بیٹے کی شادی میں میں شریک ہوا میری بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے وہ الہ آباد آئے۔کوئی حساب نہیں کوئی سوال جواب نہیں۔حساب کتاب اور نفع نقصان کے اس دور میں طارق میرے ایسے دوست ہیں جہاں صرف جذبہ ہے خلوص ومحبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب گذشتہ برس علی گڈھ کے ہی ایک اعزازیہ جلسہ میں طارق کو نوازا گیا تو پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ایسا کیوں نہ ہو وہ آفیسر ہے اور نہ ہی وائس چانسلر۔بس ایک شریف، سادہ اور پیارا انسان ہے۔دلنواز شخصیت کا مالک ہے۔اس کی شخصیت میں غیر معمولی جاذبیت ہے جو وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔لیکن میں پھر بھی سوچتا ہوں کہ اتنی فیاضی سے خلوص ومحبت اور دوستی تقسیم کرنے والا شخص ان دنوں اپنے قلم کو لے کر خاموش کیوں ہے یہاں فیاضی کیوں نہیں۔کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ہوسکتا ہے کہ دوسرے فیاض قسم کے قلمکاروں کا حشر دیکھ رہا ہو یا پھر سلام بن رزاق کا وہ خیال پریشان کررہا ہو کہ آج سماج کو افسانہ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ میرے ذہن میں تو ایک تیسرا خیال بھی آتا ہے۔بس خیل ہے قیاس اور لطفِ احساس کہ طارق کے واد اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔طارق اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے اور طارق کا بیٹا بھی اکیلا اور اکلوتہ شاید اسی لیے طرق کا افسانوی مجموعہ بھی ایک۔طارق کا ناول بھی ایک۔طارق کی تنقیدی کتاب بھی ایک۔اس 'ایک' نے ہی انھیں لاشریک دائرے میں سمیٹ سیا ہو اور وہ جذب و وجد کے عالم میں پہنچ گئے ہوں جہاں وحدانیت کے تصور میں اضافہ ہو گیا ہو اور وہ ایک ماڈرن صوفی بن گئے ہوں۔ان کی باطنی پاکیزگی اور مہذب خاموشی تو کچھ یہی اعلان کرتی ہے۔طارق کے لباسِ ظاہری پر نہ جایئے۔ان کی خوبصورت شخصیت پر بھی نہ جایئے۔ان کے باطن کی طہارت کو دیکھئے۔ان کی شرافت اور محبت کے دروازے میں جھانکئے جہاں باغ ہی باغ ہے۔جہاں ہرے بھرے احباب ہیں تبسم ریز انسان ہیں۔

سنہرے افراد اور زرّیں افکار کی دنیا آباد ہے۔ جب کبھی بھی باغ کا دروازہ کھلتا ہے تو جنت کا منظر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس ارضی جہنم سے تھوڑی دیر کے لیے بچنا ہے تو طارق سے دوستی کیجئے اور اگر دوستی نصیب نہ ہو ان کی تخلیقات پڑھئے جہاں ان کا باطن ملے گا۔ پاکیزہ وگہرا باطن، خارج اور باطن کا ایسا شفاف و معنی خیز امتزاج آج کے دور میں عنقا ہے۔ اسی لیے طارق کی شخصیت ہیرا ہے اسی لیے میں اس کو ماڈرن صوفی کہتا ہوں اور اسی لیے میں نے اس مقالہ کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے۔ طارق چھتاری کے افسانے۔ افسانوی ادب میں جو بھی درجہ رکھتے ہوں یہ وقت طے کرے گا لیکن طارق کی دوستی اس کے دوستوں کے لیے عظیم سرمایہ ہے۔ کاش کہ اس عظیم سرمائے میں کچھ اور نگینے جڑ جائیں۔ کچھ اور مقالے آیئے ہم سب مل کر دعا کریں اور سر سید سے شکایت بھی کریں کہ آپ کے دیار میں آپ کے مخالفین اور حاسدین آج بھی ہیں انھیں کے درمیان ایک ایسا ماڈرن صوفی بھی موجود ہے جو شہرت و نمائش سے کوسوں دور ہے اسی لیے نقادوں۔ دانشوروں اور چودھری نما پروفیسروں کی نظروں سے بھی دور ہے لیکن دوستوں کی نگاہوں میں وہ روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ کاش اسے بھی کوئی نیا حالی مل جائے اور ایک نئی حیاتِ جاوید لکھ دے جس کی سخت ضرورت ہے۔

❑❑❑

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

شائستہ فاخری کی شخصیت پر لکھنا میرے لئے مشکل کام ہے۔ جبکہ میں بیحد لکھاڑ ہوں بدنامی کی حد تک۔ لیکن جس شخصیت سے ذاتی طور پر اور خاندانی حوالوں سے تعلق ہو اور جس کا خاندان بھی ایسا جو الہ آباد میں اپنی تاریخ، تہذیب اور تقدیس کے لئے دور دور تک شہرت رکھتا ہو، اس شخصیت پر قلم اٹھانا ایک مشکل کام تو ہے ہی۔ لیکن کبھی کبھی زندگی میں مشکل اور نازک کام کرنے ہی پڑتے ہیں، اس کا لطف الگ ہوا کرتا ہے بقول شاعر
''اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے''

الہ آباد ویسے بھی اپنی سنگمی تہذیب کے لئے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ صوفی سنتوں کا شہر، گیان دھیان کا نگر۔ اسی کے متوازی یہاں کے دائرے تصوف اور تعمق کے لئے اپنی گراں بہا تاریخ پر ناز کرتے ہیں۔ ان دونوں کے معنی خیز امتزاج وانجذاب نے شہر الہ آباد کو نہ صرف شہر نجات (मोक्ष का नगर) کا نام دیا بلکہ یہ شہر حیات بھی کہلایا کہ اکثر اقتدار و سرمایہ کے خلاف اسی شہر میں اور اسی دائرہ فقر و قناعت سے مزاحمت واحتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دائرہ شاہ اجمل کے آنگن میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور انگریزی ملبوسات کی ہولی جلائی گئی۔ اسی دائرے نے زندگی کے کئی محاذ پر عام انسانوں کی بھرپور حمایت کی، دعائے خیر کی۔ مولانا فاخری سے لے کر مولانا راشد اور مولانا شاہد فاخری تک ایک لمبی روایت جہاں مذہب، تہذیب، سماج، سیاست سب شیر و شکر ہو گئے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ انھیں دائروں میں صوفیانہ شاعری کا ایک سنہرا دیادگار باب رقم ہوا کہ ناسخ جیسا شاعر کہہ اٹھا۔

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

مثالیں اور بھی لیکن قصہ مختصر یہ کہ آج زندگی کے بدلتے بلکہ اکثر بگڑتے ہوئے

ماحول میں بھی دائرہ شاہ اجمل صرف ایک دائرہ یا محلہ نہیں بلکہ بلندی پر بسا ہوا معلی ہے۔ اسی خاندان کی چشم و چراغ ہیں محترمہ شائستہ فاخری۔ حضرت مولانا شاہد فاخری کے دوسرے بیٹے جناب زاہد فاخری کی تیسری بیٹی۔ بچپن سے ہی الگ الگ سی۔ منفرد اور خاموش طبع زاہد فاخری مرحوم نے اپنی تمام بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی یہ اس زمانے کے دائروی اور خانقاہی ماحول میں ایک مشکل کام تھا۔ لیکن زاہد صاحب مرحوم بھی مشکل کام ہی کرتے تھے۔ میرے والد مرحوم بھی شیر فاطمی سے مولانا شاہد فاخری کے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے۔ والد مرحوم کا مدتوں دائرے میں قیام رہا بلکہ مولانا کے بیٹوں کے وہ اتالیق بھی رہے۔ عربی، فارسی، قرآن کی تعلیم دی۔ اسی لئے زاہد فاخری اور مولانا ناصر فاخری (موجودہ سجادہ نشین) مجھے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ اسی نسبت سے یہ لڑکیاں ہمیشہ مجھے فاطمی چچا کہتی ہیں اور آج بھی اسی رشتے سے یاد کرتی ہیں۔ اسی لئے ابتداً عرض کیا کہ شائستہ فاخری جواب اردو کے افسانوی ادب کی ایک پہچان بن گئی ہے وہ میرے لئے افسانہ نگار بعد میں ہے بھتیجی پہلے۔ اس کی شخصیت پر لکھنا قدرے مشکل ہے۔ لیکن ان رشتوں کو تھوڑی دیر کے لئے الگ کرتے ہوئے اس کی افسانہ نگاروالی شخصیت پر لکھنے کا جو اصرار ہے اس پر ضرور کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ جذباتیت سے الگ معروضیت کے ساتھ ساتھ۔

جیسا کہ عرض کیا شائستہ بچپن سے ہی اپنے بھائی بہنوں میں قدرے مختلف و منفرد تھیں۔ الگ تھلگ لئے دیئے۔ ہم جب بھی زاہد صاحب کے گھر جاتے دیگر بچوں سے ملاقات ہوتی لیکن شائستہ سے کم ہو پاتی۔ پوچھتے تو معلوم ہوتا اپنے کمرے میں ہے۔ اپنی میز پر کچھ پڑھ رہی ہے، کچھ لکھ رہی ہے۔ اس کی بڑی بہنیں غزالہ، شہلا، چھوٹی بہنیں زریں، آصفہ وغیرہ اکثر ملتیں، چہکتیں اور اپنے تعلیمی منصوبوں پر باتیں کرتیں۔ دیگر مواقع اور تقریبات میں بھی یہ بچے بچیاں نظر آتے لیکن شائستہ کم سے کم۔ اور جب کبھی ملاقات ہوتی بھی تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ ایک کمسن لڑکی سے مل رہے ہیں۔ چہرے پر سنجیدگی، بردباری جو فطری نوعیت کی ہوا کرتی جو شائستہ کو ضرورت سے زیادہ شائستہ و مہذب بنائے رکھتی۔ کچھ عجیب سا ضرور لگتا لیکن اچھا بھی لگتا کہ شائستہ کے دل و دماغ میں الگ سا کچھ

ہے جو ضرور کچھ کر دکھائے گا۔ بس ذرا مناسب تربیت اور راہ دکھانے کی ضرورت ہے۔
میں نے یہ بات کئی بار زاہد صاحب سے کہی بھی تھی۔ اور زاہد صاحب جنھیں ہم پیار سے بھیا کہتے تھے اور جو اپنی بیٹیوں سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور ان کی تمام ضرورتوں اور منصوبوں پر نظر رکھتے تھے اور جن کے لئے خود بھاگتے دوڑتے تھے۔ اس لئے کہ بیٹے اس وقت بیحد چھوٹے تھے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا (81-1980) زاہد صاحب اس وقت آل انڈیا ریڈیو الہ آباد پر اعلیٰ افسر تھے۔ اردو کا پروگرام بھی دیکھتے تھے۔ خاندانی روابط تو پہلے سے ہی تھے لیکن اب آنا جانا کچھ زیادہ ہو گیا۔ اس کی وجہ بھی اردو تھی۔ اردو کے پروگرام، بڑی بیٹی غزالہ کا اردو سے ایم. اے. کرنا۔ لیکن سب سے بڑی وجہ جو مجھے لگی وہ شائستہ تھیں۔ شائستہ اس وقت سنسکرت سے ایم. اے. کر رہی تھیں۔ میرے لئے یہ ایک جھٹکا تھا۔ دائرہ شاہ اجمل کے اسلامی و مذہبی ماحول کی پروردہ ایک لڑکی سنسکرت سے ایم. اے. کر رہی ہے۔ مقام حیرت تھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ شائستہ کے فکر و عمل میں تحیّر زیادہ ہوا کرتا تھا۔ کل بھی اور آج بھی۔ اس معاملے میں بھی بھیا نے اپنی بیٹی کا بیحد ساتھ دیا۔ کبھی کبھی وہ اس کی قیمت بھی ادا کرتے تھے لیکن اس ضمن میں ان کی محبت، شجاعت، صبر و استقلال بے مثال تھا۔ ان معاملات میں ان کی بیگم صالحہ بھابی ان کی غیر معمولی معاونت کرتی تھیں۔ بچیوں کو ہمت ور اور نڈر بنانے میں ان کا بھی اہم رول ہے۔

اسی زمانے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ شائستہ کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ اس بار حیرت کم مسرت زیادہ ہوئی۔ کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ شائستہ تنہا نہیں ہے اس کی خاموشی، سنجیدگی صاف ظاہر کرتی تھی کہ اس کے وجود میں اس کے باطن میں کوئی اور ہے جو اسے بے چین اور پریشان کیا کرتا ہے۔ جس نے اسے خاموش اور تنہائی پسند بنا رکھا ہے۔ اس لئے کہ میں نے دیکھا تھا کہ خاندانی معاملات ہوں یا بھائی بہن کے رگڑے جھگڑے۔ شائستہ کو میں نے ان بے وقوفیوں میں کبھی ملوث نہیں پایا۔ اس کے فکر و خیال کی دنیا کچھ اور ہی تھی۔ ہر چند کہ خانقاہی جمال دنیاوی جاہ و جلال میں تبدیل ہو رہا تھا لیکن اسی تبدیلی سے شائستہ کو کچھ لینا

دیتا نہیں اور اگر تھا تو بس اتنا کہ ایک مخصوص تہذیبی و مذہبی زندگی میں وہ اور اس جیسی لڑکی کے وجود کو دیکھے اور سمجھے۔ اس لئے اس کی نظروں میں ماں، پھوپھیاں، دادی وغیرہ کا بکھرتا سمٹتا بہ الفاظ دیگر شرع و دین کے نام پر کسا ہوا وجود تھا ان کے معاملات۔ ان کے ساتھ پیش آنے والے رویے، ٹونے ٹکے اور شوہر مجازی کے لٹکے جھٹکے۔ غرض کہ عورت کی زندگی، لڑکیوں کی بے بسی، خاندان کی کسمپرسی، مقدمہ بازی وغیرہ کو شائستہ کی معصوم آنکھیں مظلومیت کے نئے نئے باب پڑھ رہی تھیں۔ اور وہ پڑھتی رہیں اندر اندر پکتی بھی رہیں۔ خاموشی سے کاغذ پر اتارتی بھی رہیں۔ لیکن اس وقت اور شاید آج بھی یہ سوال تھا کہ وہ سنسکرت کی طرف کیوں گئیں۔ یوں تو کوئی کہیں بھی جا سکتا ہے لیکن شائستہ جیسی حساس و سنجیدہ لڑکی کا کوئی فیصلہ شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نظریہ تو رکھتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا متحیر و متجسس ذہن شعور کی اڑان اسے اس عمل پر مجبور کر گیا ہو کہ اردو کی غزالہ تو دیکھ لی چلو چل کر سنسکرت کی شکنتلا کو دیکھا جائے کہ عورت تو دونوں ہی ہیں۔ اسی ہندوستان کی قدیم تاریخ کی۔ اس معاشرت کی زاویے اور راستے دو ہیں تو کیا ہوا عورت تو ایک ہی اور صدیوں کا مردانہ سماج بھی اک جیسا۔ تلاش و تجسس کے اس عمل میں اسے اس بات کا صاف اندازہ ہو گیا کہ خواہ غزالہ ہو یا شہلا اور شکنتلا ہو یا ارملا سب کی حیثیت ایک سی ہے۔ سب کی کیفیت، سب کی مظلومیت ایک یہ سب دیکھ کر وہ خارجی سطح پر خوف زدہ ہوئی لیکن باطنی حیثیت سے مضبوط اس مضبوطی کا اظہار یوں تو اس وقت سے ظاہر ہونے لگا تھا جب وہ ساتویں درجہ میں تھی اور اس نے ہندی میں ایک کہانی 'آلنگن' لکھی۔ والد کو پتہ چلا تو خاموشی سے دریافت کیا یہ آلنگن کیا ہوتا ہے۔ تو شائستہ نے جواب دیا۔ لپٹانا، گلے سے لگانا۔ والد خاموش ہو گئے اور کہا کہ اردو میں لکھنے کی کوشش کرو۔ تا کہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں لیکن شائستہ نے ارادی اور شعوری طور پر ہندی میں لکھنا چاہا تا کہ اس کی کتاب دور تک پہنچے اور فرسودہ اردو والوں کو زیادہ خبر بھی نہ ہو کہ اردو والے یا خاندان والے روایتی اور فرسودہ زیادہ تھے۔ اور وہ اسی بوسیدہ روایت و فرسودگی کی کائی کو توڑنا چاہتی تھی اس لئے سرکشی اور سمجھداری اسے ہندی کی طرف لے گئی۔ ہر چند کہ اس کی مادری زبان اردو تھی اور ہے تاہم

انحراف کی کیفیت تو باغیانہ فیصلے کو ہی مدعو کرتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی کہانیاں ہندی میں لکھیں۔ جن میں سندھی بیلا کو شہرت ملی اور وہ ہندی والوں میں جانے پہچانے جانے لگی۔ اردو والے بے خبر کہ ان کی بیخبری ان کے افتخار کا باعث ہوتی ہے۔ وہ ہندی زبان وادب سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ جو اردو کی قریب ترین زبان ہے۔ اردو مادری زبان ہونے کے باوجود شائستہ نے ایک مضمون کی حیثیت سے بی.اے. میں جا کر پڑھی۔ بی.اے. کرنے کے بعد اس نے سنسکرت سے ایم.اے. کرنے کا فیصلہ لیا۔ اس فیصلے میں بھی ایک طرح کی بغاوت اور سرکشی پوشیدہ تھی۔ جو سب پڑھتے ہیں، جو سب کرتے ہیں وہ ہم نہیں کریں گے۔ ان سب سے الگ۔ روایت سے مختلف و منحرف۔ تو یہ تھا اس کا ہندی او سنسکرت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ۔ جو میں بعد میں سمجھ سکا۔ کیونکہ اس وقت تو میں محض لکچرر تھا، بس یہ تھا شائستہ افسانے لکھتی ہیں اور ہندی میں لکھتی ہیں تو کیا ہوا اس لئے کہ کئی دہائیوں سے مسلم نوجوان کا بڑا طبقہ اردو سے زیادہ ہندی کے قریب آچکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ زاہد صاحب کے گھر یا میرے گھر پر شائستہ نے کئی افسانے سنائے۔ اس کا سنانے کا انداز اس کے بعد افسانے پر گفتگو اور شائستہ کے جوابات حیران کر دیتے۔ ہم بھی استاد ہو چکے تھے اور استادی دکھانے کا جذبہ بھی تھا۔ خوب خوب بحثیں ہوتیں۔ شائستہ ان سب باتوں کو غور سے سنتی، بحث میں شریک ہوتی۔ اس کی گفتگو میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا وہ جو کچھ بھی لکھتی تھی۔ وہ جو کردار بھی گڑھتی تھی اس کے پیچھے باضابطہ ایک سوچ ہوتی، نظریہ ہوتا اور گفتگو میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی انداز میں اس پر قائم بھی رہتی۔ ادھر ادھر کی بحثوں کی وہ پروا بھی نہ کرتی۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس وقت میں سوچتا تھا کہ یہ لڑکی اردو کی طرف آجائے تو بڑے کام ہو سکتے ہیں اس لئے کہ اس وقت تک الہ آباد میں اردو میں کوئی قابل ذکر خاتون نہ تھی، سچ تو یہ ہے کہ قابل ذکر مرد بھی نہیں۔ یہ شہر تو شاعری سے جانا جاتا ہے۔ خصوصاً اکبر الہ آبادی کے حوالے سے۔ میں نے زاہد صاحب سے اصرار کیا کہ شائستہ کی کہانیاں اردو میں آنی چاہئے۔ شائستہ سے بھی کہا تو مسکرا کر رہ جاتی۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ اس تبسم میں بھی ایک تکلم ہے۔ خاموش رہنا اور خاموشی کی زبان سے بول جانا یہ

ایک بڑا ہنر ہوا کرتا ہے۔ شائستہ نے اس ہنر کو ایک سلیقہ اور نظریہ بنا دیا تھا۔ کل بھی اور آج بھی۔ آج بھی وہ کم سخن ہے کم آمیز بھی۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو اس کے بارے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی خاموشی میں بے چینی اور علیحدگی میں سنجیدگی پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اندر ہی اندر فکر و خیال کے ایک طوفان میں مبتلا رہتی ہے۔ جو تخلیق کا کرب بن کر اس کے رگ و ریشہ میں دوڑتا رہتا ہے، جسے وہ سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے۔ باہر کی دنیا کے سرد و گرم، انسانوں کے پیچ و خم، بیمار قسم کے تبصرے الٹے سیدھے فقرے اس کرب کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ اس لئے وہ کم آمیز ہے۔ اب تو اس کی کم آمیزی کی کچھ اور وجہیں بھی ہیں۔

ہم دوستوں یا چچاؤں کے اصرار پر اس نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ 'ہرے زخم کی پہچان' اردو میں چھپوایا ضرور لیکن صاف لگتا تھا کہ شائستہ ہندی اور سنسکرت کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہندی میں افسانے لکھے اور سنسکرت سے ایم.اے. کیا۔ یہ اپنے آپ میں کم از کم دائرہ شاہ اجمل کے تہذیبی و روایتی ماحول کو دیکھتے ہوئے عجیب سی بات تھی۔ چونکہ ہم روایت سے منحرف نہیں ہوتے، بوسیدگی کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتے اس لئے کمزور لوگوں کو ایسے فیصلے نہ صرف عجیب سے لگتے ہیں بلکہ وہ اس کی مخالفت میں لگ جاتے ہیں اور مخالفت کرنا، نکتہ چینی کرنا دنیا کے آسان ترین کاموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ زاہد فاخری کو اپنی بیٹیوں کے تعلق سے ایسے بے شمار اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ بھی بڑے جیوٹ کے انسان تھے۔ بچیوں کی خواہش پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ تعلیم و تعلم کے تعلق سے بطور خاص۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی تقریباً سبھی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا کر اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں، سب اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش حال۔ لیکن شائستہ کے تقدیر نے یہاں بھی الٹ پھیر کر دی۔ ایسی حساس اور فنکار لڑکی کے ساتھ ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ شوہر زمانے کے ساتھ ہوتا ہے اور شائستہ جیسی بیوی زمانے سے مختلف و منحرف۔ چنانچہ یہی ہوا کہ شائستہ کی شادی تو ہو گئی۔ ایک نامناسب لڑکے کے ساتھ اور دو سال میں دو بچوں کے بعد علیحدگی بھی

ہوگئی۔ غور کیجئے کہ قلم اور کتاب والی لڑکی کی زندگی دو بچوں کے لالن پالن اور پھر اس پر شوہر اور سسرال کا عذاب۔ پھر تو جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ شائستہ نے آگ کے اس دریا کو پار کیا اور اپنے آپ کو آزاد کیا۔ حساس اور فنکار کی دنیا میں خلفشار تو اٹھتا ہی ہے۔ لیکن شائستہ کی شائستگی یہ تھی کہ اس نے کڑوے تجربات اور زندگی کے حادثات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اور اپنے افسانوں اور ناولوں کے آنچل میں ٹانک دیا۔ یہ ایک کمزور عورت نہیں کرسکتی تھی۔ ایک بہادر جرأت مند فنکار ہی کرسکتا تھا۔ اور بلاشبہ شائستہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ اس نے اپنی بہادری کو فنکاری میں بدل دیا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اسے ریڈیو پر ملازمت مل گئی۔ اور شوہر کے عذاب سے مکمل طور پر علیحدگی بھی۔ اب شائستہ کے دو بچے ہیں۔ دو ناول ہیں اور بے شمار عمدہ اور بہترین کہانیاں ہیں۔ اور یہ سب کے سب اردو میں ہیں۔ شائستہ نے ذاتی طور پر مجھے بتایا کہ چچا اگر میں اس آگ کے دریا سے نہ گزر پاتی تو شاخ عندلیب بر شاخ لب جیسا ناول نہ لکھ پاتی اور درجنوں کہانیاں بھی۔ دوسرے کرداروں۔ مکالموں میں جو درد ہے، کرب ہے، تجربہ ہے وہ میرا اپنا ہے اسے میں نے دنیا کی تمام عورتوں میں تقسیم کردیا۔ اگر یہ کرب نہ ہوتا تو میں رقیہ باجی جیسی کہانی نہ لکھ پاتی۔ اور اسی نوعیت کی دوسری کہانیاں۔ بظاہر زندگی کی شکست اور ازدواجی زندگی کی ناکامی نے شائستہ کو ایک عمدہ بامعنی افسانہ نگار و ناول نگار بنادیا۔ تبھی تو رقیہ باجی افسانہ کے آخر میں وہ لکھتی ہیں:

> "میں جدوجہد کی ایک جنگ تو ہار گئی لیکن اس ہار میں بھی میری جیت تھی۔ میری خوشی تھی اور پھر یہ ممتا بھرا احساس.... یکایک میری نظر سامنے کے دو بیڈ پر گئی جہاں میرے دونوں بچے جو اب سن بلوغت کو پہنچ رہے ہیں، آرام سے سو رہے تھے.... یہ بچے ہی اب میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میرا مستقبل ہیں۔ مری منزل ہیں۔"

عورت کتنی بڑی فنکار، مفکر، دانشور ہو جائے اس کے اندر کی ممتا نہیں مرتی۔ اس لئے یہ ممتا ہی اسے عظیم بناتی ہے۔ شاید اسی لئے ہر لڑکی یا بیوی اس وقت مکمل ہوتی ہے

جب ماں بنتی ہے۔ بیوی رہے یا نہ رہے لیکن ماں کی ممتا ہر سوا ایک نگاہ التفات ڈالتی ہے۔ اور وہ زندگی و معاشرہ کو بھی ممتا کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس لئے شائستہ کی ہر وہ کہانی جو ممتا کی نگاہ سے، جذبہ سے لکھی گئی ہے۔ دل کو چھوتی ہے لیکن جہاں صرف عورت ہے مظلوم بیوی ہے، غصہ ہے جھنجھلاہٹ ہے، وہاں وہ اکثر جانب دار ہو گئی ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں اکثر عورت کی مظلومیت، حمایت ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہر چند کہ اس میں حقیقی عناصر بھی کام کرتے ہیں۔ اور وہ عورت کو مرد کے بغیر نامکمل بھی سمجھتی ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ایسے جملے بار بار پڑھنے کو ملتے ہیں:

> ''سچ مچ مرد کے بغیر عورت خالی برتن میں کھنکتے
> ہوئے سکے کی طرح ہوتی ہے۔''

اور پھر یہ جملہ بھی:

> ''مرحلہ شادی کا ہو یا طوائفیت کا دونوں موروں
> پر عورت ہی خریدی اور بیچی جاتی ہے۔''

مرد کے لئے ان کا یہ خیال ہے:

> ''مرد عورت کو پھول کی طرح توڑتا ہے اور گھاس کی
> طرف روند ڈالتا ہے۔''

اور اب دونوں کا موازنہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے کیا خوب موازنہ ہے:

> ''مرد کا عشق مرد کے لئے زندگی میں ایک الگ چیز
> ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کے لئے یہ پوری زندگی کا مسئلہ
> ہوتا ہے۔ عورت کے لئے عشق کا مطلب جسم اور روح کی
> مکمل سپردگی ہے بغیر کسی شرط سب کچھ عشق کی بارگاہ میں
> قربان کر دینا عورت کا ایمان بن جاتا ہے جبکہ مرد کے
> لئے عورت کا عشق طلب کرنا ہے۔''

یہ مثالیں میں نے ان کے ناول ''صدائے عندلیب....'' سے دی ہیں جو مجھے بیحد

پسند ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی ایسے بلیغ و بامعنی جملے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں میری رائے ہے کہ ان میں کبھی کبھی بیجا موافقت اور مخالفت کی بو آنے لگتی ہے۔ میں نے کسی مضمون میں اس کا اظہار بھی کیا اور روبرو گفتگو کی تو شائستہ نے ہر بار اپنے غیر معمولی تجربات و خیالات کے ذریعہ قائل ہی کیا۔ پھر جب میں نے انھیں افسانوں اور ناولوں میں اس نوع کے جملے دیکھے:

''پیسے والوں کے لئے جہاں ان کا موڈ قیمت رکھتا ہے غریبوں کے لئے ان کا پیٹ''

''غربت زبان کی قوت چھین لیتی ہے۔''

''غریب جب خواب دیکھتے ہیں تو اس کی پرواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ سورج کی گرمی سے پنکھ جل اٹھتے ہیں۔''

مکالمے اور بھی ہیں جن میں زندگی کے رگڑے جھگڑے تجربے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ایسے مقام وہیں پر آتے ہیں جہاں مرد اور عورت کا فرق ختم ہو کر انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جہاں عورت بولتی ہے تو زندگی بولتی ہے لیکن کبھی کبھی بعض نسوانی کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں صرف عورت ہی بولتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے، شائستہ نے جو زندگی گزاری ہے اور جو عذاب اس پر مسلط ہوئے ہیں وہ ایک عورت ہی محسوس کرتی ہے۔ اسی لئے ان کا فطری انعکاس اور تخلیقی اظہار تو ہونا ہی تھا، سو ہو کر رہا اور بہت اچھے ڈھنگ سے ہوا۔ اس ڈھنگ اور اسلوب نے مجھے چونکایا، حیران کیا اس لئے کہ اس میں اپنی اس باغی بھتیجی کو جانتا تھا جو اردو کے بجائے ہندی میں لکھنا پسند کرتی تھی۔ اور اب وہ دھڑا دھڑ اردو میں نہ صرف لکھ رہی ہے بلکہ اپنی ایک عمدہ پہچان بنا رہی ہے کہ گوپی چند نارنگ اور مغنی تبسم جیسے سینیئر نقاد متوجہ ہوئے اور مضامین لکھے۔ ظاہر ہے مجھے بھی متوجہ ہونا ہی تھا چنانچہ ہوا۔ اور اس کے افسانوں و ناولوں کو پڑھا تو اس میں اردو و مسلم تہذیب کی ایک تڑپتی، مچلتی دنیا نظر آئی۔ شائستہ کا بھرپور مشاہدہ اور اس سے زیادہ مجاہدہ، مجادلہ ایک خاص زاویہ اور نظریہ سے ان افسانوں میں بھرپڑا ہے۔ میرا سوال فطری تھا۔ تم ہندی سے اردو کی طرف کب اور کیوں آئیں؟ تو جواب تھا ہندی میں لکھا ضرور جس کا ایک مقصد بھی تھا لیکن لکھتے لکھتے مجھے اندازہ

ہو گیا کہ فنکار اپنے دلی جذبات و احساسات اور اپنا اضطراب اپنی مادری زبان میں ہی ظاہر کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک احتیاط و احترام کے تحت ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن بڑھتی عمر اور تلخ تجربوں۔ خاص طور پر شادی کی ناکامی کا تجربہ اور ایک خطرناک بیماری کے تجربے نے سارے خطرات کو یکلخت مٹا دیا۔ اب میں آزاد ہوں۔ اس کی آزادی یا احساس آزادی کو دیکھ کر مجھے خوش ہونا ہی تھا اور اردو میں اس کا استقبال کرنا ہی تھا۔

یہ مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے اس لئے میں یہاں شائستہ کے فکر و فن پر گفتگو کم سے کم کروں گا۔ شائستہ نے کئی جگہ کئی رسائل میں انٹرویو مضمون کی شکل میں اپنے خیالات و تصورات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تاثر و تنقید اور تخلیق میں بہر حال فرق ہوا کرتا ہے۔ اس لئے میں فنکار اور افسانہ نگار کی تخلیقات کو راست طور پر پڑھتا ہوں اور جو بھی بھلی بری رائے بنتی ہے بناتا ہوں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ عورت اور کہانی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کم از کم اردو فکشن میں مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتوں نے خوب خوب لکھا اور عمدہ لکھا۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے جو جھنڈے گاڑے ہیں ان کی مثال نہیں تی۔ پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ آج کے دور میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، نگار عظیم، ثروت خان اور اب شائستہ کے ہوتے ہوئے کیا وہ صورت بن پا رہی ہے کہ جب عصمت چغتائی سے منٹو جیسا فنکار شرما جایا کرتا تھا۔ جب لحاف کہانی چھپی تو منٹو کئی دن تک سو نہیں پایا اور ایک گفتگو میں کہا کہ لحاف کے آگے انھیں اپنی کہانیاں ہیچ لگیں۔ کیا ایسی صورت آج بن پا رہی ہے۔ اور نہیں تو کیوں نہیں؟ یہ بات تمام خواتین افسانہ نگاروں کو سوچنا چاہئے۔ یا یہ کہ عورت آج بھی عورت کے تصور سے باہر نہیں نکل پائی ہے۔ یا یہ کہ مرد کی سفاکی کل کے مقابلے آج زیادہ پر فریب اور پیچیدہ ہوگئی۔ کہیں کچھ تو گڑبڑ ہے۔ شائستہ میں غیر معمولی سمجھداری اور فنکاری ہے۔ وہ ایک گہرا تہذیبی و نفسیاتی زاویہ بھی رکھتی ہیں سنجیدہ اور بالیدہ۔ اس لئے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ شائستہ اپنے میکہ و سسرال میں ہی نہیں اپنی کہانیوں میں بھی ٹھیک سے سمجھی نہیں گئیں۔ نفسیاتی شعور، تاریخی، تہذیبی اور مذہبی شعور کا

تال میل ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے۔ تصوف، تعقل و تعمل کی دنیا جس میں خارجیت کم باطنیت زیادہ ہے۔ جس میں سطح کم تعمق زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر کردار کوئی بھی ہو ان کا تجربہ، ان کی پیشکش، ان کی تصنیف میں ایک انسانی و فکری تہذیب بولتی ہے۔

شائستہ سے ملئے مختصر گفتگو ہی کیجئے۔ صاف اندازہ ہوگا کہ وہ گمبھیر ہے اور اس کی گمبھیرتا میں ہلکی سی اداسی ہے لیکن اس نے اس اداسی کو فکر و فلسفہ کی چادر اڑھا دی ہے۔ جس سے اس کی ذات محض اس کی ذات نہیں رہ گئی ہے۔ وہ کائنات میں پھیل گئی ہے اور سوالات میں اتر گئی ہے۔ اسی لئے اس کے کرداروں میں اکثر سوالات تڑپتے مچلتے نظر آتے ہیں۔ ایک ہلکی سی پراسراریت بھی کہ اس کے سارے کردار، عورت بطور خاص آسانی سے نہیں سمجھے جاتے۔ ناول صدائے عندلیب کا کردار ستارہ جو عورت ہے اور لکھنے والی بھی عورت یعنی شائستہ وہ خود بھی آسانی سے نہیں کھلتیں۔ عامی لوگوں کے درمیان بطور خاص ناول کا ایک جملہ دیکھیے:

> ''میں جانتی ہوں کہ اپنی خاموشی کی بساط پر ستارہ مجھ سے کھیل رہی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں اس کی بچھائی بساط پر اسی کو مہرہ بنا کر اپنی چالیں چل رہی ہوں۔''

اس کی بلاغت میں اتریئے زندگی اور جدو جہد زندگی سے جوجھنے والی ایسی عورت کو کون زیر کر سکتا ہے۔ نہ نقاد، نہ پروفیسر، نہ عام مرد افسانہ نگار۔ شائستہ کی شائستگی اور سنجیدگی نے بڑے سے بڑے عالموں، نقادوں کو متاثر کر رکھا ہے۔ خواہ وہ نارنگ ہوں یا مغنی تبسم۔ صغیر ہوں یا کبیر۔

شائستہ ابتداً ہرے زخم کی پہچان بن گئی تھیں۔ لیکن رقیہ باجی نے انھیں ایک وسیع تناظر دیا۔ بظاہر سوا سو سال کا وقفہ لیکن عورت کا صدیوں کا سفر اس کا وجود عدم وجود آج بھی مسئلہ ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عورت اگر زندگی کا حوالہ ہے تو کردار علامتی بھی ہو جاتا ہے۔ اور زندگی متصادم ہوتی ہے اور نئی نئی حقیقتیں جنم لیتی ہیں۔ حقیقت اور صداقت کے انیک روپ ہوتے ہیں۔ ان کے تضادات و تصادمات سے کتنے سفاک قسم کے جھوٹ

اور کتنے خوفناک قسم کے بیج پیدا ہو رہے ہیں یہ الگ بات ہے کہ شائستہ ان مکروہ سچائیوں کو عورت کے حوالے سے پیش کر رہی ہیں۔ یہ ایسی کوئی بری بات بھی نہیں ہے کہ جو جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ایک گفتگو میں میں نے ازراہ محبت کہا کہ اب تم زندگی کا براہ راست سامنا کرو۔ عورت و مرد سے بالاتر ہو کر کہ زندگی کی وحدت و عظمت خانوں میں نہیں بٹتی۔ دیکھو عصمت کو، پڑھو عینی کو جہاں تاریخ، تہذیب وقت سب خود ایک کردار ہو گئے ہیں۔ مرد اور عورت تو بس ذریعہ ہیں۔ میڈیم ہیں۔ گردش وقت۔ گردش زمانہ۔ زنانہ مردانہ میں تقسیم نہیں ہوتیں۔ اس نے میری ان باتوں کو سنجیدگی سے لیا اس لئے نہیں کہ میں ایک ادیب ہوں، پروفیسر ہوں اس لئے کہ میں اس سے بڑا ہوں، اس کا چچا ہوں۔ ایک فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ بس یہ مسئلہ یہیں ختم۔ اب میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں مجھے اب ان کے بارے میں سوچنا ہے۔ ان کی زندگی، ان کے مسائل، یہ سن کر مجھے اچھا لگا۔ مجھے افسانہ رقیہ باجی کے وہ جملے یاد آ گئے:

> ''سنو رقیہ باجی! اب میں خوابوں سے اوب گئی ہوں۔ اب میں حقیقت میں جینا چاہتی ہوں۔ میں ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ میں حال میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ ماضی نے تو زخم دیئے ہیں۔ اب آنے والا وقت ان پر مرہم رکھے گا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔''

یہ فیصلہ درست لیکن خوابوں سے مت اوبو شائستہ کہ امید و یقین کا جنم انھیں کے بطن سے ہوتا ہے کہ خواب دیکھنا انسان کا فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا سماجی عمل۔ تراشیدم، شکستم کا یہ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ایک فنکار، ایک افسانہ نگار بس اس میں تراش خراش ہی کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا۔

شائستہ! تمھارے قارئین و شائقین کو (جن میں میں بھی شامل ہوں) تمہاری دوسری باری کا شدت سے انتظار ہے۔ عصمت، عینی آسمان سے نہیں اتری تھیں۔ اپنی غیر معمولی ریاضت، عبادت اور مرد و عورت سے بالاتر ہو کر انسانوں سے محبت کے ذریعہ

آسمان ادب پر پہنچی تھیں۔ آج وہ ہمارے درمیان نہ سہی لیکن ان کے افسانے، ان کی آنکھیں زندہ ہیں اور زمین کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ ان کے آدھے ادھورے خواب کون مکمل کرے گا۔ خواب پورے ہوں یا نہ ہوں لیکن پورے ہونے کا سفر جاری رہنا چاہیے۔ ان کے نامکمل پن کا اضطراب برقرار رہنا چاہیے۔ تم سے زیادہ اس اضطراب کو کون سمجھے گا اس لئے کہ تمھاری زندگی مکمل اضطراب ہے۔ لیکن یہ اضطراب ہی، یہ خواب ہی زندگی کی دولت ہیں، نعمت ہیں فکر وفن کی بھی۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ اسے سجانا، سنوارنا اور پورے خلوص ومحبت سے تخلیق کے پیکر میں ڈھال دینا کہ تانیثیت سے زیادہ ضرورت ہے انسانیت کی جو چہار طرف غیر انسانی ماحول میں گھری ہوئی ہے۔

□□□

FUN AUR FANKAR

(Shakhsiyat Name)

By

Ali Ahmad Fatmi

علی احمد فاطمی دورِ حاضر کے اردو ادب و تنقید میں ایک معتبر و ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ترقی پسند تنقید و ادب کے حوالے سے بطورِ خاص۔ پریم چند سے لے کر کرشن چندر تک، اقبال و جوش سے لے کر فراق، مجاز، فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی تک ان کے کام عالمی سطح پر ان کی معتبر پہچان بن گئے ہیں۔ کلیات علی سردار جعفری کی ترتیب اور سفرناموں و رپورتاژ وغیرہ کی تخلیق نے فاطمی صاحب کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ "ناول کی شعریات" اور مرثیہ کی جمالیات" جیسی موقر کتاب نے تو تنقید کی اگلی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں سنجیدگی، سپردگی اور بالیدگی کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد تو ہمہ تن و ہمہ ذہن مصروف کار ہیں۔ گذشتہ برس (۲۰۲۰ء) ان کی تین کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور سالِ رواں (۲۰۲۱ء) میں دو کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں، جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔

اس کتاب میں فاطمی صاحب کی تحریر و تخلیق کا ایک اور نیا رنگ دکھائی دے گا۔ انھیں آپ شخصیت نامے کہئے یا خاکے۔ بہر حال سب کے سب نہایت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں۔ ان تحریروں میں شعر و ادب کا ایک قدیمی دور اور کلاسیکی تہذیب جھلکتی نظر آئے گی۔ خواہ وہ تہذیب شاعری ہو یا تہذیب عاشقی۔ غرضکہ یہ صرف خاکے نہیں ہیں بلکہ ادب، تہذیب و تاریخ کے معتبر حوالے ہیں اور اخلاقی ظلمات میں اجالے ہی اجالے۔

جاوید نظر

رجحان پبلیکیشنز، الہ آباد

INR : 400.00

ISBN:978-93-83309-73-3

RUJHAN PUBLICATIONS

C-82, G.T.B. Nagar, Kareli, Allahabad, INDIA

Contact : 9118152151, 7521984368

E-mail : rujhanpublications@gmail.com